سرینگر ایک عظیم شہر

مصنف

شفیع احمد قادری

سابق ڈپٹی کنسرویٹر آف فارسٹس
جموں وکشمیر فارسٹ ڈپیارٹمنٹ سرینگر

نام کتاب : سرینگر ایک عظیم شہر

مصنف : شفیع احمد قادری

چھاپ اوّل : ۲۰۱۹ء

صفحات : ۴۶۰

تعداد :

کمپیوٹر کمپوزر : وانی کمپوٹرس آلوچہ باغ

9419903983

سرورق :

چھاپ خانہ :

ناشر : حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز

قیمت :

نوٹ: اس کتاب کی طباعت کے لئے جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکیڈیمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس ضمن میں کلچرل اکیڈیمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔

عرض ناشر

ریاست جموں و کشمیر کے کُتب فروشوں میں اوّلین نام مرحوم شیخ عبدالغفار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مرحوم نے پہلی بار آزادی ملک سے پہلے اپنی فرم وادی کے علاقہ چھتہ بل سرینگر میں قائم کر کے تشنگانِ علم کے لئے چشمہ در صحرا کا کام انجام دیا۔ پہلی بار ''اورادِ فتحیہ'' کو لاہور سے چھاپ کر ریاست کے مسلمانوں کے لئے راحت کا سامان بہم پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے فرزند مرحوم حاجی شیخ غلام محمد صاحب نے تجارتی مرکز مہاراج گنج میں میسرز شیخ غلام محمد تاجران کُتب کے نام سے فرم کی از سرِ نو بنیاد ڈالی۔ مرحوم حاجی صاحب نے کئی نادر اور نایاب کتابوں کو حاصل کر کے تشنگانِ علوم کے لئے مہیا کر کے اور ہندوستان و پاکستان کے علاوہ عرب ممالک سے کتابیں لا کر ریاست کے لوگوں کو بہم پہنچائیں۔ مہاراج گنج میں کام کی وسعت اور جگہ کی تنگی کے باعث انہوں نے سرینگر کے مشہور مرکزی علاقہ مائسمہ بازار بڈشاہ چوک میں اپنی دکان ''حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز'' کے نام سے شروع کی۔ جہاں انہوں نے تفسیر قرآن، حدیث شریف، تاریخ، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ کے علاوہ مروجہ تعلیمی نصاب کی کتابیں بیرون ریاست سے منگوا کر مہیا رکھی ہے۔ ریاست کے کئی ادبی، تعلیمی، ثقافتی

مراکز کے لئے ان کتابوں کو ہمیشہ وافر اسٹاک کر کے اداروں سے وابستہ دانشوروں، محققوں اور طالب علموں کے لئے راحت جان کا سامان کیا۔

حاجی صاحب خود بھی علمی ذوق کے حامل انسان تھے۔ انہوں نے خود بھی کئی کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ اور ریاست کے ادبی اور علمی شخصیتوں کو ایک پلیٹ فارم عطا کر کے اُن کی لکھی ہوئی کتابیں چھاپ کر ریاست اور بیرون ریاست اُن کی متعارف کرایا۔ مرحوم نے ہمیشہ معیار کو پیش نظر رکھا۔

حاجی صاحب نے کئی اہم اور تاریخی کتابیں چھاپی ہیں۔ جن کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اُمید ہے کہ اس کتاب کو زیادہ پذیرائی حاصل ہوگی۔ (انشاء اللہ) قارئین کو اگر کوئی خامی یا کمی نظر آئیں تو ہمیں مطلع فرما کر مشکور فرمائینگے۔

والسلام

شیخ محمد فیاض

مالک میسرز حاجی شیخ غلام محمد اینڈ سنز

I.S.B.N:978-93-84019-62-4

فہرست

انتساب

اپنے ہم وطن کشمیریوں کے نام

جن کو کئی صدیوں تک مختلف ادوار میں

غیر ملکی حکمرانوں کے بے پناہ مظالم۔

استحصالی طرز عمل اور اپنے بنیادی حقوق

کی پامالی کی مار مادر وطن کی بقاء اور اپنی

شاندار روایات کے تحفظ کی خاطر انتہائی

صبر آزما حالات میں سہنی پڑی۔

اپنی بات

راقم کی پیدائش ایک علمی خاندان میں ہوئی ہے۔ میرے اسلاف نے کشمیر میں تعلیم عام کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جس میں خاص طور پر مرحوم غلام احمد عشائی جو کہ کشمیر کے پہلے مسلمان گریجویٹ اور جموں و کشمیر یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار تھے اور میری والدہ گرامی کے ماموں؛ جان تھے کارول نمایاں رہا۔ اس کے علاوہ میرے دادا سید احد اللہ شاہ نے ۱۹۰۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو ایک یاداشت پیش کی جس میں لڑکیوں کے لئے ایک اسکول قائم کرنے گذارش کی گئی۔ چنانچہ مہاراجہ کشمیر نے ان کے مطالبات منظور کئے اور لڑکیوں کے لئے امیرا کدل میں اسکول قائم کروایا۔ میرے نانا مرحوم سعد الدین چشتی فارسی کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسلامیہ اسکول میں بطور ایک استاد گذاری۔ میری خالہ شملہ مفتی گورنمنٹ کالج فار وومن کی پرنسپل تھی، میرے ماموں محمد امین چشتی جموں یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار تھے۔ میرے والد مرحوم سلام الدین صاحب بسکو اسکول کے پہلے کشمیری وائس پرنسپل تھے۔ میری والدہ نے مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کورس پاس کیا۔ اس کے بعد منشی فاضل اور بی اے، بی ای سی پاس کیا وہ محکمہ تعلیم میں ملازمہ تھیں۔ اگر چہ میں بنیادی طور پر

ایک فارسٹ آفیسر تھا اور طالب علمی کے زمانے میں، میں نے صرف سائنس اور جنگلات کی تعلیم پڑھی تھی لیکن کشمیر کی تاریخ سے ایک عشق تھا اسی وجہ سے یہ کتاب ''سرینگر ایک عظیم شہر'' میں نے تحریر کی تاکہ یہاں کے طلبہ کو اپنے اس شہر کی عظمت کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔ میں نے سرینگر کے تاریخی، مذہبی مقامات جہاں میں خود گیا ہوں اور ایک ایک کر کے ان کا مشاہدہ کیا ہے ان مقامات کے بارے میں میں نے کشمیر کے مختلف اخباروں میں یہ مضامین شائع کروائے، دوستوں اور رشتہ داروں کے اسرار پر میں نے ان مضامین کو کتابی شکل دے دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب کشمیریوں اور باہر سے آنے والے سیاحوں کیلئے فائدہ مند ہوگی۔ جو سرینگر شہر کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہوں۔ ان تاریخی واقعات کو کتابی شکل کسی حد تک قارئین کے لئے میری یہ پُر خلوص کوششیں بارآور ثابت ہوگی۔ قارئین اس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

جن حضرات نے مجھے اس کتاب میں اپنے زریں مشوروں سے نوازا۔ ان میں میری شریک حیات نسیمہ قادری، میرے فرزندان، جہانگیر، جنید اور ارشد اور میرے عزیزان عرفان، عنایت، صحیب، مامون، واحد، شاہد و عزیزی فرح، برادر ڈاکٹر حنیف قادری اور ان کے فرزندان عبید اور متین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کمپیوٹر کمپوزر عبدالرشید وانی (وانی کمپیوٹرس) اور تنویر صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تحریر میں میری مدد کی۔ میں ہلیپ فاؤنڈیشن کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں مجھے کئی مفید مشورے دیئے۔ مجھے اس تنظیم جس کی سربراہی محترمہ نگہت شفیع

کر رہی ہے کے ساتھ ایک دہائی پہلے کشمیر کے ثقافتی ورثے کے بارے میں ایک کتاب مرتب کرنے میں معاونت کرنے کا شرف حاصل ہوا، جس کا نام Discovering Kashmir تھا۔ میں اپنے دیرینہ رفیق، قلمکار اور صحافی شجاع کشمیری کا بھی کافی مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کی ترتیب وتصیح میں میری معاونت کی۔ میں اپنے ننھے اور عزیز پوتے سید محمد قادری کو دل کی عمیق گہرائیوں سے پیار ومحبت پیش کرتا ہوں کہ ان کی وجہ سے مجھے دلی سکون نصیب ہوا۔ اس کے علاوہ میں شوکت احمد، محمد شفیع پنڈت اور ڈاکٹر الطاف حسین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تحریر میں میری حوصلہ افزائی کی اور اپنے زرّیں مشوروں سے مستفید کیا۔

مصنف: شفیع احمد قادری

سابق ڈپٹی کنسرویٹر آف فاریسٹ محکمہ جنگلات جموں وکشمیر

''سرینگر ایک عظیم شہر'' پر ایک طائرانہ نظر

شہرہ آفاق وادی کشمیر کا دل شہر سرینگر ہے جس کی بنیادی تواریخی دستاویزات کے مطابق موریہ خاندان کے ستارے، شہنشاہ اشوک نے تیسری صدی قبل مسیح میں رکھی۔ اس شہر نے بہت سے ادوار اور تغیرات دیکھے۔ جن سے اس شہر کی شبیہ متاثر ہوتی رہی۔ متنوع اور متمول بھی ہوئی اور وقتاً فوقتاً خونیں بھی ہوئی۔ اس شہر کے باشندگان نے مظالم بھی سہے، مگر پھر بھی ابھر کر اپنی شناخت برقرار رکھی اور ہمیشہ پوری دنیا میں نہ صرف مشہور و معروف ہوتے رہے بلکہ اپنی گوناگوں صفات سے دوسروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں اس شہر کی مذہبی، سماجی اور ثقافتی روئیداد کو ایک چھوٹی سی تصنیف میں سمونا اور اس کی ہمہ جہت شناخت کا ایک باثر انداز پیش کرنا آسان کام نہیں ہے۔ سرینگر کے بارے میں 'گل بداماں' تو سنا تھا۔ مگر شفیع احمد قادری صاحب نے اپنی دقت نظری سے کشمیر کے مقامات، علماء وفضلا اور صوفیائے کرام کے تذکرہ سے ''گل بہ گلستان'' بنا دیا ہے۔ باریک بینی کے ساتھ یوں منظر کشی کی ہے۔ گویا صاحب مطالعہ کھلی آنکھ سے بذات خود مظاہرہ کر رہا ہو۔ بعض وہ جگہیں، جن کا ممکن ہے نئی نسل کو علم ہی نہ ہو، ان کو اس طرح سے روشناس کرایا، جیسے پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہو۔

گردوارے، مزارات، شعراء درجن، مزارات سلاطین، خانقاہیں، مساجد، کلیسائیں، منادر، رشی ومنی، دریا، باغات وباغیچہ کوئی بھی پہلو قادری صاحب کے ذہن رسا کی آنکھوں نے نہ چھوڑا۔ روابطہ کشمیر اور مختلف ممالک خاص طور سے ایشیاء مرکزی اور راہ ابریشم بہت بڑا وسیلہ بنی تجارت کے لئے نیز بودھ مت کی تبلیغ کے لئے، اُس کا آغاز واہمیت، سب کو خوبصورتی سے سحر آفرین انداز سے انہوں نے اپنی کاوش میں سمو کر نہ صرف قاری کو اچھے گائیڈ کی طرح انگلی پکڑ کر قدم بہ قدم چلایا ہے بلکہ ساتھ ہی اپنی حب الوطنی کے جذبے پر ایک دلنواز مہر "سرینگر ایک عظیم شہر" کے عنوان سے لگادی ہے۔

شفیع احمد قادری صاحب ریاستی محکمہ جنگلات میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہے۔ جس کے دوران اپنی سرکاری ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنے صاحب ذوق اور صاحب قلم ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات پر مضامین لکھے، جو مختلف رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، کہ ریاست کی ایک معروف سماجی تنظیم، ہیلپ فاؤنڈیشن نے جب ۲۰۰۷ء میں وادی کے مختلف سکولوں کے بچوں کو وادی کشمیر کے قیمتی ثقافتی ورثے سے آگاہ کرنے کے لئے ایک چھ ماہی ورکشاپ کا اہتمام کیا تو قادری صاحب کو ہی اس قابل سمجھا گیا کہ وہ ان بچوں کو مختلف تاریخی اور مذہبی مقامات پر لے جا کر انہیں جانکاری دلائیں۔ ان ہی بچوں نے اپنے تاثرات قلمبند کر کے اور خاکے بنا کر ایک جامع کتابچہ کے

لئے مواد فراہم کیا۔ جس کی اجرائی **Discovering Kashmir** کے نام سے ریاست کے گورنر جناب این این ووہرا کے ہاتھوں سے ہوئی۔ قادری صاحب کی موجودہ تصنیف تمام قارئین کے لئے ایک مفصل اور معتبر گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے خاص طور سے طلباء کے لئے یہ ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

۳ مئی ۲۰۱۷ء — محمد شفیع پنڈت

سرینگر — سابق چیرمین جموں وکشمیر پبلک سروس کمیشن

کہنہ مشق تاریخ دان
شفیع احمد قادری میری نظر میں

ایک تواریخ دان کو تواریخ مرتب کرنے میں مختلف قسم کے پاپڑ بیلنے جھیلنے پڑتے ہیں۔ جو تواریخ دان ماضی کے جھروکوں میں گہری نظر سے جھانک کر تمام واقعات حادثات اور کرداروں کو سچائی، غیر جانبداری اور دیانتداری کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کرے وہ کامیاب ہے اور اس کی پذیرائی ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب ''سرینگر ایک عظیم شہر'' میرے ایک پُر خلوص رفیق محترم شفیع احمد قادری نے ان لوازمات کا پورا خیال رکھتے ہوئے مرتب کی ہے۔ مصنف خاندان سادات قادری سے تعلق رکھتے ہیں اس خاندان کی علمی دینی سماجی خدمات گراں قدر رہی ہیں۔ قادری صاحب سرکاری انتظامیہ میں کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ان کو تاریخ دانی پر بھی خاصا عبور ہے۔ تاریخی واقعات کو عام فہم اور روانی کے ساتھ تحریر کرنے کا فن جانتے ہیں۔ قادری صاحب یاروں کے یار ہیں۔ دل میں خلوص و ایثار کا جذبہ ہے، ملتے ہیں تو پوری بشاشت کے ساتھ، ہم کلام ہوتے ہیں تو خندہ پیشانی سے، انکساری اتنی زیادہ کہ دوران گفتگو بار بار اپنی ذات کو پستی دیتے

ہیں۔ سرکاری ملازمت دیانتداری، فرض شناسی اور پابندی کے ساتھ گزاری ہے۔ اس دوران مجبوروں، محتاجوں اور حقداروں کے لئے انصاف کا قلم چلاتے رہے۔ قادری صاحب کے ساتھ ناچیز کی شناسائی مختلف مذہبی، ادبی، ثقافتی محفلوں میں شرکت کے مواقع پر ہوئی۔ زیرنظر کتاب ''سرینگر ایک عظیم شہر'' کا مواد جمع کرنے میں قادری صاحب کو کافی محنت مشقت اور سفری مشکلات اُٹھانی پڑی ہیں اور کتاب کو پوری دیانتداری، غیر جانبداری اور جذبہ حب الوطنی کے تحت مرتب کیا ہے۔ ان کی یہ انمول کتاب جہاں کشمیریوں کی تاریخی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگی۔ وہیں یہاں کے عظیم المرتبت بزرگان کے روحانی، دینی، علمی اور سماجی کارناموں کے علاوہ ان بزرگان کے مراتب ومساکن سے بھی وہ واقف ہوں گے۔

قادری صاحب کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ڈپٹی کنسرویٹر آف فارسٹس کے منصب سے سبکدوش ہوتے ہی کشمیر کے تاریخی واقعات کو اکٹھا کر کے ان کو کتابی صورت دی ہے۔ قادری صاحب کی یہ گراں قدر کاوش واقعی قابل ستائش ہے۔ اُمید ہے کتاب بعنوان ''سرینگر ایک عظیم شہر'' تاریخ کے طالب علموں و دیگر شائقین کی پیاس بجھانے کے لئے ایک چشمہ جاددان ثابت ہوگی۔

ناچیز

محمد علی شجاع (کشمیری) احسن آباد سرینگر

(صحافی وقلمکار) 9419675180

سرینگر شہر اور اس کی تاریخ

سرینگر کشمیر کا سب سے بڑا شہر اور ریاست جموں و کشمیر کی گرمائی راجدھانی ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ہندو عقیدے کے مطابق سری کے معنی لکشمی جو کہ ہندوؤں کی ایک دیوی ہے۔ اور نگر شہر یعنی لکشمی کا شہر لیکن کچھ لوگوں کے مطابق سری کے معنی خوبصورتی دولت یا علم ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سری کے معنی سورج اور نگر کا مطلب شہر۔ لہٰذا سرینگر کو سورج کا شہر بھی کہتے ہیں یونانی تاریخ دان سرینگر کو ''کس پٹ روس'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

تاریخی حوالوں سے ظاہر ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح کو یہ شہر موریہ حکمران مہاراجہ اشوک کے عہد میں 250 ق۔م میں بسایا گیا۔ جو کہ زبرون پہاڑی کے جنوب میں جہلم کے دائیں کنارے پھر پاندر ٹھن کے مقام پر تھا۔ شنکر آچاریہ پہاڑی کے مشرق میں اس کا نام شری نگر یعنی شاندار قسمت والا شہر پڑ گیا۔ مہاراجہ اشوک کے بعد یہ شہر تقریباً آٹھ سو سال کشمیر کی راجدھانی رہا۔ اسی دوران گوپادری۔ پانتہ چوک کے علاوہ جھیل ڈل کے کنارے آج کے ہارون تک کئی وہار وغیرہ تعمیر کئے۔ راجہ گوپادت نے آج کل کے گپکار کے مقام پر آریہ ورت شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے

برہمنوں کو جاگیریں عطا کیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب پرورسین ثانی کشمیر کا بادشاہ بنا۔ تو اس وقت شہر کی آبادی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی آبادی کے مقابلے میں اراضی کم پڑنے کے پیش نظر راجہ پرورسین نے اپنی راجدھانی تبدیل کی اور اسے ہاری پربت کے اردگرد بسایا۔

راجہ پرورسین نے اپنی نئی راجدھانی کا نام اپنے ہی نام پر پرور پورہ رکھا۔ البتہ عام لوگوں کی زبان پر یہ نام بہت ہی کم وقت کے لئے رہ سکا اور انہوں نے نئے شہر کو پھر سے سرینگر یا راجدھانی کہنا شروع کیا۔ اس طرح سے راجہ اشوک کا بسایا ہوا پرانا شہر سرینگر کے نام سے مشہور ہو گیا اپنی کتاب راج ترنگنی میں کلہن پرور پورہ کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ شہر بڑا خوبصورت تھا۔ عالیشان مکانات اور باغات اس میں تھے۔ یہاں خوبصورت مندر اور وہار تھے۔ پرور پور کو وتستا (جہلم) کے سیلاب سے بچانے کے لئے جنوب مغرب کی طرف ایک مضبوط بنڈ تعمیر کیا گیا۔ اس طرح سے پرور پور کی حدیں نالہ مار اور جہلم کے دائیں کنارے ہاری پربت کے شمال مشرق علاقے میں آنچار جھیل تک پھیل گئیں۔ اسی طرح ہاری پربت کے اردگرد کا علاقہ پرور پور کا مرکزی حصّہ بن گیا اس وقت جہلم کے آر پار مستقل پُل نہیں تھا اس کے برعکس کشتیوں کے پل تھے۔ جہاں سے لوگ آر پار جا سکتے تھے۔

للتا دیتہ 761-724 نے اپنا دار الخلافہ پرور پور سے پرسپور منتقل کیا۔ اس نے اپنے سیاسی مقاصد کی خاطر پرور پور اور پاندریٹھن کی مرکزی اہمیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ پیڈ 785-751 کے وقت اندر

کوٹ میں اور اونتی ورمن کے وقت اونتی پورہ میں نئ راجدھانی تعمیر کی گئی۔
نویں صدی عیسوی میں سویہ انجینئر نے جہلم کا رُخ تبدیل کیا جس سے
پرسپور ایک لحاظ سے غیر آباد ہو کے رہ گیا۔ نویں صدی عیسوی میں شنکر ورمن
نے پٹن بسایا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان راجدھانیوں نے اپنی اہمیت کھودی۔
کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے اس کے باوجود سرینگر نے اپنی اہمیت برقرار رکھی
اور برابر چودھ سو سالوں سے یہ اب بھی ریاست جموں و کشمیر کی گرمائی
راجدھانی ہے۔ سرینگر کو قدرت نے خوبصورت نظاروں سے لبریز کیا ہے
یہاں ارد گرد خوبصورت پہاڑ اور ندی نالے ہیں۔

سرینگر کے وسط میں دریائے جہلم بڑی خوبصورتی سے بہتا ہے جس کو
پرانے وقتوں میں وتستا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور سرینگر کو دو حصوں میں
تقسیم کرتا ہے۔ 1323ء میں رینچن شاہ جس کا اسلامی نام صدرالدین تھا۔
پہلا مسلمان بادشاہ تھا جو کشمیر کے تخت پر بیٹھا اور رینچن پور بسایا جو آج کل
کے نواکدل اور عالی کدل کے درمیان ہے۔ یہاں پر بادشاہ نے پہلی مسجد
بنائی۔ اور اپنے مُرشد کی یاد میں ایک خیراتی ادارہ بلبل لنگر تعمیر کیا۔ اس طرح
سے بڈشاہ 70-1420 کے دور میں نیا شہر نوشہرہ بسایا جو سرینگر سے ۵ میل
کے فاصلے پر ہے۔ اکبر بادشاہ کے دور میں ہاری پربت کی فوجی اہمیت اور
زیادہ بڑھ گئی۔ جب ناگرنگر شہر بسانے کے لئے لگ بھگ ساڑھے تین میل
رقبے پر ۲۰ فٹ اونچی فصیل بنوائی گئی۔

مغل دور میں جھیل ڈل کے پار زبرون پہاڑوں کے دامن میں نشاط

باغ، شالیمار اور چشمہ شاہی میں تعمیریں کھڑی کرنے سے خوبصورتی اور بھی بڑھ گئی انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سرینگر کے مغربی حصہ میں نرسنگھ گڈھ، راماباغ اور مگھرمل باغ شامل ہو گئے۔ میر سید علی ہمدانیؒ کشمیر میں سلطان قطب الدین کے وقت میں ۱۳۷۲ء میں تشریف آور ہوئے۔ آپ کے وقت میں کشمیر میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ سرینگر شہر میں بدھ دور کے سب سے پرانے آثار ہاروان اور اس کے اِردگرد کے علاقوں میں رام چند کاک سابق وزیر اعظم جموں وکشمیر نے دریافت کئے۔ آٹھویں اور نویں صدی کا زمانہ فن تعمیر کے لحاظ سے کشمیر میں بڑی اہمیت کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس دوران للتا دیتہؒ اور اونتی ورمن جیسے بادشاہوں نے کشمیر پر حکومت کی۔ دونوں نے کشمیر میں مختلف جگہوں پر مندر اور محل بنوائے۔ البتہ سرینگر ان تعمیراتی کاموں سے اس وجہ سے الگ رہا کہ راجدھانی سرینگر سے باہر تھی پرس پورہ اور اونتی پورہ چودہویں صدی میں اور کشمیر میں دور سلطاطین کا آغاز ہوا اگرچہ مسلمان کاریگروں نے خاص طور سے لکڑی کا استعمال کیا۔ البتہ پتھروں کی تعمیرات بھی اس دور کی یادگار ہیں خاص طور پر بڈشاہ کے وقت تعمیرات مسجد مدین صاحب اور مزار سلاطین ہیں جسے عرف عام میں بڈشاہ کا ڈمٹھ کہتے ہیں سرینگر کی جامع مسجد سلطان سکندر نے ۱۳۹۸ء سے ۱۴۰۴ء تک بنائی۔ اور مغل دور کی پتھر مسجد ۱۶۲۳ء میں تعمیر ہوئی۔ سلطان کے ہی دور میں جہلم کے دائیں کنارے پر خانقاہ معلیٰ کی بنیاد ۱۳۹۵ء میں پڑی۔ جہاں پر میر محمد ہمدانیؒ قیام پذیر ہوئے۔ ۱۷۵۳ء کشمیر

میں پٹھان دور شروع ہوا اس دور کی یادگار ہاری پربت قلعہ اور شیر گڈھی ہے۔ سکھ دور میں کاٹھی دروازے کے باہر گروہر گوبند سنگھ کی یاد میں چھٹی پادشاہی گردوارہ بنایا گیا۔ جب وہ کشمیر جہانگیر کے ساتھ آیا ڈوگرہ دور میں ایک لحاظ سے کشمیریوں کے روایتی طرز تعمیر میں تبدیلی آئی اور فن تعمیر میں انگریزی طرز استعمال کیا جانے لگا۔ طالع منزل، عجائب گھر، (ریذیڈنسی) ایمپوریم گارڈن ہری سنگھ ہائی سٹریٹ، مہاراجہ ہری سنگھ پیلس، امر سنگھ سری پرتاب کالج، ایس - ایم - ایچ - ایس ہسپتال۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سرینگر میں بڑی بڑی عمارتیں وجود میں آئیں۔ خاص طور پر سول سکریٹ میڈیکل کالج، شیر کشمیر ہسپتال، ہائی کورٹ کمپلیکس اس کے علاوہ سرینگر میں حضرت بل، شنکر آچاریہ پہاڑی اور قلعہ ہاری پربت مشہور جگہیں ہیں۔

سرینگر کے تاریخی پُل :-

سرینگر میں ندیوں، نالوں اور دریاؤں پر مستقل طور پر پُل بنانے کا رواج دور سلاطین ہی میں شروع ہوا۔ شاہمیری خاندان سے قبل اکثر ندی نالوں اور دریاؤں پر کشتیوں کے پُل ہوا کرتے تھے جو کسی بھی حملے کے وقت ہٹا لئے جاتے تھے۔ ۱۹۵۷ء تک سرینگر کو سات پُلوں کا شہر کہتے تھے۔ کیونکہ سرینگر میں جہلم (وتستا) پر سات پُل تھے۔ جو سب کے سب لکڑی اور تعمیری لحاظ سے Cantiliver طرز کے تھے لکڑی سے تعمیر ہونے کے باوجود ایک پُل کا ڈیزائن دوسرے سے بالکل جُدا تھا۔ مزید بعض پُلوں پر دو طرفہ دوکانیں اور دائیں بائیں سرسبز شاداب بے انتہا انگور کی بیل ہوتی تھی

۱۹۵۷ء میں لکڑی کے دو پُل بنائے گئے اور جدید نوعیت کے تین کنکریٹ پُل بنائے گئے۔ سرینگر میں جہلم (وتستا) کے آر پار بنائے گئے پُلوں کے نام اس طرح ہیں۔

۱/	زیرو برج تعمیر	بخشی غلام محمد	1957ء
۲/	عبداللہ برج تعمیر	خواجہ غلام محمد شاہ	1984ء
۳/	امیرا کدل قدیم تعمیر	امیر خان جواں شیر پٹھان گورنر	1773-1774ء
۴/	بڈشاہ کدل تعمیر	بخشی غلام محمد	1958ء
۵/	حبہ کدل قدیم	سلطان حبیب شاہ	1573ء
۶/	حبہ کدل جدید	فاروق عبداللہ	1997ء
۷/	بسکو برج تعمیر	شیخ محمد عبداللہ	1983ء
۸/	فتح کدل تعمیر	سلطان فتح شاہ	1520ء
۹/	زینہ کدل قدیم	سلطان زین العابدین	1427ء
۱۰/	زینہ کدل جدید	فاروق عبداللہ	
۱۱/	عالی کدل تعمیر	سلطان علی شاہ	1415ء
۱۲/	نوا کدل تعمیر	نورالدین خان	1766-67ء
۱۳/	صفا کدل تعمیر	سیف الدین خان	1671ء
۱۴/	سیمنٹ کدل تعمیر	غلام محمد صادق	1974ء

اس کے علاوہ ژونٹھ کوہل کنہ کدل اور شہر کے باقی ندی نالوں پر بہت

سارے پُل ہیں جو سب Cantilivens ڈیزاین پر بنائے گئے۔ پرانا امیر اکدل جو اصل میں امیر خان جوان شیر کی تعمیر ہے کو ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کے زمانے میں مرمت کر کے اس کے پلیٹ فارم پر چونے کی سرخی لگا کے پختہ بنائے گئے۔ چونے کی سرخی سے تعمیر کردہ وہ سات پُل جس کو وانٹ پُل کہا جاتا ہے اس وقت تعمیر کئے گئے جب نایدیار سے نشاط باغ تک جھیل ڈل کے وسط سے راستہ نکالا گیا۔ اینٹوں سے یہ پُل بیچ میں اُبھرے ہوئے ہیں اور ساخت میں اونٹ کے کمر سے مشابہ ہیں۔ جن پر صرف پیدل یا گھوڑے پر آسانی سے چلا جاسکتا ہے۔ ان پُلوں کی تعمیر میں چونا اور سرخی استعمال کی گئی ہے اور پتھر کے ساتھ ساتھ فرش میں اینٹیں بھی استعمال کی گئیں ہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی سرینگر شہر کو زبردست اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہاں کشمیر کے بعض اہم بادشاہوں۔ شاعروں اور بزرگوں کے مدفن ہیں جن میں سید شریف الدین بُلبُل صاحب، سلطان صدرالدین، رینچن شاہ، شہاب الدین، سلطان سکندر، بڈشاہ، مخدوم صاحبؒ، بہاؤ الدین، گنج بخش میاں شاہ صاحب، خوشا صاحب مرزا اکمل الدین بدخشیؒ، سید محمد مدنیؒ بٹہ مالو صاحب، شاہ نیاز نقشبندی، مُلاّ محسن فانی، شیخ یعقوب صرفی، بابا داوٗد خاکی اور مُلاّ طاہر غنی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سرینگر میں مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سمادھیاں رام باغ کے نزدیک ایک باغ میں موجود ہیں۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں ٹینگی پورہ سے نٹی پورہ تک ایک باغ تعمیر کیا گیا جسے باغ امرود کہا جاتا تھا۔ اس میں امرود کے سینکڑوں درخت

تھے۔اس میں لوگ سیر و تفریح کی غرض سے جایا کرتے تھے بعد میں یہاں رہائش گاہیں تعمیر ہوئیں یہ علاقہ مختلف ناموں سے پکارا جانے لگا۔جن میں ٹینکی پورہ ،شہید گنج، گول باغ اولڈ سکریٹریٹ ،سرائے بالا اور سرائے پائین واقع ہے جہاں مسافر مغل روڑ سے آکر سرائے پائین اور بالا میں قیام کرتے تھے یہ علاقے سرینگر کے بیرونی حدود میں واقع تھے۔

درجن کے قریب باغ کا کچھ حصہ کاٹ کر افغان گورنر حاجی کریم داد نے گھوڑوں کی رہائش کے لئے وقف کر دیا اور گھوڑ دوڑ کے لئے ایک سڑک بنوائی۔ بزرگ لوگ آج بھی ڈل گیٹ کے پُل کو گردو کدل کہتے ہیں۔چونٹی کول کے کنارے چنار کے درخت لگوائے جو کہ چنار باغ کہلاتا ہے۔اب یہ جگہ سیاحوں کے لئے وقف کر دی گئی ہے۔یہاں پر چھوٹے چھوٹے ہاوس بوٹ اور ڈونگے ہیں۔جن میں سیاح لوگ رہائش اختیار کرتے ہیں۔

۱۸۱۹ء میں صوبیدار ہری سنگھ نے زیرو برج کے قریب دریائے جہلم کے کنارے اپنے نام سے ایک باغ بنوایا۔جس میں بعد میں ڈوگرہ حکمرانوں نے سیاحوں کے لئے بنگلے اور ایک حصے پر انگریز ریذیڈنٹ کے لئے ایک عمارت بنوائی۔ جبکہ باغ کو آج ایمپوریم باغ کہا جاتا ہے۔گول باغ ایسی ایک چراگاہ تھی۔ جہاں پر مویشیوں کی پرورش ہوتی تھی۔بعد میں اسے کھیل کے میدان میں تبدیل کیا گیا اور اس کا نام گاندھی پارک رکھا گیا۔

۱۸۳۴ء میں صوبیدار میاں سنگھ نے شیر گڈھی کے قریب گول باغ بنوایا۔ یہاں پر اب ہائی کورٹ کی بلڈنگ ہے میاں سنگھ نے ژونٹھ کول کے

قریب بسنت باغ بنوایا۔اوراس کے ساتھ ہی ایک اور باغ مندر باغ بنوایا۔
شیخ غلام محی الدین ۱۸۴۵ء میں کشمیر کے گورنر تھے تو آپ نے دریائے جہلم کے قریب ایک باغ بنوایا جو شیخ باغ کے نام سے مشہور ہے یہاں پر عیسائیوں کا قبرستان بسکو اسکول ، عدالت کی عمارت واقع ہے۔دیوان کرپارام جب کشمیر کے صوبیدار تھے تو انہوں نے نٹی پورہ کے نزدیک ایک باغ بنوایا۔جس کو رام باغ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ڈوگرہ دور میں یہاں شمشان گھاٹ تھا منشی تلوک چند نے سونہ وار میں ایک باغ بنوایا جس کو رام منشی باغ کہتے ہیں۔

شہید گنج کے قریب گلاب باغ مہاراجہ گلاب سنگھ کا تعمیر کردہ ہے یہاں پر محکمہ امور صارفین کے دفاتر اور گودام ہے۔ڈوگرہ دور کے وزیروں نے وزیر باغ، حضوری باغ ،سمندر باغ اور کوٹھی باغ بنوائے۔ جواب رہائشی علاقوں، اسکول، کالج عمارتوں میں تبدیل ہو چکے ہیں پرتاپ پارک مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۵ء میں بنوائی۔جموں کے گورنر دیوان دنیت رائے نے سرینگر میں میوے کا باغ بنوایا۔جسے دیوان باغ کہا جاتا ہے۔جو کرن نگر کے قریب واقع تھا۔اب یہاں رہائشی کالونی موجود ہے۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے دیوان باغ خرید کر اپنے بیٹے کرن سنگھ کے نام پر کرن نگر رکھ دیا جو آج تجارتی مرکز میں تبدیل ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ بونہ باغ ، باغ مندر بالا، آلوچی باغ ، باغ نند سنگھ اور باغ غیاث رہائشی بستیوں میں تبدیل ہو گئے سینٹرل سرینگر اب باغوں سے خالی ہو چکا ہے۔

اوّل بانی اسلام

حضرت شرف الدین عبدالرحمٰنؒ

المعروف بلبل شاہ صاحب

کشمیر کا ایک اپنا شاندار ماضی ہے یہ ہمیشہ ایک تاریخی ملک رہا ہے اس میں وقتاً فوقتاً دنیا کی مختلف اقوام نے ڈھیرے ڈالے ہیں۔ اس طرح کشمیر زمانہ قدیم سے لے کر انیسویں صدی تک مختلف قبیلوں اور خاندانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اگر چہ ۶۳۳ء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتقال کر گئے لیکن ان کے انتقال کے بعد ہی اسلام ساری دنیا میں تیزی سے پھیلنے لگا۔ اور اس کی شعاعیں افریقہ، یورپ اور ایشیا میں پہنچ گئیں اور ان ہی شعاوں نے وادی کشمیر کا بھی رخ کیا۔ کشمیر میں اسلام لانے والا پہلا شخص کون تھا۔ اس میں مورخوں کی تحقیقی کوششیں برابر جاری ہیں۔ کشمیر میں پہلی بار مسلمان راجہ ہرش کی فوج کے ذریعہ متعارف ہوئے چونکہ یہ فوج گوشت خور تو ضرور تھی مگر اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے کے بجائے مسلمان قصابوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ یہی قصائی کشمیر کے پہلے مسلمان کہلائے جا سکتے ہیں۔ یہ

مسلمان قصائی کہاں کے تھے اوران کا اصلی وطن کون تھا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک روایت کے مطابق کشمیر میں پہلا مسلمان محمد بن قاسم کے زمانے میں اس وقت داخل ہوا جب محمد بن قاسم کے فتح سندھ اور راجہ داہر کی شکست کے بعد حامیم شام کا یہ مسلمان یہاں آباد بھی ہوا ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ مسلمان کشمیر میں محمود غزنوی کے زمانے میں داخل ہوئے۔ خود محمود غزنوی بھی توسہ میدان تک آیا اور وہاں سے واپس چلا گیا۔ بہر حال مسلمان کشمیر میں داخل ہوئے۔ حضرت بلبل شاہؒ موسوی سادات کے مشہور معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ بہت مشہور اور بڑے خدادوست گزرے ہیں۔ آپ نے دینی اور دنیاوی، ظاہری وباطنی علوم فنون میں کمال حاصل کیا تھا۔ تمام عمر تنہائی، خلوت نشینی اور دنیا کی سیر وسیاحت میں گزاری۔ حضرت بلبل شاہ کا اصلی نام سید عبدالرحمٰن شرف الدین کنیت اور لقب بلبل شاہ تھا۔ آپ ترکستان کے رہنے والے تھے وہاں علم ومعرفت کی تربیت کے بعد بغداد چلے آئے وہاں پر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی اور سید شاہ نعمت اللہ کی ایمانی مجلسوں اور روحانی محفلوں میں شرکت کی اوران بزرگوں کے ساتھ گہرا رابطہ قائم کیا۔ ظاہری و باطنی علوم عرفانی حاصل کرنے کے بعد اس زمانے کے دستور کے مطابق آپ اسلامی دعوت کو عام کرنے کی غرض سے سیاحت عالم کے لئے نکلے اور ۱۳۲۰ء میں واردِ کشمیر ہوئے اور دعوت تبلیغ کا آغاز کیا۔

اس وقت کشمیر کا حکمران رینچن شاہ تھا۔ جو بدھ مذہب کا پیرو کار تھا

جب کہ اس کی بیوی کوٹہ رانی ہندو دھرم کی پیروکار تھی ۔ جو رام چندر رینہ سپہ
سالار کی لڑکی تھی ۔ اس لئے دونوں میاں بیوی میں اختلاف رہتا تھا کوٹہ رانی
چاہتی تھی کہ کسی طرح رینچن ہندو دھرم اپنائے ۔ مگر وہ راضی نہ ہوتا تھا۔ آخر
ایک دن انہوں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح سویرے سب سے پہلے جس مذہب کا
آدمی سامنے آئے وہ دونوں وہی مذہب اختیار کریں گے ۔ جب صبح سویرے
رینچن نے اپنے محل کی کھڑکی کھولی تو آپ نے دریائے جہلم کے اس پار ایک
شخص کو دیکھا۔ جو کچھ نئے طریقے سے عبادت کرتا تھا۔ یعنی نماز ادا کرتا تھا
یہی بزرگ حضرت بلبل شاہؒ تھے جو صبح کی نماز ادا کر رہے تھے ۔ رینچن شاہ
بادشاہ کشمیر کو یہ طریقہ عبادت پسند آیا اور کل کا کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ اور اسی
وقت ان کے پاس حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا اور اس کی بیوی کوٹہ رانی معہ
سب درباری اور وزراء مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ حضرت بلبل شاہؒ نے رینچن
کا اسلامی نام سلطان صدرالدین رکھا اور کوٹا رانی کا نام خاتون بیگم رکھا۔ اور
اس طرح کشمیر میں اسلام کو سرکاری پوزیشن حاصل ہوئی ۔ حضرت بلبلؒ
صاحب ایک بلند پایہ بزرگ تھے اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت
پابند تھے ۔ اور اعلیٰ پایہ کی ریاضت کرتے تھے جناب بلبلؒ صاحب خود
فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر طاقت عطا کی ہے کہ وہ بغیر
کھائے پئے بھی زندہ رہ سکتے تھے ۔ لیکن ایسا کرنا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
کے خلاف ہوگا اور میں اپنے جسم کی ہمیشہ حفاظت کرسکتا ہوں ایک دن
حضرت بلبلؒ صاحب وضو کرنے کے ارادہ سے جہلم دریا کے کنارے کھڑے

تھے۔ ایک درخت کی ٹہنی پر ایک خوش آواز بلبل دیکھی جو نہایت میٹھی آواز میں گا رہی تھی یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ بلبل آسمان کی طرف جا اڑا۔ حضرت سید نے بھی اس کے پیچھے ہوا میں اڑان بھری اور اس خوش آواز کو پکڑ کر اپنی کوٹھری میں اترے اور بلبل ان کے ہاتھ سے غائب ہو گیا۔ ایک بزرگ نے اس واقع کی کیفیت ان سے دریافت کی۔ حضرت بلبلؒ صاحب نے فرمایا۔ کہ وہ پرندہ میری روح تھی جو آسمان پر چڑھ رہی تھی میں اس کے پیچھے گیا ہوا سے اپنی روح کو پکڑ کر لایا کہتے ہیں کہ سائل نے یہ بات جھوٹ خیال کی اور خاموش رہا۔ حضرت سید پر یہ بات روشن ہو گئی اور انہوں نے اپنے منہ کا پانی اس کے منہ میں ڈالا۔ پھر کیا تھا ملکوت اور لاہوت کے حالات اس پر ظاہر ہو گئے اور حضرت سید نے جو فرمایا تھا۔ اس پر اقرار کیا یہ بات جب لوگوں میں پھیل گئی تو انہوں نے بلبل شاہؒ کا لقب دے دیا سلطان صدرالدین نے اپنے پیرو مرشد کے لئے سرزمین کشمیر میں پہلی بار مسجد اور خانقاہ تعمیر کی جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اس سے قبل سرزمین کشمیر میں کسی مسجد، خانقاہ اور مقبرہ کے آثار نہیں پائے جاتے ہیں۔

حضرت بلبل شاہؒ کا وصال ۷ ماہ رجب مطابق ۱۳۲۷ء میں ہوا اور اپنی خانقاہ کے نزدیک سپرد خاک کئے گئے ہیں۔

سال تاریخ وصل حضرت شاہ بلبل

قدس گفت خاص آلہ

حضرت بلبل شاہؒ کی قبر ایک لمبے سادہ پتھر کی ہے۔ جو بلبل لنکر عالی

کدل سرینگر میں برلب دریائے جہلم ہے ان کی قبر پر کوئی کتبہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلبلؒ صاحب کی قبر کے نزدیک علامہ احمد کی قبر ہے۔ سلطان صدر الدین کی قبر بھی حضرت بلبل شاہؒ کے مقبرہ کے ساتھ ہی مغرب میں ایک چھوٹے زمین کے ٹکڑے میں واقع ہے۔ جہاں محکمہ آثار قدیمہ نے ایک خوشنما پارک تعمیر کی ہوئی ہے۔ سلطان صدر الدین نے ۱۳۲۰-۱۳۲۳ء تک کشمیر میں حکومت کی۔ حضرت بلبل شاہؒ پہلے اسلامی مبلغ تھے۔ جنہوں نے سرزمین کشمیر میں پہلی بار لوگوں کو اسلام سے روشناس کرایا۔ حضرت بلبل شاہؒ کی یادگاروں میں ان کی خانقاہ کو خاص اہمیت حاصل ہے یہ سرزمین کشمیر کی وہ اولین خانقاہ ہے جہاں باقاعدہ طور اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ حضرت بلبل شاہؒ یہاں ہی بیٹھ کر غیر مسلموں کو اسلام کا درس دیتے تھے۔ اور مسلمانوں کی دینی تربیت کرتے تھے۔ یہاں ایک لنگر بھی تھا۔ جہاں مسکینوں، یتیموں کی رہائش کا پورا انتظام کیا گیا تھا۔ اور آج بھی اس علاقے کو بلبل لنکر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ خانقاہ ۱۶۱۳ء میں نذر آتش ہوئی۔ اُس وقت کشمیر میں اکبر علی مغل گورنر تھا۔ البتہ یہ عمارت دوبارہ بن گئی۔ ۱۸۳۶ء میں سکھوں نے اس خانقاہ کو اپنے قبضہ میں لیا اور اجناس خانہ میں تبدیل کیا۔ البتہ ۱۹۳۳ء میں عوامی دباؤ کے تحت مہاراجہ ہری سنگھ نے اسے مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔

حضرت بلبل شاہؒ کی ہدایت پر بادشاہ کشمیر صدر الدین رینچن شاہ نے ۱۳۲۱-۱۳۲۲ء میں دریائے جہلم کے کنارے محلہ عالی کدل میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی جسے آج بھی مسجد رینچن شاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ

مسجد رینچن شاہ کے محل کے بالکل قریب تھی۔ ایک مدت کے بعد یہ مسجد نذر آتش ہوئی۔ تاہم اس کی جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی گئی۔ مسجد کے دروازے پر صدر الدین نے شاردا زبان میں ایک کتبہ لگوایا تھا جس سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت میں ایک انگریز افسر نے چرایا اور لندن کے عجائب گھر میں پہنچا دیا اسلامی کشمیر کی تاریخ میں ۱۳۲۰ء کو بڑا ہی مبارک سال تصور کیا جاتا ہے۔ جو حضرت بلبل شاہؒ صاحب یہاں تشریف لائے اور ان کے قیام کے دوران بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے اس کے بعد ۵۲ سال کے بعد حضرت امیر کبیرؒ ۱۳۷۲ء میں کشمیر تشریف لائے۔ حضرت بلبل شاہ کے ساتھ کچھ مشہور علماء بھی یہاں تشریف آور ہوئے ان میں خاص کر ملا احمد کا شمار کیا جاتا ہے۔ آپ بلبل شاہ کے نہایت گہرے اور قریبی دوست تھے۔ جب شاہ میر سلطان شمس الدین ۱۳۳۹ء میں تخت پر بیٹھا تو اسے ایک ایسے عالم کی ضرورت محسوس ہوئی جسے قرآن و حدیث پر پورا پورا عبور ہونا چاہیے تھا۔ بادشاہ نے ملا احمد کو کشمیر کا شیخ الاسلام مقرر کیا۔ چنانچہ آپ نے سارے اسلامی امور اپنے ہاتھ میں لئے اور علمی و دینی درس گاہیں قایم کیں۔ اور قرآن و حدیث کی اشاعت کے لئے مدرسے قائم کئے۔ اور اسلامی عدالت کو متعارف کرایا آپ سلطان شہاب الدین کے زمانے میں بھی اس عہدے پر برقرار رہے۔ آپ حضرت بلبل شاہؒ کے قریب ان ہی کے مقبرے میں سپرد خاک کئے گئے۔

☆☆☆

میر سید علی ہمدانیؒ

حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ ۱۲ رجب المرجب ۷۱۴ھ مطابق ۱۳۱۴ء کو ایران کے ایک مشہور شہر ہمدان میں پیدا ہوئے آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ اور آپ کے والد ماجد کا نام سید شہاب الدین تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب ۱۶ واسطوں سے حضرت امام حسین علیہ سلام کے ذریعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مل جاتا ہے حضرت امیرؒ نے بہت ہی چھوٹی عمر میں سارا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ آپ ذہین، ہوشیار اور حاضر جواب تھے۔ اس کے بعد آپ نے تصوف اور معرفت کی تعلیم اپنے ماموں حضرت سید علاؤ الدین سمنانیؒ کے پاس حاصل کی۔ ان ہی کے پاس آپ نے اسلامی علوم یعنی حدیث فقہہ اور فقہہ کی تعلیم بھی مکمل کی۔ بارہ برس کی عمر میں سید علاؤ الدینؒ نے اپنے ہونہار بھانجے کو دینی علوم میں مہارت حاصل کرنے کیلئے شیخ تقی الدین ابوابرکات کے سپرد کیا۔ اور ان کی وفات کے بعد شیخ شرف الدین مزدقانی کے مرید ہو گئے۔ شیخ شرف الدین مزدقانی کا خیال تھا کہ حضرت امیرؒ اپنی روحانی تعلیم کی تکمیل زیادہ سے زیادہ سفر کے ذریعہ کریں۔ لہٰذا امیر سید علی ہمدانیؒ نے ۲۱ سال تک دنیا کا سفر کیا۔ اس دوران آپ نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے علماء اور صوفیوں سے ملاقات کی۔ آپ شیخ مزدقانی

کی خانقاہ میں ٦ سال تک خدمت انجام دیتے رہے۔ بہر کیف حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ سات سو سادات کا قافلہ لیکر کشمیر میں جلوہ فگن ہوئے جونہی آپ سرینگر پہنچے سلطان قطب الدین جو کہ سلطان کشمیر سلطان شہاب الدین کا بھائی تھا آپ کے استقبال کو آئے۔ آپ سرینگر میں محلّہ علاؤالدین پورہ (موجودہ فتح کدل) میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں پر دریائے جہلم کے کنارے آپ کی نماز اور ریاضت کے لئے ایک مسجد بھی تعمیر ہوگئی۔ آپ نے اپنی آمد کے فوراً بعد کشمیر میں وعظ تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔ وادی کے مختلف علاقوں میں باضابطہ تبلیغی مشن قائم کئے۔ جس کے نتیجے میں اڑھائی سال کی قلیل مدت میں ۳۷۰۰۰ غیر مسلم کشمیری حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ آپ نے اہل کشمیر کو علم وہُنر، نئی تہذیب ادب ثقافت سے روشناس کیا۔ عربی اور فارسی زبان و تعلیم کو رواج دیا۔ رہن سہن، پوشاک، فن تعمیر میں انقلاب انگیز تبدیلیاں لائیں۔ کچھ دیر قیام کرنے کے بعد آپ وادی سے باہر تشریف لے گئے اور ۷۷۵ھ مطابق ۱۳۷۸ئ حج کے بعد دوبارہ کشمیر تشریف لائے اس وقت سلطان شہاب الدین کے بھائی سلطان قطب الدین کی حکومت تھی اس دفعہ آپ کا قیام یہاں اڑھائی برس تک رہا۔ ۷۷۳ھ میں براستہ لداخ آپ ترکستان روانہ ہوگئے۔ حضرت امیرؒ حقیقت، معرفت، صداقت اور روایت کا تاجدار ہیں اور کشمیریوں کے حقیقی معنوں میں عظیم محسن اور مربی تصور کئے جاتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی ایمانی غوث اور اعلیٰ روحانیت کا کرشمہ ہی تھا کہ ان کے صرف تین تبلیغی دوروں کے

نتیجے میں پوری وادی کشمیر میں ہمیشہ کیلیئے ایمان اور اسلام کی بہاریں آ گئیں۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی عظیم شخصیت کی بدولت نہ صرف اہل کشمیر کی تاریخ ہی نہیں بلکہ تقدیر بھی ہمیشہ کے لئے بدل گئی۔ بلکہ یہاں صنعت و حرفت، فنکاری اور دستکاری کے بے شمار دروزے کھل گئے اور معاشی میدان میں بھی ایک خوشگوار انقلاب آ گیا۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

دیا آپ نے ہم کو سود حیات
شعور و فہم اور عرفان ذات
یہی باز گشت نوائے ہمدان
امیر کبیرؒ تیری کیا ہے شان

حضرت امیر کبیرؒ تیسری اور آخری مرتبہ ۷۷۵ھ میں کشمیر تشریف لائے۔ اس دفعہ آپ کا خیال تھا کہ کشمیر میں زیادہ عرصہ کے لئے قیام کریں گے۔ مگر مجبوراً ناسازی طبیعت کی وجہ سے بہ طرف پکھلی روانہ ہو گئے یہاں مقام گنار میں تھوڑے عرصہ قیام کرنے کے بعد ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اس کے بعد آپ کو ختلان تاجکستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نہ صرف ولی اور خدا دوست تھے بلکہ بہت بڑے عالم و مصنف بھی تھے۔ آپ نے فارسی میں ذخیرت الملوک لکھی ہے۔ جس میں اچھی حکومت اور بلند اخلاق کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی اور بھی تصانیف ہیں جن میں اوراد فتحہ، مکتوبات امیریہ، چھہل اسرار، منازل سالکین شامل ہیں۔

حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ

سرزمین کشمیر میں میر سید محمد ہمدانیؒ کا نام ایک درخشندہ ستارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے اس مشن کو پورا کیا جس کی شروعات ان کے والد بزرگوار میر سید علی ہمدانیؒ اور ان سے قبل سید شریف الدینؒ (بُلبُل شاہ) جیسے بزرگوں نے کی تھی۔ میر سید علی ہمدانیؒ کا نام صرف کشمیر کی تمدنی تاریخ کے ہی حوالے سے اہم نہیں بلکہ انہوں نے خود ایسے کارنامے انجام دیئے جن سے کشمیر کے طول و عرض میں لوگوں کے دل تاریخ اسلام کے نور سے جگمگا اُٹھے۔ میر محمد ہمدانیؒ ۷۷۴ھ میں پیدا ہوگئے آپ امام زین العابدین علیہ اسلام کی اولاد میں سے تھے اور شجرہ نسب سیدنا امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ میر سید محمد ہمدانیؒ ہمدان میں پیدا ہوگئے۔ جس وقت آپ کے والد صاحب انتقال کر گئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ آپ کے دادا سید شہاب الدین ہمدان کے حاکم اور امیر تھے۔ لیکن اپنے والد بزرگوار کی طرح سیاسی معاملات کے بجائے روحانیت سے ہی خود کو جوڑا اور اس میں ولی کامل کا درجہ پاگئے۔ چار سال آپ نے خواجہ اسحاق کی خدمت میں گذارے سخت ریاضت کرتے ہوئے راہ سلوک کی منازل طے کیں۔ بعد ازاں نورالدین جعفر بدخشی کی خدمت میں رہ کر آپ نے آداب طریقت

سیکھے۔ یہاں تک کہ سولہ سال کی عمر میں کامل ہو گئے اور لوگوں کی رہنمائی میں مشغول ہو گئے۔ ۱۳۹۴ء میں آپ کشمیر وارد ہوئے اس وقت سلطان سکندر کشمیر کا بادشاہ تھا تب ان کی عمر بائیں برس کی تھی ان کے ہمراہ تین ہزار سادات کی ایک بڑی جماعت تھی۔ کم عمر ہونے کے باوجود آپ علم ظاہری و باطن سے پوری طرح واقف تھے۔ لہٰذا جوں ہی آپ یہاں پہنچے سلطان سکندر ان کے خاص مُرید بن گئے۔ جب ان کی تشریف آوری کی خبر شیخ نور الدین نورانیؒ نے سنی تو انہوں نے فرمایا ''کاشرِن پیر آوٗ'' یعنی کشمیریوں کیلئے پیر آ گیا۔ کشمیر میں اسلام پھیلانے کے لئے جو کام میر محمد ہمدانیؒ نے انجام دئے وہ قابل قدر اور حیرت انگیز ہے۔ میر محمد ہمدانیؒ اور شیخ العالمؒ کے درمیان ملاقات کا ذکر بہت ساری تاریخی کتابوں میں ملتا ہے اگر چہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر سید علی ہمدانیؒ کی کوششوں سے سرزمین کشمیر ہر طرف سے نور اسلام سے منور ہوا تاہم جس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی اسے منظّم و مستحکم بنانے میں میر محمد ہمدانی نے اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ میر سید ہمدانیؒ نے ریاضت اور تبلیغ کے لئے ایک چبوترہ قائم کیا۔ تو وہ میر محمد ہمدانیؒ کی تشریف آوری کے بعد دینی تعلیم کا مرکز بن گیا اور اس جگہ ۱۳۹۵ء میں خانقاہ معلّیٰ کی تعمیر شروع ہوئی جو ۱۳۹۷ء میں مکمل ہوئی۔ خانقاہ کی تعمیر کا کام پایہ تکمیل تک پہنچنے پر میر محمد ہمدانیؒ نے سلطان سکندر کو ایک لعل بدخشان تبرکاً دے دیا۔ جبکہ سلطان سکندر نے تین گاؤں وچی، نونہ ونی، اور ترال خانقاہ کے لئے وقف کر دئے۔ وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی خانقاہ کے

مجاوروں، خانقاہ میں قیام کرنے والوں اور مساکین اور غرباء میں تقسیم ہوتی رہی۔ خانقاہ کی دیکھ بال کا کام مولانا سید کے سپرد کیا گیا۔ یہ خانقاہ برابر آج تک کشمیر میں اشاعت اسلام کا اہم مرکز بنا ہوا ہے اور مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کی داستان عظمت ہے یہ خانقاہ کشمیر کا مقدس ترین مقام اور سرینگر شہر کا انتہائی دلکش حصّہ ہے الغرض سید میر محمد ہمدانی ؒ نے ۲۲ برس اسلام کی اشاعت کو فروغ دینے اور بدعتوں کو دور کرنے میں گذارے۔ ہر جگہ نو مسلمانوں نے مندروں کی جگہ مسجدیں تعمیر کیں اور بے شمار غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لایا۔ سلطان کے وزیر ملک سہہ بٹ کو استقبال کے موقعہ پر ایک ہی نگاہ کے اثر سے مسلمان بنا کے ملک سیف الدین کے نام سے موسوم کیا اور ظاہری و باطنی تعلیم تربیت سے عزت بخشی۔ کہتے ہیں کہ حضرت سید ؒ کے نکاح میں پہلے حسن بہادر (سید تاج الدین کے فرزند) کی لڑکی بی بی تاج خاتون تھی مگر وہ پانچ برس کے بعد وفات پائی اور فتح کدل کے نزدیک سپرد خاک ہیں اس کے بعد ملک سیف الدین کی لڑکی (سپہ سالار سلطان سکندر) بی بی بارعہ نکاح میں آئی وہ بھی تین سال کے بعد اس دنیا سے چل بسی اور کرالہ پورہ گاؤں میں اپنے باغ میں سپرد خاک کی گئی۔ آج کل دیدہ ماجی کے نام سے مشہور ہے۔ میر محمد ہمدانی ؒ اسلام کی اشاعت کے لئے ایک مدت کے لئے بذات خود تشریف لے گئے۔ بلتستان کے علاقہ شگر اور لداخ کے علاوہ لیہہ میں خانقاہیں تعمیر کر کے واپس آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سکندر حضرت میر ؒ کی محبت اور خدمت گذاری دل و جان سے کرتے تھے۔

آپ کے وقت میں کشمیر میں شراب، ناچ، نغمہ اور جوا پر پابندی عائد کی گئی۔ غیر مسلموں پر جزیہ نافذ کیا گیا رسم ستی کو منسوخ قرار دیا گیا اور بت پرستی کا خاتمہ کشمیر میں میر محمد ہمدانیؒ کے وقت میں ہوا۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے خاص مُرید اور رفقا جو آپ کے ساتھ کشمیر آئے میں سید حسن شیرازی جن کو قاضی ولی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور شیراز کے رہنے والے تھے سلطان سکندر نے آپ کو قاضی کشمیر بنایا اس کے علاوہ سید احمد سمنانی تھے، سید محمد اور سید صدر الدین دونوں نے جامع مسجد سرینگر بنوائی۔ سید حسن خوارزامی سکندر کے دو بیٹوں علی شاہ اور زین العابدین بڈشاہ کے استاد تھے اس کے علاوہ سید نور الدین، سید جلال الدین اور میر محمد مدنی بھی آپ کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔ آپ نے کشمیر میں ۲۲ سال قیام کیا۔ ۱۴۱۶ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ سلطان سے رخصت لیکر بارہمولہ کے راستہ کولاب (تاجکستان) روانہ ہوئے اور ۱۷ ربیع الاوّل ۱۴۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ آپ کی ابدی آرام گاہ آپ کے والد کے مرقد کے ساتھ ہی ہے۔ یہ مزار کولاب شہر (تاجکستان) کے مشرق میں واقع ہے۔ جو سید علی ہمدانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تاجک فن تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ عمارت پکی اینٹوں سے بنی ہے جس پر چونے کا پلستر ہے۔ اس مزار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ امیر تیمور نے بنوایا تھا اور اس کے پتھر وہی ہیں جو سمرقند میں تیمور کی قبر پر لگے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

خانقاہ معلّیٰ

کشمیر کے بت کدوں میں پہلا یہ گھر خدا کا۔ جب حضرت سید شرف الدین بلبل شاہؒ صاحب نے ۷۲۷ھ میں رحلت فرمائی اور ان کے تقریباً پچاس (۵۰) سال بعد کشمیر حضرت شاہ ہمدانؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تو حضرت شاہ ہمدانؒ نے سرینگر میں وارد ہوتے ہی حضرت بلبل شاہؒ کے خانقاہ واقع بلبل لنکر محلّہ میں ہی قیام فرمایا۔ کشمیر کا سلطان قطب الدین جو حضرت شاہ ہمدان کی دنیاوی اور دینی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ آپ کو شان وشوکت کے ساتھ خانقاہ بلبل شاہؒ سے پورے اعزاز کے ساتھ اس جگہ پر اتارا جو اب حضرت شاہ ہمدانؒ کی خانقاہ معلّیٰ کے اندر حجرہ خاص ہے اور اس وقت وہ ایک صفہ تھا۔ جہاں پر وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت شاہ ہمدانؒ نے یہی جگہ مستقل طور اپنے قیام کیلئے منتخب اور منظور فرمائی یہاں پر آپ نے اپنی عبادت گاہ مسجد اور اپنی خانقاہ بنالی۔ سلطان قطب الدین نے صفہ اپنی نماز گاہ کے طور پر ایک بڑے مندر کے نزدیک بنایا تھا۔ یہ مندر چھٹی صدی عیسوی میں ہندو راجہ پرورسین نے دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر ہندو دھرم کی ایک مقدس دیوی مہا کالی کے احترام میں بنوایا تھا۔

یہ مندر ۱۳۸۰ء تک کشمیر میں ہندوؤں کی عقیدت کا مرکز بنا رہا۔ اس

زمانے میں اس مندر کا سب سے بڑا پجاری جو شاہ ہمدانؒ کی روحانی عظمت و کمال کا قائل ہو کر مسلمان ہو گیا تھا نے مندر کو گرا دیا اور اپنے ساتھی پجاریوں سمیت دین اسلام کو فروغ دینے کے نیک عمل میں سرگرم رہا۔ اس زمانے کے نو مسلم بھی پہلے اس مندر میں عبادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ دوران قیام حضرت شاہ ہمدانؒ کا حجرہ خاص مسلمانان کشمیر کے لئے ایک عبادت گاہ بن گئی۔ البتہ اسے ایک عظیم تر خانقاہ کی صورت دینے کے لئے شاہ ہمدانؒ کے فرزند ارجمند سید میر محمد ہمدانیؒ اپنے چھ سو سادات کے ہمراہ ۱۳۹۵ء میں واردِ کشمیر ہوئے۔ اور اسی جگہ اترے جوان کے والد بزرگوار کی خاص جائے قیام تھی۔ یہ پورا علاقہ محلّہ علاؤ الدین پورہ کہلاتا تھا۔ اور موجودہ خانقاہ کے محلّہ سے موجودہ نر پرستان کی آخری حد تک پھیلا تھا اور اسی میں وہ عظیم الشان سرائے بھی تھی جو مبلغین اسلام کی بھاری تعداد پر مشتمل جماعت کے ٹھہرنے کی جگہ قرار پائی تھی۔

میر محمد ہمدانیؒ آتے ہی اس مقدس تبلیغی اور دینی مرکز کو خانقاہ کی صورت دینے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ میر محمد ہمدانیؒ نے سلطان سکندر کی مدد سے اس خانقاہ کو تعمیر کرنے کا قدم اُٹھایا۔ تاریخ حسن کے مطابق ایک منزلہ خانقاہ دو سال میں مکمل ہو گئی یعنی ۱۳۹۷ء سے لے کر ۱۳۹۹ء تک مشہور ہے کہ اولین کشمیر ولی جناب شیخ نورالدین نورانیؒ اس خانقاہ کے بنانے میں ایک مزدور کی طرح کام کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ مقامی اولیاء اللہ شیخ بہاؤ الدین گنج بخشؒ، سید محمد امین اور سید محمد مدنی بھی خانقاہ

بنانے میں کام کرتے رہے۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے خانقاہ معلیٰ کے اخراجات کو مستقل بنیاد پر جاری رکھنے کی غرض سے سلطان سکندر سے تین گاؤں خانقاہ کے وقف جاگیر کے طور پر حاصل کئے اور اس وقف جاگیر کے عوض آپ نے سلطان سکندر کو وہ لعل بدخشان دیا جو آپ اپنے ہمراہ لائے تھے اور سلطان سکندر نے وچی، نون ونی اور ترال نام کے تین گاؤں خانقاہ معلیٰ کے لئے مستقل طور دے۔ سلطان حسن شاہ کے عہد سلطنت میں علاؤالدین پورہ میں آگ نمودار ہوئی جس نے خانقاہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا اور اس عمارت کا بہت سارا حصہ شہید ہوا۔ سلطان نے فوراً خانقاہ کی مرمت کی اور اس کو وسعت دینے کی غرض سے اردگرد کے مکانات کو خرید لیا اور ان کو گرا کر زمین صحن خانقاہ کے ساتھ ملائی۔

سلطان محمد شاہ کے وقت میں خانقاہ کو شہید کیا گیا اور اسے دو منزلہ بنانے کے لئے کام شروع کیا گیا۔ سلطان محمد شاہ کی ملکہ صالح بیگم نے اپنے قدیم ساز وسامان زیورات اور دیگر چیزوں کو اکٹھا کیا اور ان کو نقدی میں تبدیل کروا کے خانقاہ معلیٰ کی تجدید اور تعمیر کے لئے کمر باندھی اور اُسے دو منزلہ بنوایا۔ ملکہ صالح نے تعمیر کے بعد خانقاہ کے معماروں اور مزدوروں کو دعوت دی اور انعام واکرام سے ان کو نوازا۔ ۱۱۴۶ء میں صوبیدار ابوالبرکات نے خانقاہ معلیٰ کی تجدید تعمیر کے لئے عملی اقدام اُٹھایا اس کو مزید خوب صورت اور دل کش بنایا اور خانقاہ کے اطراف میں کئی حجرے بنوائے وسط میں چار عالیشان بلند ستون نصب کروائے۔ سال ۱۲۱۸ء میں افغان صوبیدار عبداللہ

خان نے چھت کی تعمیر کی۔ ۱۳۰۴ء میں موجودہ بنگلہ دیش کے دارالخلافہ ڈھاکہ کے رئیس احسن اللہ خان صاحب نے خانقاہ معلیٰ کے سلطان خانہ کو لکڑی کے مضبوط اور چھپے ہوئے خوب صورت تختوں سے مفروش کیا۔

۱۹۲۴ء میں ایک درویش صفت انسان مفتی عبدالرحیم نے پشاور پاکستان میں مقیم ایک کشمیری تاجر غلام ہمدانی کے تعاون سے خانقاہ معلیٰ میں مرمت کے کام انجام دیئے۔ ۱۹۴۴ء میں خانقاہ کی چھتیں جو تعداد میں پانچ تھیں جن میں مٹی اور بوج پتر (برزہ) لگا ہوا تھا اور تقریباً خستہ ہو چکی تھیں سے مٹی ہٹانے کے بعد مضبوط ٹین کی چادروں سے ان کو ڈھک دیا۔ خانقاہ معلیٰ کے صحن کے گرد مٹی کی دیوار تھی اسے گرا کر پختہ اینٹوں کی دیوار بنائی گئی خانقاہ معلیٰ سرینگر کے عین وسط میں زینہ کدل اور فتح کدل کے دو پلوں کے درمیان میں دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر عظمت و وقار سے قائم ہے۔ اس کے صحن میں داخل ہونے کے لئے کئی راستے ہیں۔ لیکن مرکزی دروازہ باب الاسلام کے نام سے مشرق میں تعمیر کیا گیا۔

باب اسلام سے داخل ہو کر تراشے ہوئے عمدہ پتھروں کی چند زینوں سے اتر کر آدمی صحن پاک میں قدم رکھتا ہے دائیں بائیں تراشے ہوئے عمدہ پتھروں کے صفحے ہیں۔ چند قدم چل کر سامنے مرکزی دیوان مسجد ہے اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے بائیں طرف ایک بلند چبوترہ ہے اندر پاؤں رکھنے سے پہلے سیاہ سنگ فرش ہے اور دائیں طرف بھی ایک بلند چبوترہ ہے اس چبوترہ پر بھی لوگ عرس کے ایام میں نماز ادا کرتے ہیں۔ دائیں بائیں

ان دونون چبوتروں کے وسط میں سنگ سیاہ کے صاف وشفاف تین زینے ہیں اوران کے اوپر دیوان مسجد میں داخل ہونے کا دروازہ رحمت ہے۔ مسجد سے داخل ہونے والے پہلے دروازے پر دائیں بائیں اوراوپر نیچے نقاشی کی گئی ہے اوراشعار نقش کئے گئے ہیں۔

مسجد میں دیدہ زیب قالین لگے ہوئے ہیں جبکہ مسجد کی دیواریں اندر سے خوب صورت لکڑی کی بنی ہوئی ہیں اوران پر چاروں طرف اورادفتحیہ اور حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کبرت احمراور آیات قرآنی کندہ کی گئی ہیں اوران عبارات کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ کندہ کر کے فن خطاطی کا بھی نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کارثواب کشمیر میں افغان دور حکومت (۱۸۱۹-۱۷۵۳ء) کے ایک صوبیدار میر ہزار خان نے ذاتی زر کثیر خرچ کر کے انجام دیا۔ خانقاہ میں چار بڑے ستون مختلف رنگوں کے ہیں کبرت احمراوراورادفتحیہ کے علاوہ اورادعصریہ بھی کندہ کیا ہوا ہے۔ لکڑی کی دیواریں جنہیں آیات قرآنی سے تقدس بخشا گیا ہے۔ اسلامی فن تعمیر کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔ سامنے محراب ہے جہاں امام صاحب امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں محراب کے اوپر آیت الکرسی نقش ہے۔

محراب سے دائیں طرف نوفٹ کی دوری پر شمال مغربی گوشہ میں وہ خاص حجرہ شریف ہے جو حضرت شاہ ہمدانؒ کا ذاتی عبادت خانہ رہا ہے۔ حجرہ مبارک سے ذرا باہر سنگ سیاہ کا جنگلہ ہے جہاں پر اگر بتیاں اور موم بتیاں جلائی جاتی ہیں۔ جنگلہ کے سیدھ میں محراب ہے جس میں دروازہ نما کھڑکی

ہے اور اس کے اندر زربفت کا پردہ ہے جو کہ حجرہ خاص پر لگا ہے۔ عقیدت مند زائرین جنگلے کے باہر بیٹھ کر عاجزی وانکساری کے ساتھ حجرہ مبارک کی طرف منہ کر کے سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ اسلامی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ خانقاہ کی لمبائی ۶۳ فٹ اور چوڑائی ۴۲ فٹ ہے اور اس کی شکل مستطیل ہے۔ خانقاہ میں پنکھے اور خوب صورت جار لگے ہیں جن کی تعداد (۲۱) ہے یہ چار سفید، سبز اور سرخ رنگ کے ہیں اور بعضوں کے قابوں میں بجلی بتیاں بھی ہیں۔ خانقاہ میں شمال اور جنوبی دیواروں کے نیچے چھ چھ حجرے ہیں کل بارہ غالباً یہ کمرے درویشوں اور خدا دوستوں کی عبادت اور ریاضت کے لئے مخصوص تھے لیکن اب ان میں کوئی رہائش نہیں کرتا۔ خانقاہ کے اندر دو سیڑھیاں ہیں جو گیلری میں جاتی ہیں۔

خانقاہ معلیٰ کی عمارت دو منزلہ ہے اوپر کی منزل ساری کی ساری لکڑی کی بنی ہے اور اس کے دو اطراف یعنی شمال و جنوب میں بڑے طویل ایوان ہیں ایوانوں کے اندر بھی جو بڑے بڑے کمرے سلطان خانہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ بھی پرانے زمانے میں مسافروں اور درویشوں کے لئے مخصوص تھے اور اب گودام کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جنوبی ایوان خواتین کی نماز باجماعت کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ خانقاہ کی چھت تہ بہ تہ پانچ چھتوں پر مشتمل ہے اور ان کے اوپر ایک بالاخانہ ہے جس کے اوپر ایک اونچا مینار نما ستون ہے جو تکونی صورت میں ڈھکا ہوا ہے اور اس کے اوپر کلس لگایا گیا ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے خانقاہ کی

چھت کی ساخت اور طرز جدید بدھ مت کے کشمیری وہار کی طرز کے تقریباً مشابہ ہوگئی ہے۔ خانقاہ کے چاروں طرف جو صحن ہے اس کا شمال مشرق کا حصہ کشادہ ہے مغرب کی طرف کے حصے میں باغ ہے وہاں پر زینوں سے اتر تے ہیں اور جہلم کے کنارے پہنچ جاتے ہیں وہاں پر کشمیری برہمنوں کا کالی کا مندر ہے۔ جو اسلام کی مروت اور وسیع القلبی کی واضح علامت کے طور پر چھ سو سال سے موجود ہے۔

خانقاہ کے نزدیک جنوب کی طرف بالکل قریب ہی حضرت بابا علی والی صاحب کا روضہ ہے۔ آپ ترکستان کے رہنے والے تھے اور حضرت مخدوم حسن خوارزمیؒ کے مُرید تھے۔ ۹۹۹ھ میں کشمیر آئے اور خانقاہ معلیٰ سرینگر میں سکونت اختیار کی۔ سرینگر میں خاص وعام ان کے مرید ہو گئے۔ جب اکبر اعظم شہنشاہ ہندوستان اور کشمیری حکام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو آپ کی توجہ سے وہ ہنگامہ ختم ہوا لیکن چونکہ کچھ منافق اس صلح وصفائی کے خلاف تھے تو انہوں نے بابا علی والیؒ کو زہریلی شراب پلا کر شہید کر ڈالا یہ واقعہ ۱۵ صفر ۱۰۱۱ھ کو ہوا۔ حضرت بابا علی والیؒ کا روضہ شریف خانقاہ معلیٰ کے بغل میں ہے۔ خانقاہ معلیٰ میں جہاں حجرہ خاص ہے وہ خاص تبرکات ہیں۔ ایک ستون مبارک اور علم شریف جو جنگ بدر کے دن حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی استعمال میں رہے تھے۔ یہ ستون اور علم شریف دونوں سرینگر میں مسلمانان کشمیر کے ایک پرہجوم جلوس میں اس روز نکالے جاتے تھے جب کشمیر بڑے سانحہ سے دوچار ہو جاتا تھا۔ مثلاً بارش نہ ہونے کی وجہ

سے بحران پیدا ہو جاتا یا کوئی وبا پھیل جاتی اور مسلمانان کشمیر عزت واحترام کے ساتھ مناجات اور نعت پڑھتے پڑھتے عیدگاہ میں جا کر نفل نماز ادا کرتے تھے۔

در مدح خانقاہ معلیٰ

خانقاہ است ایں مگر یا مسجد اقصیٰ است ایں
مسکن امن و امان یا جنتہ الماوا است ایں

سقفِ سرفوعست ایں یا قبۂ چرخِ بریں
یا مگر از رحمت خیمۂ بریا است ایں

حجرہ خاص است ایں مشرق نور خدا
فیض حق یا وسعت دلہا است ایں

درمیاں قندیل یا شمع ہدایت روشن است
یا مگر نور تجلی یا ید بیضا است ایں

درگاہ غوثیہ خانیار سرینگر

ابتداء سے ہی سرزمین کشمیر روحانیت کا ایک عظیم مرکز رہا ہے بڑے بڑے بزرگوں اور ولیوں کی آمد نے اس سرزمین کو فیوض باطنی سے فیضیاب بنا دیا ہے۔ بزرگوں اور ولیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ یہاں بڑے بڑے بزرگوں کی زیارتیں بھی موجود ہیں۔

درگاہ شریف حضرت شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ واقع خانیار کی تاریخ ۱۰۹۶ھ سے شروع ہوتی ہے جب حضرت سیّد فاضلؒ قادری المعروف سخی شاہ صاحب اور ان کے برادر سیّد ابوالحسنؒ قادری فرزندان سیّد عبداللہ قادریؒ کشمیر تشریف لائے۔

سیّد محمد فاضلؒ المعروف سخی شاہ صاحب کے کشمیر میں مکمل طور قیام کرنے کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کے علاوہ مشائخانِ وقت، عالموں، فاضلوں، امیروں اور رئیسوں نے سلسلہ قادریہ میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے قبل شاہ نعمت اللہ قادریؒ، سید محمد اسماعیل شامی قادریؒ اور میر سیّد نازک صاحب قادریؒ نے بھی سلسلہ قادریہ کی ترویج میں کوشش کی تھی مگر سیّد محمد فاضلؒ کی بدولت کشمیر میں خانیار شریف یادالٰہی اور سلسلہ قادریہ کا مکمل طور مرکز بنا۔

حضرت سیّد محمد فاضلؒ حضرت پیر دستگیرؒ کی اٹھارویں پشت سے ہیں۔

حضرت ابوالحسنؒ قادری کئی سالوں کے بعد کشمیر میں ٹھہر کر پشاور (پاکستان) چلے گئے اور اپنے برادر سیّد محمد فاضل قادریؒ کو کشمیر میں مکمل طور سکونت کرنے کی تاکید فرمائی اور دین اسلام کے علاوہ سلسلہ قادریہ پھیلانے کی ہدایت کی۔ حضرت ابوالحسن قادریؒ نے اپنی باقی عمر پشاور میں وعظ و تبلیغ ادا کرنے دین اسلام اور سلسلہ قادریہ پھیلانے میں صرف کی اور پشاور میں ہی مدفون ہوئے۔ اُن کے تین فرزند میر زین العابدین قادری، میر سیّد شاہ غوث اور سیّد علی شاہ قادری ہیں یہ تینوں اعلیٰ پایہ کے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

زیارت عالیہ میں حضرت سیّد محمد فاضل قادریؒ صاحب پہلے سجادہ نشین تھے۔ اس کے بعد ان کے فرزند حضرت سیّد محمودؒ اس کے بعد ان کا فرزند سیّد غلام الدین آزاد پھر ان کا فرزند سیّد بزرگ شاہؒ صاحب ۱۹ ماہ جمید الاوّل ۱۱۱۷ھ، سیّد عبدالقادرؒ المعروف سیّد میر بادشاہؒ ۱۱۵۷ھ، سید محمودؒ ۱۱۸۳ھ اور سیّد غلام شاہ آزادؒ ۱۸ ماہ جمید الثانی ۱۲۰۳ھ کو اس دنیائے فانی سے چل بسے ہیں۔

حضرت سیّد عبدالقادرؒ المعروف میر بادشاہ، ان کے فرزند میر محمود صاحب قادریؒ سیّد محمد فاضل قادریؒ کے دائیں بطرف مشرق مدفون ہیں اور سیّد غلام شاہ صاحب آزاد حضرت سخی شاہ صاحب کے بائیں بطرف مغرب مدفون ہیں۔ اسی مقبرہ شریف کے شمالی حصے کی طرف ان کی بیویاں مدفون ہیں اور چار دیواری کے اندر ہونے کی وجہ سے ان کا حصّہ دکھائی نہیں دیتا

ہے۔

حضرت سیّد محمد فاضل المعروف سخی شاہ صاحبؒ کے بعد جب اُن کے پڑپوتے سیّد غلام شاہ صاحب آزاد سجادہ نشین بن گئے تو انہوں نے لوگوں کے جوق در جوق آنے اور کم جگہ کی بنا پر ذاتی زر کثیر خرچ کر کے ایک خانقاہ زیارت شریف کے ساتھ ۱۱۸۲ء میں زر کثیر خرچ کر کے تعمیر کروائی۔ سیّد غلام الدین آزادؒ نے خود ہی اس خانقاہ شریف کی سنگ بنیاد کی تاریخ یوں رقم فرمائی ہے۔

سال تاریخ ایں بنا آزاد گفت شد خانقاہ گیلانی ۱۱۸۲ء

غوث الاعظمؒ کی عقیدت مندی کے اس مرکز میں بڑے بڑے بزرگانِ دین مدفون ہیں۔ ساتھ ہی اس زیارت عالیہ میں حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا قرآن شریف جو بخط کوفہ پوست آہو پر لکھا ہوا ہے موجود ہے۔ سیّدنا حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ نے یہ قرآن شریف اپنے دل بند حضرت امام حسین علیہ السلام کو عطیہ میں دیا تھا۔ آخر میں یہ قرآن مجید حضرت امام جعفر صادقؓ کے پاس پہنچ گیا زیارت خانیار شریف پر یہ نسخہ حضرت امام نصر الدینؒ جو اعلیٰ پایہ کے بزرگ گذرے ہیں اور محلّہ روضہ بل خانیار میں مدفون ہیں کے ذریعہ پہنچ گیا۔

قاضی غلام قادر خان ساکن خانیار سرینگر ایک بہت بڑے رئیس اور قاضی شہر تھے انہوں نے سیّد محمد فاضلؒ کی بدولت سلسلہ قادریہ میں شمولیت کر کے فیوضات باطنی حاصل کئے اور اپنی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اپنے

پیرو مرشد سیّد محمد افضل کو بطور ہدیہ پیش کر کے خانیار میں ہی قیام کرنے پر رضامند کیا۔ اس کے علاوہ ایک علیحدہ کمرہ حضرت سیّد محمد فاضلؒ کی ریاضت وعبادت کے لئے تعمیر کیا۔ حضرت سیّد محمد فاضلؒ المعروف سخی شاہ صاحب بعد میں اس کمرہ میں دفن کئے گئے۔ غلام قادر خان جو کہ حضرت سیّد محمد فاضلؒ کے بعد اس دنیا سے چل بسے، سیّد محمد فاضلؒ کے قدم مبارک کے سامنے وصیت کے مطابق دفن کئے گئے ہیں۔ حضرت سیدنا، سید غلام شاہ صاحبؒ نے زائرین اور معتقدین کے بڑھتے ہوئے ہجوم کے پیش نظر ۱۱۸۲ھ میں مقبرہ اور حجرہ کے شمال کی طرف اپنی ذاتی لاگت سے ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کی موجودہ دو کمرے جن میں سے ایک کمرے میں موئے پاک جناب سیّد محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی تشریف فرما ہے اور دوسرا کمرہ موسوم بہ حجرہ شریف ہے مقبرہ حضرت سخی شاہ محمد فاضلؒ کے مغرب کی طرف واقع ہے اس میں سیّد غلام شاہ صاحبؒ اور آپ کے فرزند سیّد بزرگ شاہ صاحبؒ رہائش فرماتے تھے اور معتقدین کی روحانی تربیت فرماتے تھے۔ موئے پاک کے وِرد و مسعود کے بعد جب زائرین اور معتقدین یہاں نہ سما سکے تو ۱۲۲۹ھ میں ایک ملک التجار اور رئیس اعظم وقت خواجہ ثناء اللہ شال نے اپنی ذاتی آمدنی سے نالہ مار کی بھرائی کرائی۔ جس پر سید سخی شاہ محمد فاضلؒ کے مقبرہ کے مغرب کی طرف ۵۱×۳۳ ایک وسیع ہال حضرت بل آثار شریف کی قدیم زیارت گاہ کی طرز پر تعمیر کیا زیارت گاہ کی وسعت اور تزین کی طرف برابر توجہ دی جا رہی ہے اور اب یہ کام ادارہ جموں وکشمیر مسلم وقف بورڈ کی تحویل میں

دیا گیا ہے۔ حضرت قطب ربانی محبوب سبحانی غوث الصمدانی شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کے رتبہ عالی و عظمت پر لب کشائی کرنے سے بڑے بڑے اولیاء کرام نے تعظیماً گریز کیا ہے البتہ عشق حقیقی سے لبریز چند عرفاء نے اپنی طرف سے عقیدت کے پھول نچھاور کر کے سعادت مندی حاصل کی ہے۔

زباغِ اصفیا سروے زبزم مصطفیٰؐ شمعے
علی را قرۃ العینی بدیں محبوب سبحانی
(حضرت سلطان باہوؒ)

ورُودِ مسعود موئے شریفؐ:-

حضرت پیر دستگیر صاحبؒ کے موئے مقدس واقع خانیار شریف کی نشاندہی ۱۲۲۱ھ سے شروع ہوئی اس وقت سیّد بزرگ شاہ صاحب سجادہ نشین تھے۔ حضرت غوث الاعظمؒ کا موئے شریف افغان حکومت کے گورنر سردار عبداللہ خان نے کسی سیاح سے کافی رقم دے کر حاصل کیا اور زیارت عالیہ خانیار میں رکھ دیا۔ گورنر سردار عبداللہ خان سیّد بزرگ شاہ صاحب کے خاص مریدوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ۱۲۲۱ھ سے موئے مقدس کی نشاندہی شروع ہوئی تب سے ربیع الثانی شروع ہوتے ہی مسلمانان کشمیر اس بقعہ عالیہ میں آکر دُنیوی اور اُخروی فیوض حاصل کرتے ہیں اس مہینہ کی گیارویں بارویں اور اس کے بعد آخری جمعہ کے ایام میں نشاندہی موئے مبارک غوث الاعظمؓ کی جاتی ہے۔

آخر پر حضرت پیر نورالدین صاحب المعروف نندہ ریشیؒ ثانی ساکن

پانپور کے موئے شریف کی نشاندہی کے لئے مقرر کیا گیا۔ پیر نورالدین صاحب اپنے دور کے بڑے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ پیر نورالدین صاحب قادری کے بعد اُن کے خاندان کے پیر علی شاہ صاحب، پیر غلام محمد صاحب، پیر احمد شاہ صاحب اور پیر محمد سیّد صاحب نے پشت در پشت موئے شریف کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اس وقت محمد سعید صاحب کے فرزند پیر غلام قادر صاحب قادری بحکم سجادہ نشین خالد حسین گیلانی موئے مقدس حضرت غوث الاعظمؒ کی نشاندہی فرماتے ہیں۔

درگاہ غوثیہؒ

سرائے پائین امیرا کدل سرینگر

ابتداء سے ہی سرزمین کشمیر روحانیت کا ایک عظیم مرکز رہا ہے بڑے بڑے بزرگوں اور ولیوں کی آمد نے اس سرزمین کو فیوض باطنی سے فیضیاب بنادیا۔ بزرگوں اور ولیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ یہاں بڑے بڑے بزرگوں کی زیارتیں بھی موجود ہیں چونکہ کشمیر میں دین اسلام کی اشاعت سادات کرام کا ایک حصہ رہا ہے جس کی ابتداء میر سید علی ہمدانیؒ نے کی۔ اس کے بعد سینکڑوں کی تعداد میں سادات کرام واردِ کشمیر ہوئے اور ہر وقت دین اسلام کی تبلیغی اور روحانی خدمت کرتے رہے۔ ان میں حضرت اسماعیل شامی بھی ہے جو ہندوستان سے کشمیر تشریف لائے اور آپ نے قادری سلسلہ کی بنیاد کشمیر میں ڈالی۔ آپ حضرت غوث الاعظم کے پشت میں سے تھے ان کا شجرہ نسب اس طرح ہے۔

حضرت غوث الاثقلینؒ ان کے فرزند سید عبدالرزاقؓ، سید نصر الدینؒ، سید احمدؒ، شیخ یحیٰؒ، سید محمدؒ، سید علیؒ، سید حسنؒ، سید احمد ثانیؒ، سید یحیٰؒ، سید قاسمؒ، سید اسماعیل شامیؒ۔ آپ اکابر سادات اور فضلاء میں سے تھے۔ سید محمد قاسمؒ

کے آپ فرزند تھے۔ گوشہ نشینی، پرہیزگاری، خداترسی، عبادت، ریاضت ہر رنگ میں مرد کامل اور خدادوست تھے۔ روم، شام، سندھ اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد ۱۵۸۱ء میں کشمیر آ کر خلق خدا کی رہبری کی حضرت شیخ بابا داؤد خاکی نے ان کے حالات اور کمالات دیکھے تو ان کے ساتھ دوستی اور برادری کا رابطہ باندھا ایک دوسرے کی صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے اور اپنے اپنے سلسلوں کی اجازت ایک دوسرے کو دی۔ حضرت داؤد خاکیؒ نے چند منقبت آپ کی شان میں لکھے ہیں۔

خدا را گفتہ حمد بے پناہی
پس از نعت رسالتؐ دستگاہی
چو آمد میر اسماعیل شامی
کشمیر از عنایات الٰہی

کہتے ہیں کہ حضرت سیدؒ نے شیخ بابا داؤد خاکیؒ سے ایک طالب کو مانگا اور انہوں نے عارفوں کے رہنما میر نازک شاہ کو ان کے حوالہ کیا۔ میر نازک قادریؒ قاضی میر علی بخاریؒ کے خاندان میں سے تھے۔ جو بڈشاہ کے عہد میں قاضی القضاء تھے۔ آپ اپنے علم و فضل کے علاوہ زہد و تقویٰ معرفت الٰہی کے متوالے تھے، پرہیزگاری میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کے بعد میر نازک شاہؒ اسماعیل شامیؒ کی تربیت میں رہے یہاں دونوں نے کشمیر میں قادری سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ آپ حضرت شامیؒ کے معنوی فرزند بن گئے۔ میر نازکؒ نے سلسلہ قادریہ کے لازمی امورات ایک ایک کر کے پورے طور سے

عمل میں لائے ۔ فقیری اور تنہا نشینی اختیار کی۔ کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں میں نہایت احتیاط مدنظر رکھتے تھے۔ حضرت میر سید اسماعیل شامیؒ نے ان کو اپنا خلیفہ بنا کر مندرجہ ذیل تبرکات سے نوازا ۔ جناب شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ موئے مقدس کلاء شریف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو اس وقت سرائے پائین امیرا کدل میں خاص و عام کی زیارت کے لئے محفوظ ہیں۔ عصائے مبارک: حضرت غوث الاعظمؒ جو اس وقت خاندان نازکی کے پاس محفوظ ہے۔ کشمیر میں قادری سلسلہ کی بنیاد ڈال کر میر اسماعیل شامی یہاں قلیل عرصہ قیام کرنے کے بعد واپس ہندوستان چلے گئے۔

حضرت میر نازک قادریؒ کا انتقال ۱۰۲۲ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار پرانوار اور آپ کی خانقاہ کادی کدل میں واقع ہے۔ ان کے وصال کے بعد ان کے فرزند میر یوسف قادری نے خانقاہ کا انتظام سنبھالا۔ یہ تبرکات موئے شریف غوث الاعظم اور کلاہ شریف آنحضورؐ میر یوسف نے اندرابی سادات ملارٹہ کے سپرد کئے اور سید محمد اندرابیؒ کے پاس رہے۔ جو کہ سید میرک اندرابی کے فرزند تھے۔ اس کے بعد سید نعمت اللہ کے پاس انہوں نے میر نظام اندرابی کو اور انہوں نے سید عبدالغنی کو عطا فرمایا اور یہ تبرکات اندرابی خاندان کے اسلاف کے تصرف اور تحویل میں تھے سید عبدالغنی نے یہ تبرکات اپنے قدیم دوست سید حبیب اللہ خان ابن سید حفیظ اللہ خان جو کہ حکومت کشمیر میں ایک خاص ملازم تھے کے سپرد کئے وہ بندوق چھاونی مہاراجہ بازار میں ۱۲۹۶ھ میں فوت ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ تبرکات مسجد سرائے

پائین کے پیشوا سید احداللہ شاہ قادریؒ جو کہ شیخ الاسلام تھے کو بطور صدق دل اور متفقہ طور اس غرض سے سپرد کئے گئے کہ وہ برابر ان کی نشان دہی یعنی زیارت عوام الناس کو کرایا کریں۔ چنانچہ وہ مسلسل طور پر ۱۹۲۰ء تبرکات کی نشان دہی کراتے رہے ان کی رحلت کے بعد ان کے بڑے فرزند الحاج سید غلام محمد شاہ قادریؒ ۱۹۵۹ء تک لگاتار ان تبرکات کی نشاندہی کراتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے برادر اصغر سید سلام الدین قادری نے ۱۹۷۱ء تک تبرکات کی نشاندہی کا کام بہ حسن خوبی سرانجام دیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے فرزند شفیع احمد قادری ان تبرکات کی نشاندہی تادم تحریر سرانجام دیتے آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ہمیں ان تبرکات کے طفیل نیک راستوں اور راہوں پر گامزن ہوکر اپنے فیض و برکات سے فیضاب و شاداب کرکے پورے عالم اسلام کو کامیابی اور کامرانی عطا فرمائیں۔

ایک عظیم شخصیت

حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ

خدا تعالیٰ نے وادی کشمیر کو جہاں ظاہری خوبصورتی سے نوازا ہے۔ وہاں کشمیر ابتداء ہی سے ریشیوں، عابدوں اور صوفیوں کا مرکز رہا ہے۔ ان ہی میں سے ایک بلند پایہ شخصیت سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کشمیری کی ذات گرامی ہیں۔ آپ تجر شریف سوپور میں ۱۴۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام بابا عثمان رینا تھا آپ اعلیٰ پایہ کے صوفی بزرگ تھے۔ حضرت حمزہ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی مریم تھا جو متقی اور پرہیز گار تھیں۔ جن کے والد صاحب کا نام دولت ملک تھا جس وقت شیخ حمزہ تولد ہوئے اس وقت شاہمیری خاندان کا سلطان محمد شاہ کشمیر کا حکمران تھا۔
حضرت مخدوم صاحب کا اسم شریف ''حمزہ'' رکھا گیا۔ حمزہ عربی زبان میں شیر کو کہتے ہیں آنحضورؐ کے چاچا کا اسم مبارک بھی حمزہ ہی تھا جو کہ جنگ احد میں شہید ہوئے مخدوم صاحبؒ نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال زینہ گیر تجر شریف میں ہی گذارے۔ ان کے والد بابا عثمان رینا پرہیز گار اور صاحب علم وفاضل بھی تھے۔ اسی وجہ سے مخدوم صاحبؒ اولین درسی تربیت

گاہ ان کے دولت خانہ ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تجر شریف میں ہی ایک مکتب ہے۔ حضرت محبوب العالم کی ابتدائی تعلیم وہاں ہی حاصل ہوئی یہ مکتب سلطان شہاب الدین کا قائم کردہ تھا۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت مخدوم صاحب کو ان کے دادا زیتی رینا سرینگر لے آئے۔ اور مدرسہ دارالشفاء میں داخل کرادیا۔ یہ مدرسہ کوہ ماراں کے شمال مشرق میں ایک عظیم الشان خانقاہ تھی جہاں اُس وقت کے بڑے بڑے علماء، فضلا درس وتدریس دیتے تھے جن میں بابا فتح اللہ، آخون مُلاّ درویش، مُلاّ لطیف اللہ قابل ذکر ہیں۔ حضرت حمزہ مخدوم نے یہاں قرأت، تفسیر، فقہ حدیث اور ادب میں پوری مہارت حاصل کی۔ عربی اور فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل کیا۔ کمانگر پورہ نزدیک جامع مسجد میں بھی ایک علمی ادارہ خانقاہ شمسی چک تھا یہاں پر بھی حضرت مخدوم صاحب نے اپنا بچپن گزارا اور ریاضت میں مشغول رہے۔ حضرت محبوب العالم نے اس خانقاہ میں بھی فقہ، علم حدیث، تفسیر، منطق، تاریخ کی تعلیم حاصل کی۔ جب آپ کی عمر ۳۶ سال کی ہوئی تو انہی دنوں ہندوستان کے مشہور و معروف عالم اور ولی کامل حضرت سید جمال الدین بخاری ۹۳۲ھ میں کشمیر تشریف لائے کیونکہ آپ کو باطنی اشارہ ملا تھا کہ کشمیر جا کر لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دیں۔ کشمیر وارد ہو کر جناب بخاری نے ملک احمد یتو کی خانقاہ میں قیام کیا جوں ہی حضرت مخدوم صاحب نے ان کی آمد کی خبر سنی تو ان کی خدمت میں پہنچے اور جب تک بخاری صاحب یہاں تشریف فرما رہے آپ

برابران سے علم وعرفان کا فیض حاصل کرتے رہے۔

حضرت سلطان العارفینؒ یادالٰہی میں ہروقت محو رہتے تھے۔ آپ اکثر اوقات کے دوران قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کو قرآن مجید پڑھنے کا شوق تھا یہاں تک کہ سارا قرآن مجید حفظ کرلیا۔ حضرت محبوب العالمؒ ذکرواذکار کے علاوہ کثرت سے ذکر چارضرب کرتے تھے۔ آپ سخت سردیوں میں سرد پانی سے غسل فرما کر عبادات میں مشغول ہوتے تھے۔ اکثر رات کے وقت آپ راجوری کدل میں سید حسنؒ کے روضہ مبارک پر جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چرارشریف میں حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کی زیارت گاہ پر ننگے پاؤں تشریف لے جاتے تھے۔

حضرت محبوب العالمؒ کے دورمبارک میں کشمیر کے اطراف واکناف میں بے شمار بزرگان دین، خلق خدا کو ظاہری وباطنی برکات سے مالا مال کرتے رہتے تھے۔ ان میں کچھ ہستیاں ایسی تھیں جن کے علم عرفان کا دبدبہ کشمیر سے باہر بھی تھا۔ ان میں سے کچھ بزرگان دین علم حاصل کرنے کے لئے کشمیر وارد ہوئے اور اکثر حضرات حضرت محبوب العالمؒ کے ساتھ والہانہ عقیدت کے حامل رہے ہیں۔ جن میں خاص طور پر حضرت باباداؤد خاکیؒ، حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ، حضرت سید اسماعیل شامی قادریؒ (جن کی بدولت موئے شریف دستگیر صاحب کشمیر میں وارد ہوا جو کہ اس وقت آستانہ عالیہ سرائے پائین میں محفوظ ہیں۔) کے علاوہ بابا مسعود نوریؒ، حضرت سید میرک شاہ اندرابیؒ، خواجہ طاہر رفیقیؒ، حضرت زیتی شاہؒ درگمولہ، مُلّا جوہرناتت،

حضرت بابا ہری دریشیؒ، سید احمد کرمانیؒ، فیروز گنائیؒ اور بابا علی رینہؒ قابل ذکر ہیں۔ بابا داؤد خاکی جو کہ مخدومؒ صاحب کے خاص شاگرد تھے پہلے بادشاہ کشمیر نازک شاہ کے بچوں کے اتالیق وشاہی درباری اور شہر کے قاضی القضاء تھے۔ اور جب مخدوم صاحب سے تعلقات پیدا ہو گئے جو عشق کی حد تک بڑھ گئے تو خاکی صاحب نے ان کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا اور ان کے مُرید ہو گئے۔ آپ کے علمی کارناموں کے پیش نظر آپ کو امام ابوحنیفہ ثانی کا خطاب دیا گیا۔ آپ کی تصانیف میں قصیدہ وردالمریدین، قصیدہ جلالیہ اور دستور السالکین مشہور ہیں۔ حضرت مخدوم صاحبؒ نے لوگوں کی علمی اور روحانی تربیت کے لئے باقاعدہ اوقات مقرر کئے تھے اور گشتی وعظ کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا اور اسلام کو ایک تحریک کی طرح جگہ جگہ پھیلانے اور پہچانے کے لئے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ جہاں جاتے تھے وہاں اجتماعات بُلائے جاتے تھے۔ لوگوں کے سامنے مخدوم صاحب خود اسلام کا پیغام رکھتے تھے اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے کچھ علاقوں میں مستقل قیام بھی کیا اور وہاں پر آپ نے مسجدیں بھی بنوائیں۔ ان میں مسجد امام بانڈی پورہ، مسجد نادی ہل اور مسجد تجرو وغیرہ مشہور ہیں۔ آخر آپ نے مستقل طور پر کوہ ماراں (ہاری پربت) پر قیام کیا۔ یہ جگہ آپ کو بہت پسند آئی اور یہاں ہی مستقل سکونت اختیار کر کے تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رکھا یہاں آپ نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جسے ذاکر مسجد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک منزلہ مسجد تھی جہاں آپ نماز و

ریاضت کرتے تھے۔ حضرت مخدوم علم وعمل کا خزانہ تھے آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خوبیوں سے نوازا تھا خود فرماتے ہیں۔ کہ جب میں خانقاہ ملک شمس چک میں تعلیم حاصل کرتا تھا تو میری کم عمری کی وجہ سے ایک مرد صالح کو میرا ہم حجرہ (Room Mate) بنایا گیا یہ بزرگ ہمیشہ نصف شب کو اُٹھ کر سورہ کہف کی تلاوت کرتا تھا اور ایک روز جب میں نے ان سے کہہ دیا کہ سورہ شریف مجھے ساری کی ساری یاد ہوگئی ہے تو وہ حیران رہا اور فرمانے لگے کہ میں یہ سورہ شریف بہت ہی عرصے سے تلاوت کرر ہاہوں۔ اور آپ کو چند ہی بار سن کر یاد ہوگئی۔ فرماتے ہیں کہ جب میں نے ان کو پوری سورہ کہف سنائی تو وہ بہت خوش ہو گئے اور میرے ہاتھوں کو چوم دیئے۔

شیخ حمزہؒ اپنا زیادہ تر وقت یادالٰہی اور عبادات بجالانے میں ہی گذارتے تھے ان کے برادر مُلاّ علی رینا فرماتے ہیں کہ آپ روزانہ تین سو بار قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرتے تھے شیخ حمزہؒ اگر چہ تقریباً ان تمام طریقوں سے ذکر کیا کرتے تھے جو بزرگان دین نے بیان کئے ہیں تاہم چہار ضرب میں لا اللہ الا اللہ کا ذکر زیادہ پسند فرماتے تھے۔

کھانے پینے میں شیخ حمزہؒ اعتدال کے قائل تھے اور بہت ہی کم غذا کھاتے تھے۔ رمضان کے مہینے کے علاوہ بھی اکثر روزہ دار رہا کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ہر کھانے کی چیز کے متعلق پہلے یہ اطمینان کیا کرتے تھے کہ کھانا حلال ہی ہے۔ حضرت شیخ حمزہؒ نے خانقاہ شمس چک میں تقریباً بیس سال گذارے جہاں انہوں نے مذہب اور سلوک کی اعلیٰ تربیت حاصل

کی۔ اسی دوران انہوں نے کلاش پورہ کے نزدیک سرینگر میں قیام کیا جسے مخدوم منڈو کہا جاتا ہے جہاں پر وہ یادخدا اور تبلیغ اسلام کے کام میں مشغول رہتے۔ اپنی منزل کو پانے کے لئے نفسیاتی خواہشات کو ترک کر دیا حتیٰ کہ وہ عمر بھر کنوارے رہے۔ اس کے بعد حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کوہ ماراں (ہاری پربت) پر چھ سال تک چلہ گزارتے رہے۔ حضرت شیخ حمزہؒ بلند پایہ کے مبلغ تھے انہوں نے کئی مساجد بھی تعمیر کیں وہ لوگوں کو توہمات سے نجات دلاتے رہے اور عمل پر زور دیتے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سی سماجی خدمات بھی انجام دیں۔ چرس پینے کی جو بُری عادت اس وقت نام نہاد درویشوں میں تھی۔ اس کی انہوں نے سخت مخالفت کی ان کی ہمہ گیر شخصیت نے یہاں عام زندگی کو متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ ۱۸۰۹ء میں افغان حکمران عطا محمد خان نے شیخ حمزہؒ کے نام پر سکہ بھی رائج کیا۔

حضرت شیخ حمزہؒ ۲۴ صفر ۹۸۶ مطابق ۱۵۷۶ء اس دنیا سے رخصت ہو گئے جسد خاکی کو کوہ ماراں پر اس جگہ کے بالکل قریب دفن کیا گیا جہاں وہ بہت عرصہ تک یادِ حق کرتے رہے ان کی درگاہ آج تک لوگوں کے لئے فیض پناہ بنی ہوئی ہے۔ مغل دور حکومت میں ایک فوجی افسر نواب عنایت اللہ خان نے ۱۷۱۲ء میں مقبرہ تعمیر کیا اور سکھ دور میں شیخ غلام محی الدین گورنر کشمیر نے ۱۸۴۵ء میں اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ آخر ان کو مرنے کے بعد کوہ ماراں کے مشرقی جانب سپرد خاک کیا گیا۔ مغل شہزادہ داراشکوہ نے یہاں ایک مسجد اور لابریری کے لئے عمارت تعمیر کی اس پہاڑی پر زیارت گاہ کے ساتھ ہی ایک

تالاب ہے ۔۱۹۶۲ء میں اس تالاب کے لئے ایک واٹر ریز رور یئر تعمیر کیا گیا۔ جس میں نلوں کے ذریعہ پانی آتا ہے چنانچہ روایت تھی کہ جب بھی کوئی ناگہانی مصیبت آجاتی تو لوگ وادی کے ہر کونے سے مشکوں ، اور برتنوں میں پانی لا کر آستانہ پر حاضر ہوکر گریہ زاری کرتے اور تالاب میں پانی بھر کر مصیبتوں سے نجات پالیتے ۔ ۱۹۳۶ء میں آستانہ عالیہ تک پہنچنے کے لئے پہاڑی پر پتھر کی سیڑھیاں تعمیر کی گئی ۱۹۷۵ میں مسجد سالار بیگ دوبارہ تعمیر کی گئیں جس سے پہلے ۱۵۹۶ء میں مغل فوجی افسر سالار بیگ نے تعمیر کیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں زیارت مخدوم صاحبؒ کے منتظمین نے تعمیراتی کام کو آسان بنانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی ۔ اس طرح مشرق کی طرف کی سیڑھیاں کی جگہ نئ سیڑھیاں بنوائی گئی ۔ ۱۹۴۵ء میں روضہ شریف کی چھت کو پیپر ماشی سے خوبصورت بنایا گیا۔ آستانہ عالیہ پر اگر چہ ہر روز عقیدت مند کافی تعداد میں آتے رہتے ہیں ۔ تاہم سوموار اور جمعرات کو زائرین کافی زیادہ تعداد میں آتے ہیں ۔ ہر سال کے ۲۴ صفر کو یہاں عرس کی تقریبات منائی جاتی ہیں۔ آستانہ کے نزدیک شیخ غلام محی الدینؒ گورنر کشمیر (۱۸۴۵ء-۱۸۴۰ء) بھی سپرد خاک ہیں۔

خانقاہ نقشبندیہ

نقشبندیہ ،صوفی سلسلہ کا ایک قدیم سلسلہ ہے اس سلسلہ کو حضرت خواجہ بہاوٗالدین محمد نقشبند مشکل کشا نے مقبول بنادیا۔آپ بخارا، وسط ایشیاء میں ۱۳۱۷ء میں پیدا ہوائے اور ۱۳۸۹ء میں انتقال کر گیے۔

کشمیر میں اس سلسلے کی بنیاد حضرت سید ہلال نے ڈالی جو یہاں سلطان سکندر کے عہد حکومت ۱۴۱۳-۱۹۸۹ء میں تشریف لائے ۔کہا جاتا حضرت ہلالؒ حضرت خوجہ بزرگ کے خلیفہ تھے ۔شالی کشمیر کے عشم پر تنہا زندگی بسر کی اور مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے اور اسی مقام پر ۸۱۶ھ کو انتقال کر گئے ۔سید ہلالؒ اپنے پیچھے ایک خلیفہ چھوڑ گیے۔حضرت سید محمد امین اویسی منطقیؒ جنہیں عرفِ عام میں اویسی صاحب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ کو بیہقی بیگم جو سلطان بڈشاہ کی ملکہ تھیں نے اپنا مُتبنیٰ بیٹا بنادیا تھا۔آپ نے سلسلہ نقشبندیہ کو اپنے مریدوں کے سپرد کیا اور ۱۴۸۴ء میں انتقال کر گئے۔عالی کدل سرینگر میں سپرد خاک کیئے گیے۔اویسی صاحبؒ کے انتقال کے بعد سے ایک سو سال تک نقشبندی سلسلہ خاموش رہا آخر خواجہ خاوند محمودؒ سولہویں صدی میں کشمیر تشریف لائے ۔آپ بخار (اُزبکستان) کے اکابر سادات تھے۔سرینگر پہنچ کر خواجہ بازار میں بال بچوں سمیت سکونت اختیار کی

جہاں خاص و عام اور حکام کثرت سے آنے لگے۔ اور فیض پانے لگے۔ ۱۶۳۳ء میں آپ نے بادشاہ حسین چک کے اس باغ میں ایک دلکش خانقاہ تعمیر کی۔ اس کو خانقاہ خاوندیہ اور خانقاہ فیض پناہ بھی کہتے ہیں۔

خانقاہ تعمیر ہونے کے کچھ عرصہ بعد خواجہ محمود لاہور چلے گئے۔ وہ ۱۶۴۰ء میں وہاں رحمت حق ہو گئے۔ خانقاہ کی نگرانی اور جاگیر کے انتظامات انہوں نے اپنے فرزند خواجہ معین الدین نقشبندی کے سپرد کئے۔ آپ نے اپنی ذہانت، قابلیت اور علم کے بل بوتے پر طریقہ نقشبندیہ کو چار چاند لگا دیئے۔ آپ نے فقہ اسلامیہ پر کئی کتابیں لکھیں۔

طریقہ نقشبندیہ میں ایک تازہ روح ڈال کر اس کے خصوصیات کو واضع کیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے پائی اور فقہ، حدیث اور تصوف کی تعلیم بزرگان وقت سے پائی۔ آپ نے وادی کشمیر کے لوگوں کو صحیح معنوں میں اسلامی شریعت کی تعلیم دی۔ آپ خود عالم تھے اور عالموں کی قدر کرتے تھے۔ آپ شہنشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ایک برگزیدہ ہستی قرار دیئے جاتے تھے۔ آپ نے بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں۔ کشمیر میں طریقہ نقشبندیہ نے خواجہ معین الدین نقشبندی کے ہاتھوں کافی فروغ پایا۔ آپ کی پدرانہ شفقت سے لنگر کے تمام شاگرد اور منتظمین آپ کے خلوص اور برتاؤ سے متاثر تھے۔ آپ ان کی دیکھ بال نگرانی اور مہمانوں کی مہمان نوازی میں مثالی کردار ادا کرتے تھے۔ جب آپ کی عمر شریف ۷۰ برس ہو گئی تو ۱۶۷۴ء میں ماہ محرم کے آخری دنوں انتقال کر گئے۔ اور

خانقاہ فیض پناہ خواجہ بازار کے صحن میں راحت کی نیند سو گئے۔ آج کل اسی مقام پر ان کا مرقد ہے۔

چونکہ ان کے بلند قد بیٹے اس سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور چھوٹے بیٹوں میں کوئی سجادہ نشینی اور خلافت کا قابل نہ تھا۔ اس لئے اہلیہ محترمہ جو خواجہ عبدالرحیم دہ بیدی کی پاک دامن بیٹی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی بہن کے بطن سے تھی نے خانقاہ کا بندوبست نہایت ذہانت اور حوصلہ مندی سے بجالا کر لوگوں کا دل جیتا۔

خانقاہ کے شمال مغرب میں زیارت خواجہ معین الدینؒ واقع ہے۔ زیارت کے اندر ان کا روضہ ہے۔ ان کے ساتھ ہی ان کی اہلیہ اور فرزند خواجہ اشرف الدین محمد اور ان کے فرزند خواجہ نظام الدینؒ سپرد خاک ہیں۔ ان چاروں قبروں پر کوئی کتبہ کندہ نہیں ہے۔ خانقاہ کے باہر مشرق میں ایک مسجد تعمیر کرائی گئی ہے جس کے ساتھ حمام بھی ہے۔ خانقاہ کے قبلے کی سمت مزار شہداء ہے۔ جہاں پر مجموعی طور پر وہ کشمیری سپرد خاک ہیں۔ جن کو ڈوگرہ فوج نے ۱۹۳۱ء میں سنٹرل جیل کے سامنے گولیوں سے شہید کیا تھا۔

مغل صوبیدار فاضل خان کے دور میں ۱۶۹۹ء میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مقدس جب کشمیر پہنچے تو موئے شریف کو خواجہ معین الدین نقشبندیؒ کے روضے کے اندر رکھا گیا اور موئے شریف کی نشاندہی حضرت شیخ محمد چشتی رادو عشائیؒ نے کی۔ زائرین کے ہجوم اور جگہ کی تنگی کے پیش نظر فاضل خان سے مشورے کے بعد موئے مقدس کی قرار گاہ باغ صادق

حضرت بل مقرر کی گئی۔

نقشبند صاحبؒ کا عرس مبارک ہر سال ۳ ربیع الاوّل کو منایا جاتا ہے۔
نماز عصر با جماعت بڑے جوش وخروش کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور عقیدت
مند اپنے عقائد کا بھر پور مظاہرہ کر کے نقشبندیہ کے تئیں اپنا خلوص پیش
کرتے ہیں۔ یہاں اُنہیں ''خواجہ دِگر'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔
روضہ شریف کے نزدیک خانقاہ ہے۔

شیخ غلام محی الدین صوبیدار ۱۸۴۵-۱۸۴۴ء کے دورِ حکومت میں اس
خانقاہ کی مرمت کی گئی۔ ۱۸۶۸ء میں ڈھاکہ سے نواب احسن اللہ خان
(جن کے آبا واجداد سرینگر کے محلّہ ناوٗ پورہ میں رہتے تھے) نے خانقاہ کی
مرمت کے لئے خواجہ ثناء اللہ شال کے نام دو ہزار روپے بھیجے، جس سے ثناء
اللہ شال کو احساس ہوا کہ خانقاہ کی طرف توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے۔ نواب
احسن اللہ سے اسے تحریک ملی۔ انہوں نے خود بھی ایک بڑی رقم دی اور لوگوں
سے بھی چندہ اکٹھا کیا، ساتھ ہی نواب احسن اللہ خان نے مزید تین ہزار
روپے بھیجے۔ اس طرح کافی رقم صرف کر کے خانقاہ کو نئے سرے سے
خوبصورتی کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ اس بار خانقاہ کی اندرونی چھت کو ''ختم
بندی'' سے آراستہ کیا گیا اور باہری چھت کو بھی تبدیل کیا گیا۔ اس نئی تعمیر کی
تاریخ ''خانقاہ عجب عالی شان'' ہے جو ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء بنتی ہے اس
کے بعد وقتاً فوقتاً خانقاہ کی مرمت مقامی اوقاف کے اہتمام سے ہوتی رہی۔

خانقاہ نقشبندیہ کی عمارت کو باہر سے دیکھیں تو مغرب کی طرف اوپر دو

پنجرہ دار کھڑکیاں نظر آتی ہیں، ان کی سیدھ میں نیچے دو شیشے کی کھڑکیاں ہیں۔ محراب کے سیدھے اوپر ایک درشن کھڑکی ہے۔ جس کے اوپر محل نما چھت ہے۔ جنوب کی طرف اوپر نیچے تین تین پنجرہ دار کھڑکیاں ہیں۔ مشرقی طرف اوپر تین اور نیچے دروازے کے دائیں بائیں دو پنجرہ دار کھڑکیاں ہیں۔ دروازے کے سامنے دہلیز باہر نکلی ہوئی ہے جس پر پتھر کی سلیں بچھائی گئی ہیں۔ خانقاہ کی بنیاد بڑے بڑے تراشیدہ پتھروں سے رکھی گئی ہے، جس کے گرد ایسے ہی پتھروں کا صوفہ بنایا گیا ہے بنیاد کے اوپر عمارت کی تعمیر میں لکڑی اور مہاراجی اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ہر ایک لکڑی کی تہہ کے بعد مہاراجی اینٹوں کی چار چار تہیں چڑھائی گئی ہیں۔ اوپر تین تہوں والی چھت ہے اور چھت کے اوپر ریشی طرز کی خانقاہوں جیسا ہی لکڑی کا مینار ہے۔

باہری طرف سے خانقاہ کو دیکھنے پر لگتا ہے کہ خانقاہ کی عمارت دو منزلہ ہے مگر اندر داخل ہونے پر پتہ چلتا ہے کہ دراصل یہ ۲۰ فٹ اونچی ایک ہی منزل ہے۔ اس کی اندرونی ختم بندی سے آراستہ چھت چار دیواری کے علاوہ چار مضبوط ستونوں پر استادہ ہے۔ چاروں ستونوں کے ساتھ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نہایت خوبصورتی سے جوڑے گئے ہیں۔ چھت میں جہاں جہاں روشنی کے جار لٹکائے گئے ہیں وہاں چھت کو مختلف رنگوں سے سجایا گیا ہے۔ خانقاہ کے محراب کو خوبصورت پنجرہ کاری سے سجایا گیا ہے۔ محراب کے اوپر شیشے کا روشن دان ہے۔ خانقاہ کی دیواریں اُڑھائی فٹ کی ہیں۔ اندر کی طرف دیواروں کو چھت سے فرش تک لکڑی کے کام سے

قابل دید بنایا گیا ہے۔ ہر باہری کھڑکی کے بالکل سیدھ میں اندر بھی ایک الگ کھڑکی ہے جن کی آراستگی کو اندرونی دیواروں سے مشابہ کیا گیا ہے۔ خانقاہ کے اندر شمال، مشرق اور جنوب میں ۳ فٹ چوڑی گیلری ہے جس پر چڑھنے کے لئے مشرق سے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہیں دائیں اور بائیں دو سیڑھیاں ہیں۔

جامع مسجد

جامع مسجد نوہٹہ سرینگر کے مغرب میں سکندر پور کے قریب واقع ہے۔ جامع مسجد کا سنگ بنیاد سکندر نے میر محمد ہمدانیؒ کے مشورے پر ۱۳۹۸ء میں رکھا۔ مسجد کی تعمیر کے لئے خراسان سے خواجہ صدر الدین نام کے ایک ماہر فن کی خدمات حاصل کی گئیں جن کی نگرانی میں تعمیر کا لگ بھگ سارا کام چار سال میں ۱۴۰۲ء تک مکمل ہو گیا۔ مسجد کی تاریخ تعمیر اس طرح ہے۔

جامع مسجد کشمیری (۸۰۲ھ ۱۳۹۸ء) اُس کے بعد زین العابدین بڈشاہ (۱۴۲۰-۱۴۷۰ء) نے جامع مسجد کے شمال میں ایک دینی درس گاہ قائم کی۔ جس کے لئے بعض دیہات وقف رکھے گئے۔ یہ درس گاہ میر علی بخاری کی نگرانی میں کام کرتی تھی۔ اس درس گاہ کے قیام کے علاوہ بڈشاہ نے مسجد کو وسعت دینے میں بھی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ بڈشاہ کے ایک وزیر ملک جلال الدین ٹھاکر کی اہلیہ لچھمہ خاتون نے موجودہ (قضا مسجد) سے جامع مسجد تک ایک کوہل بنوائی۔ جسے لچھمہ کوہل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لچھمہ کوہل کا پانی مسجد کے احاطے میں بنے سنگ سیاہ کے تالاب میں جمع ہو جاتا تھا جب کہ گندہ پانی نالیوں کے ذریعہ نالہ مار میں بہتا تھا۔ اس کوہل کے آثار اب موجود نہیں ہیں۔ جامع مسجد متعدد بار آگ سے شہید ہوئی ہے۔

پہلی بار بڈشاہ کے عہد میں آگ سے متاثر ہوئی۔ شری ور کے بیان کے مطابق یہ مسجد فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس کی دیواروں پر چونے سے لپائی کی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب یہ مسجد سلطان حسن شاہ کے وقت میں ۱۴۷۹ء میں پہلی بار آگ سے شہید ہوگئی تو شہر بھر میں کوئی بھی شخص خون کے آنسو روئے بغیر نہ رہ سکا۔ سارا شہر جیسے ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ سلطان حسن شاہ نے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرایا اور اس کا محراب پہلے سے زیادہ عالیشان اور جاذب نظر بنا۔ سلطان کی بہترین کوششوں کے باوجود اس کے عہد میں مسجد کی تعمیر کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔ اس نامکمل تعمیر کی تاریخ اس طرح ہے۔

مسجد اسن علیٰ التقویٰ (۸۸۵ھ-۱۴۸۰ء)

یہ ناتمام تعمیر بعد میں سلطان محمد شاہ کے عہد (۱۵۰۴-۱۵۰۳ء) میں ملک ابراہیم ماگرے کی مساعی سے مکمل ہوئی۔ یعقوب شاہ ملک کے دور حکومت میں ۱۵۸۶ء کے دوران قاضی موسیٰ (شہید) نے مسجد کی چھت کی تجدید کرائی۔ مغل شہنشاہ جہانگیر کے عہد (۱۶۲۰ء) میں مسجد پھر آگ کی نذر ہوگئی۔ پی این کے بامزئی کے مطابق آگ کی اس واردات کے وقت جہانگیر خود کشمیر میں موجود تھے اور اس نے آگ پر قابو پانے کی ہمہ گیر کوششوں میں خود بھی شرکت کی۔ جہانگیر نے مسجد کی تعمیر نو کے فوری احکامات صادر کیے۔ چنانچہ اس زمانے کے رئیس اعظم ملک حیدر چاڈورہ کی نگرانی میں مسجد کی تعمیر نو کا کام ۱۷ سال میں مکمل ہوا۔ اسی زمانے میں لچھمہ کوہل کی بھی مرمت کی گئی اور صحن میں موجود حوض بھی نئے سرے سے تعمیر کیا

گیا۔ اس موقعہ پر ارضِ کاشمر کے ممتاز خوش نویس ملا محمد مراد زریں رقم کے قلم سے قطعہ تاریخ تعمیر پتھر پر تحریر کرایا گیا اور اسے جنوبی دروازے پر نصب کرایا گیا۔

ملک حیدر رئیس الملک در عہدِ جہانگیر
نہاد از نوا ساسش بار، گاہ دید قربانی
(۱۰۲۹ھ-۱۶۰۴)

شاہجہاں کے دور (۱۶۵۸-۱۶۲۷ء) میں جامع مسجد اور اس سے منسلک درسگاہ کے ملازمین کے اخراجات کے لئے بہت سی جاگیریں وقف رکھی گئیں۔ اس دور کے ظالم صوبہ دار اعتقاد خان کو برطرف کردیا گیا اور اس کی جگہ ظفر خان خراسانی صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر اعتقاد خان اور اس کے مظالم کی منسوخی کے سلسلے میں ایک شاہی فرمان جاری کیا گیا جس کی نقل لوگوں کی آگہی کے لئے پتھر پر کندہ کر کے مسجد کے جنوبی دروازے پر نصب کرائی گئی۔

اورنگ زیب کے عہد میں جب ۱۶۷۴ء میں سری نگر کے کاوڈا رہ محلے سے سکندر پورہ تک آگ لگ گئی اُس وقت مسجد تیسری بار آگ سے شہید ہوگئی۔ جوں ہی یہ دلدوز خبر اورنگ زیب کو سنائی گئی تو انہوں نے ناظم کشمیر نواب افتخار خان کو جامع مسجد سرکاری لاگت سے ازسرِنو تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ انہوں نے یہ بھی استفسار کیا کہ کہیں مسجد کے صحن میں چنار آگ کی لپیٹ میں تو نہیں آئے ہیں...!

مسجد کی تعمیر نو کے لئے سرینگر کے سبھی کاریگروں کو کام پر لگایا گیا۔ اس دوران گرد و پیش کے بہت سے مکان ڈھا دیئے گئے، تا کہ مسجد مستقبل میں آگ کی کسی اور واردات سے محفوظ رہ سکے۔ اس زمانے میں مسجد کی تعمیر کا کام تین برسوں میں مکمل ہو گیا۔ افغان دور میں حاجی کریم داد خان (۱۷۷۶-۱۷۸۲ء) نے بھی مسجد کی مرمت کروائی۔

سکھ دور میں ناظم کشمیر موتی رام (۱۸۱۹ء) نے مسلمانوں کو یہ جان کر مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا کہ ان کے مذہبی رہنما یہاں جمع ہو کر لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اُکساتے ہیں۔ اس طرح جامع مسجد بیس برسوں تک غیر آباد رہی پھر ۱۸۴۰ء میں شیخ غلام محی الدین نے شیر سنگھ کے عہد کے دوران مسجد کے دروازے کھول دیئے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں ۱۸۸۱ء میں مسجد کے گرد و پیش سے بہت سی دکانیں ہٹا دی گئیں اور اس طرح مسجد کے باہری صحن کو وسعت دے دی گئی۔ اس دوران مسجد کی تھوڑی سی تجدید بھی کی گئی جس کے لئے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے چھ ہزار روپے پیش کئے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت ۱۹۱۲ء میں مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماع میں اس بات کا فیصلہ لیا گیا کہ جامع مسجد کی تعمیر و تجدید کے کام میں لوگوں کے ساتھ ساتھ حکومت کا اشتراک عمل بھی ہونا چاہیے۔ اس اجتماع میں اُس وقت کے مشیر مال خان بہادر شیخ مقبول حسین قدوائی بھی شامل تھے۔ مہاراجہ نے اس فیصلے کی توثیق کی اور ریاست سے باہر عطیات جمع کرنے کی بھی منظوری دی۔ مسجد کا نقشہ ازسر نو مرتب

کرنے کے لئے نواب بھوپالی نے ۱۹۱۳ء میں اپنے اسٹیٹ انجینئر خان بہادر سید جعفر حسین کو یہاں بھیجا جنہوں نے کسی معاوضے کے بغیر اپنی خدمات پیش کیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر سر جان مارشل بطور ماہر تعمیر کے بلائے گئے۔ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر آوری (Avory) اور اسٹنٹ انجینئر کرنل فریز (Pfrezier) بھی کسی معاوضے کے بغیر اپنے قیمتی مشورے پیش کرتے رہے۔ اسی دوران سرکار کی طرف سے مسجد کی تعمیر کے لئے عمارتی لکڑی وغیرہ رعایتی نرخوں پر فراہم کی گئی۔ اس دور میں جامع مسجد کی تعمیر جدید ہوئی۔ پھر اسی عہد میں ۱۹۱۷ء میں ایک حکمنامہ جاری ہوا۔ جس کے رو سے مسلمان کسانوں کو مالیہ کے ساتھ دو فیصد رقم جامع مسجد کی تعمیر کے لئے دینا پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے اسی قسم کا ایک اور حکمنامہ جاری کرایا جس کے مطابق مسلمان کاشتکار کو مالیہ کے ساتھ فی روپے دو پیسے ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس طرح جو مجموعی رقم جمع ہوئی اس سے جامع مسجد کے ارد گرد دیوار بندی کا کام کیا گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد جامع مسجد ادارہ اوقاف اسلامیہ جموں و کشمیر کی تحویل میں دی گئی۔ بخشی غلام محمد کے دور (۶۳-۱۹۵۳ء) میں اس کی بنیاد ڈالی گئی۔ مٹی کی چھت ہٹا کر اس کے بدلے ٹین پوشی کی گئی۔ جس پر ایک لاکھ روپے کی لاگت آئی۔ ۱۹۷۲ء میں میر واعظ مولانا مولوی فاروق مرحوم کی سربراہی میں اس کی پھر سے مرمت کرائی گئی۔ چنانچہ مسجد کے مشرق اور

جنوب کے اطراف میں دکانیں تعمیر کرائی گئیں۔ نیز مسجد کے صحن میں تالاب کے اردگرد کے بعض چنار کاٹ دیئے گئے تاکہ پرندوں کی بیٹ سے نمازیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچ سکے۔ جامع مسجد کشمیر میں مسلمان فن تعمیر کی ایک بہترین مثال ہے۔ بہارستان شاہی کے مطابق اس مسجد کی بھارت، ایران یا توران میں کوئی نظیر نہیں ملتی، البتہ مصر اور شام میں اس طرز کی مسجدیں ضرور ملتی ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں تراشیدہ پتھر، دیودار کی لکڑی اور بڈ شاہ اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ مسجد اگرچہ مختلف ادوار میں نئے سرے سے تعمیر ہوتی رہی اور متعدد بار اس کی تجدید کا کام ہاتھ میں لیا جاتا رہا۔ لیکن اس کے بنیادی ڈھانچے میں کبھی بھی تبدیلی یا ترمیم نہیں کی گئی ہے۔

یہ مسجد شمالاً جنوباً ۳۸۴ فٹ لمبی ہے جب کہ مشرق و مغرب کی طرف سے ۳۸۱ فٹ چوڑی ہے۔ جس میں ۲۴۵ فٹ لمبا اور ۲۳۴ فٹ چوڑا اندر والا صحن بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ کشمیر کی اولین قلعہ بند طرز کی مسجد ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس مسجد میں بیک وقت ۳۳۳۳۳ افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کے فرش پر محرابی طرز کی اینٹیں بچھائی ہوئی ہیں۔ اس کی دیواریں چار فٹ موٹی اور ۲۰ فٹ اونچی ہیں۔ جنوب مشرق و شمال کے اطراف میں مسجد کے تین بڑے دروازے ہیں۔ دروازوں کے اوپر ۵۰ فٹ اونچے ایوان ہیں جن پر اہرامی انداز کے (چوکور) کلس بنائے گئے ہیں۔ چوتھا اور سب سے بڑا کلس قبلے کی طرف منبر کی سیدھ میں ہے جس پر چڑھنے کے لئے اندر سے دو سیڑھیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ دروازے کے عین سامنے تینوں

کلس ۵۰ فٹ اونچے اور گھیرے میں ۷ فٹ کے ۸ دیودار کے ستونوں پر ٹکے ہوئے ہیں۔ لیکن قبلے کی طرف کے ۸ ستون ۶۴ فٹ اونچے، جن کے گھیرے ۷ فٹ ہیں۔ منبر کی دائیں جانب قبلے کی طرف میر واعظ یا امام کے داخل ہونے کے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ مسجد کے ستونوں کی مجموعی تعداد ۳۷۸ ہے۔ ہر ستون ۳۵ فٹ سے ۵۰ فٹ اونچا اور ۷ فٹ گھیرے کا ہے۔ ہر ستون تراشیدہ پتھر کی کرشی پر کھڑا کیا گیا ہے۔ منبر کے دائیں اور بائیں اطراف میں سنگ سیاہ پر سورہ جمعہ اور اسمائے حسنیٰ کندہ ہین۔ مسجد کے اندرونی صحن میں دو قبرستان ہیں قبلے کی طرف سے قبرستان میں بابا نصیب الدین غازی کا ایک خلیفہ حسن تیلی دفن ہے جب کہ مسجد کی دائیں جانب ایک مزار تھا۔ جس کے بعض پتھر بعد میں مسجد کی دیوار کی تعمیر میں استعمال کئے گئے۔

جامع مسجد کشمیر تحریک آزادی کا ایک اہم مرکز رہی ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء میں جن کشمیریوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اُن کے لاشیں دن بھر کے لئے اسی مسجد میں رکھی گئی تھیں۔

حضرت بل

کشمیر دنیا میں ایک خوب صورت مقام ہے قدرت نے اس وادی کو اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور ان ہی نعمتوں میں سب سے زیادہ موئے شریف آنحضورؐ کا یہاں پر ہونا ہے۔ موئے شریف جہاں پر مقیم ہے اس جگہ کا نام حضرت بل ہے۔ جوڈل کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ موئے شریف کی اپنی ایک خصوصی پہچان ہے۔ پرانی مسجد جہاں پر موئے شریف مقیم ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی ہے جس وقت پورے ہندوستان میں شاہجہاں کی حکمرانی تھی شاہ جہاں کے گورنر صادق خان نے اس کو تعمیر کیا۔ یہاں پر اس نے ایک خوب صورت باغ لگوایا۔ اور ایک خوب صورت محل ۱۶۲۳ء میں بنوایا جس کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کی فن تعمیر مغل اور کشمیری طرز پر تھی۔ جس جگہ موئے شریف مقیم ہے اس جگہ کو آثار شریف کے نام سے یاد کیا گیا۔ اور بعد میں اس کو حضرت بل کا نام دیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں زیارتوں، خانقاہوں اور مسجدوں کی دیکھ بال کیلئے اوقاف ٹرسٹ وجود میں آیا۔ جس کی بنیاد مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے ڈالی حضرت بل بھی اس کی تحویل میں آیا۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں یہاں زیارت کے لئے آتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں۔ جس وقت کشمیر میں آبادی روز بروز بڑھنے لگی۔ تو جگہ کی تنگی کے باعث لوگوں کو زیارت دیکھنے کے لئے مشکلات کا

سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان مشکلات کا ازالہ کرنے کے لئے اوقاف ٹرسٹ نے فیصلہ کیا کہ وہ نزدیک کے رہائشی مکانات کو ہٹانے کے لئے اقدام کرے۔ تاکہ وہ زمین بھی آستان کے ساتھ ملا دی جائے اور اردگرد کے صحن کو بھی وسعت دی جائے تاکہ نیا آستان لوگوں کی سہولیت کے لئے تعمیر کیا جائے آخر ۱۹۷۸ء میں نئے آستان کی تعمیر کا کام شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں شروع ہوا اس کو مکمل ہونے میں تقریباً ۱۰ سال کا عرصہ لگ گیا۔ نئے آستان کا ڈیزائن مدینہ شریف سے ملتا ہے۔ لہٰذا اس کو مدینہ ثانی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

نیا آستان Dome Shapped ہے اس میں بڑے مینار لگے ہیں جو سنگ مرمر کے بنے ہیں اندر آستان میں خوب صورت (جار) فانوس لگے ہیں جن کو چیکوسلواکیہ سے برآمد کیا گیا ہے۔ آستان بنانے کا سارا خرچہ کشمیریوں نے خود ہی برداشت۔ آخر جون ۱۹۷۸ء میں موئے شریف کو نئے آستان میں منتقل کیا گیا۔ پرانا آستان جس کو شاہجہاں کے وقت میں بنایا گیا۔ منہدم کر کے وہاں پر حمام بنایا گیا اس نئے آستان کو دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ ہندوستان اور بیرونی دنیا سے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

مقدس موئے شریف کو ۲۹ دسمبر ۱۹۶۳ء اپنی جگہ سے نامعلوم افراد نے اُٹھالیا۔ جونہی یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی تو لوگ جوق در جوق حضرت بل پہنچے۔ اور اپنی ناراضگی اور غصے کا اظہار کیا۔ آناً فاناً سارا کشمیر ایک ماتم کدہ بن گیا۔ سارے سرینگر میں دکان اور کاروباری ادارے بند ہوئے۔

شہر میں کوئی بھی شخص خون کے آنسو روئے اور گریہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔آخر کار انتھک کوششوں سے موئے شریف ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو باز یاب ہوا۔ کشمیریوں میں پھر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔مقدس موئے شریف کی کشمیر میں آمد کیسے ممکن ہوئی سید عبداللہ جو روضہ مطہرہ مدینہ منورہ کے متولی تھے کو گورنر مدینہ نے ان کو حکم عدولی کے لئے مدینہ منورہ سے جلاوطن کردیا۔سید عبداللہ نے مدینہ منورہ کو الوداع کرتے وقت تین متبرک تحفے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گیسوئے مبارک کا ایک موئے مبارک، دستار شریف اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہٗ کے گھوڑے (دُلدل) کا زین ساتھ اٹھائے اور ۱۶۳۴ء میں ہندوستان کا سفر کیا شاہجہاں (۱۶۵۸-۱۶۲۷ء) کے دوران اس وقت ہندوستان کا بادشاہ تھا۔انہوں نے سید عبداللہ کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور آپ کو بیجاپور جنوبی ہندوستان میں جاگیر عطا کی۔کچھ مدت گزرنے پر سید عبداللہ نے دنیا سے رخصت لی۔آپ یہاں ۲۳ سال رہے اس اثنا میں ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے سید عبداللہ کے بیٹے سید حامد کی دارا شکوہ کی طرفداری کے الزام میں جاگیر ضبط کی۔

جاگیر کی واگزاری کے لئے سید حامد کو شاہجہاں آباد دہلی جانا پڑا۔ چونکہ دہلی میں ان کی آمدنی بہت قلیل تھی اس لئے گزارہ کے لئے نہایت عاجز ہوگئے اور کشمیر کے ایک بڑے تاجر نورالدین آشاوری سے جن کی کوٹھی اردو بازار میں تھی سے اخراجات کے لئے ایک بھاری رقم ادھار لی لیکن سید حامد کو قرض ادا کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اور مجبوری کی حالت میں

انہوں نے موئے مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواجہ نورالدین کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ خواجہ نورالدین نے اس کو اپنی سعادت مندی سمجھا اور قرض سے دست برداری دے کر موئے مبارک حاصل کیا۔ خواجہ نورالدین سفر کا سامان باندھ کر کشمیر کی طرف روانہ ہوا جاسوسوں نے اورنگ زیب کو واقعہ کی خبر دی اس وقت نورالدین لاہور پہنچا تھا اورنگ زیب کے حکم سے گرفتار ہوا۔ موئے شریف اور خواجہ نورالدین کا غلام۔ میدانش بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے بادشاہ نے موئے مبارک کی زیارت کر کے حکم دیا۔ کہ موئے شریف ؐ کو خواجہ معین الدین چستی کی خانقاہ میں رکھا جائے۔ لیکن ابھی موئے شریف ؐ کو نو دن ہی گذرے تھے کہ بادشاہ نے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ ؐ نے بادشاہ کو فرمایا۔ میرے موئے شریف ؐ جو اجمیر شریف میں رکھا گیا ہے کو فوراً کشمیر روانہ کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔ بادشاہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور موئے شریف اور غلام میدانش کو انعام واکرام کے ساتھ روانہ کیا۔ لاہور پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ خواجہ نورالدین جاں بحق ہو گئے میدانش خواجہ نورالدین کی لاش ساتھ اٹھا کر کشمیر کی طرف آگے بڑھا۔ لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے آپ شوپیان پہنچ گئے فاضل خان اس وقت کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے سرینگر کے علماء اور عزت دار آدمیوں کی میٹنگ بلائی۔ اور فیصلہ کے تحت شیخ محمد چستی رادھو عشائیؒ موئے شریف کے استقبال کے لئے ہیرہ پورہ روانہ ہوئے ان کے ساتھ متعدد عالم وفاضل بھی تھے۔

حضرت شیخ محمد چستیؒ ننگے پاؤں بھمبھر تک پیشوائی کرنے کو پہنچے۔ وہاں سے موئے مبارکؐ کے صندوق کو سر پر رکھ کر سرینگر ۱۶۹۹ء میں پہنچے وہاں پہلے باغ یوسف جو آج قاضی مسجد نزدیک ڈل حسن یار حبہ کدل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جہاں آپ سکونت پذیر تھے میں موئے شریفؐ کی زیارت لوگوں کو کرائی وہاں پر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ موئے شریف کو خواجہ معین الدین نقشبندیؒ (نقشبندی صاحب) کے روضہ میں رکھا۔ ہجوم کی کثرت سے کئی آدمی جان بحق ہو گئے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر شہر کے امیروں، عالموں نے فاضل خان صوبیدار کشمیر سے مشورہ کر کے باغ صادق خان جہاں موجودہ آثار شریف کی ایک خوب صورت مسجد جو شاہ جہاں کے وقت میں بنی تھی جو ڈل کے مغربی کنارے پر واقع ہے کو بہترین مقام جان کر موئے مبارک کو وہیں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ محمد چستیؒ نے ۱۶ سال تک موئے شریف کی نشاندہی کی آخر آپ ۱۷۱۵ء میں وفات پا گئے۔ اور آپ کو اپنے گھر کے پاس چستیہ کوچہ سونہ مسجد میں سپرد خاک کیا گیا۔ شیخ محمد چستیؒ اپنے وقت کے ولی کامل اور بہت بڑے عالم تھے۔ شیخ محمد چستیؒ کے انتقال کے بعد موئے شریف کی نشاندہی کرانے کی جُرات کسی کو نہ ہوئی نہ ان کے فرزندوں کو اسی اثناء میں شہر کے رئیسوں، عالموں اور معزز شہریوں نے نشاندہی کرنے اور زیارت کرانے کا حقدار خواجہ نور الدین آشاوری کے داماد خواجہ بلاقی بانڈے کو سمجھا اور یہ مبارک کام ان کے سپرد کیا۔ کیونکہ خواجہ نور الدین کا اپنا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس زمانے سے اب تک خواجہ بلاقی بانڈے خاندان کے وارث اس درگاہ کے متولی ہیں اور اپنی اپنی باری پر زیارت دکھاتے ہیں۔

عالی مسجد

عالی مسجد سرینگر شہر میں عید گاہ کے شمال مشرق کی جانب گوشے میں واقع ہے۔ سلطان سکندر (۱۳۸۹-۱۴۱۳ء) تک کے عہد میں سیّد میر محمد ہمدانیؒ نے عید گاہ کے لئے یہ قطعہ زمین خرید لیا اور سلطان کے بیٹے علی شاہ (۱۴۱۳-۱۴۲۰ء) نے اس جگہ پر ایک مضبوط اور محراب والی مسجد تعمیر کروائی۔ جس کا نام عالی مسجد رکھا گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے نائب صوبیدار اسلام خان نے اسے ۱۶۶۴ء میں وُسعت دی اور مضبوطی کے لئے اس کے اندر اور باہر دیوار کے ستون کھڑے کروائے۔ اس کا بیرونی احاطہ جھاڑیوں وغیرہ سے صاف کروایا اور یہاں چنار کے درخت لگوائے۔ یہ مسجد عبداللہ خان (پٹھان گورنر) کے دورِ حکومت ۱۸۰۰ء میں آگ لگنے کے بعد پوری طرح شہید کردی گئی اور پھر پٹھان سردار گُل محمد خان ۱۸۰۱ء نے اسے نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس کے چھت کی مرمت کرنے کی تجویز پیش کی تھی جو ناکام ہوگئی۔

عالی مسجد کی لمبائی ۱۸۱ فٹ اور چوڑائی ۷۵ فٹ ہے۔ مشرق کی طرف اس کے چار دروازے ہیں۔ ہر دروازہ ۱۲ فٹ اونچا اور ۲۰ فٹ چوڑا ہے۔ مسجد میں دیودار کے ۱۴۸ ستون لگے ہیں۔ ہر ستون ۱۸ فٹ اونچا اور اڑھائی

قبلے کی جانب نو بڑی کھڑکیاں ہیں جو مضبوط کرسی پر اُٹھائے گئے ہیں۔ قبلے کی جانب نو بڑی فٹ موٹا ہے جو مضبوط کرسی پر اُٹھائے گئے ہیں۔ قبلے کی جانب نو بڑی

فٹ موٹا ہے جو مضبوط کرسی پر اُٹھائے گئے ہیں۔ قبلے کی جانب نو بڑی
کھڑکیاں ہیں جو ۸ فٹ اونچی اور ۵ فٹ چوڑی ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر
روشن دان ہیں، جن کی لمبائی ۵ فٹ اور چوڑائی ۳ فٹ ہے قبلے کی جانب ہی
باہری طرف ۱۶ فٹ اونچا اور ساڑھے ۱۳ فٹ چوڑا محراب ہے۔ مسجد کے
شمال اور جنوب میں پانچ پانچ کھڑکیاں ہیں۔ مسجد کی دیواریں ساڑھے
۴ فٹ چوڑی ہیں۔ قبلے کی جانب ۱۰ فٹ اونچا اور ۶ فٹ چوڑا منبر ہے۔
جس میں سات زینے ہیں اس کے ساتھ ہی محراب بھی ہے جو ۹ فٹ اونچا
اور ساڑھے چار فٹ چوڑا ہے۔ محراب کے بالکل اوپر سنگِ سیاہ پر کلمۂ طیبہ
کنندہ کیا ہوا ہے۔ جنوب کی جانب مسجد کے باہری حصّے میں پتھر کا بنا ہوا
۱۸ فٹ چوڑا صُفہ ہے جس کے دونوں طرف ۱۸ فٹ لمبے اور اڑھائی فٹ
موٹے دیودار کے چار ستون ہیں۔ ۱۹۳۵ء تک عالی مسجد کی چھت بھوج پتر
کی بنی ہوئی تھی۔ اب اس کی ٹین پوشی کی گئی ہے۔ یہ چھت چار بام طرز پر بنا
گنبد نما ہے۔ کہتے ہیں کہ میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ صاحب یہاں
عیدین پر وعظ خوانی کیا کرتے تھے مقدّس ایام میں مرحوم مولانا محمد فاروق
عید کی نماز سے پہلے وعظ پڑھا کرتے تھے اور اب مولوی عمر صاحب یہ کام
سرانجام دیتے ہیں۔

سید محمد مدنیؒ

آپ کا اسمِ مبارک سید محمد مدنیؒ تھا۔ مگر کشمیر میں آپ مدین صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت سید محمد مدنیؒ (مدین صاحب) کچھ دیر کے لئے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے اس وجہ سے مدنی کہلائے۔ مکہ معظّمہ میں بھی کچھ دیر حاضری دی۔ پھر سیر وسیاحت کا خیال آیا۔ اور مختلف ملکوں کی سیر کی اور شاہ حبشہ (Ethopia) کی صاحبزادی سے شادی کی۔ مخدوم سید جلال الدینؒ سے بھی روحانی فیض حاصل کیا۔ اور اکثر اسلامی ممالک کی سیر کی۔ آخر امیر تیمور کے دربار میں حاضری دی۔ امیر آپ سے روحانی فیض حاصل کرتا اور آپ کی بڑی عزت کرتا تھا۔

سرینگر سے تقریباً ۸ کلو میٹر کے فاصلے پر جڈی بل سے صورہ تک بہت سارے آثار قدیمہ کے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ جن میں خاص طور پر سید محمد مدنیؒ (مدین صاحب) کا مقبرہ اور ایک مسجد ہیں۔ یہ آثار قدیمہ حول اور بوٹہ کدل کے درمیان واقع ہیں یہ عمارتیں مغل دور سے پہلے سلاطین کشمیر کے وقت میں ۱۴۶۶ء میں زین العابدین بڈشاہ کے وقت میں تعمیر ہوئی ہیں۔ تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور دریائے سندھ کے کنارے اپنا ڈیرہ ڈال دیا۔ اور ہندوستان کے بہت سارے راجوں اور بادشاہوں

نے اس کو خیر سگالی اور صلح کے پیغامات بھیجے۔ امیر تیمور نے سید محمد مدنیؒ کو سلطان سکندر کے پاس اپنا ایلچی بنا کر بھیجا جو کہ اس وقت کشمیر کا بادشاہ تھا۔ سکندر نے ان کو بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کچھ دن ٹھہرنے کے بعد سکندر نے آپ کو تحائف دے کر واپس روانہ کیا۔ اور اپنی طرف سے نورالدین بدخشی کو خیر سگالی کے جذبہ کا پیغام لے کر بھی ساتھ دیا سکندر نے وعدہ کیا کہ وہ خود تیمور کے پاس حاضر ہو جائے گا۔ یہاں آ کر سید محمد مدنیؒ کو کشمیر بہت پسند آیا یہاں کے خوب صورت پہاڑ، دریا، نالے۔ آپ نے تیمور سے اجازت لی کہ وہ مستقل طور پر کشمیر میں ہی سکونت پذیر ہوگا۔ اس کے بعد آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ آئے اور سرینگر میں محلّہ رعناواری جوگی لنگر میں رہنے لگے۔

سلطان سکندر اور علی شاہ کی وفات کے بعد بڈشاہ ۱۴۲۰ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھا وہ ایک عظیم بادشاہ تھا۔ خود سنسکرت، فارسی، تبّتی کا عالم تھا۔ اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔ آپ کے دربار میں بڑے بڑے عالم ہوا کرتے تھے۔ جن میں خاص طور پر۔ تاریخ دان جون راجا، سری ور، سوم پنڈت، ملک، شعرا، ملا احمد، مولانا نادری، مولانا کبیر اور ملا جمال الدین تھے۔ بڈشاہ ان عالموں کی بڑی قدر دانی کرتا تھا۔ اور ان کے لئے الگ الگ رہائشی مکانات بھی تعمیر کراتا تھا بڈشاہ سید مدنیؒ سے بڑا متاثر تھا اور آپ کے روحانی کمالات سے بھی واقف تھا۔ بادشاہ نے آپ سے گزارش کی کہ آپ نوشہرہ شاہی محلات کے نزدیک ہی رہائش اختیار کریں۔ سید مدنیؒ نے بادشاہ کی یہ پیشکش قبول فرمائی۔ اور آپ رعناواری سے مستقل طور پر نوشہرہ (موجودہ

حول اور بٹہ کدل کے درمیان) سکونت پزیر ہوئے۔ کشمیر کی آب وہوا سید کی روحانی طبیعت کو بہت ہی مرعوب خاطر ہوئی۔ اور آپ کے وقت میں لوگ جوق در جوق دین اسلام میں شامل ہو گئے۔ بڑے بڑے علماء اور بزرگان دین کی قدر شناسی ہوتی تھی۔ کشمیر میں سید محمد اصفہانی، قاضی حسین شیرازی، سید محمد خاور، حضرت شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ سے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ سلطان بڈشاہ نے آپ کے لئے ایک خانقاہ اور ایک لنگر خانہ بھی تعمیر کئے۔

درس وتدریس کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ جہاں سید مدنیؒ کے علاوہ مُلا عبدالکبیر، قاضی حسین شیرازی درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مدرسہ اور خانقاہ کے اخراجات کے لئے چند دیہات کی آمدنی مقرر کی گئی یہ خانقاہ کشمیر میں اب بھی موجود ہے۔ اس کی تعمیر ۱۴۴۴ء میں ہوئی تھی۔ مسجد میں بڑے بڑے پتھر استعمال کئے گئے ہیں۔ تاحال مسجد خستہ حالت میں تھی۔ لیکن سرکار نے اس کی مرمت کی ہے۔

مسجد کو دیکھ کر سلاطین کشمیر کی فن تعمیر سے دلچسپی کی داد دینی پڑتی ہے۔ مغلوں کی طرح سلاطین کشمیر بھی زبردست معمار تھے۔ پتھروں کا ملاپ اور عمارت کی لاثانی نوعیت کا طریقہ کاریگروں کی اعلیٰ قابلیت کا نمونہ ہے۔ خاص کر زین العابدین بڈشاہ کے وقت میں کشمیر میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ ان کی وفات کو تقریباً چھ سو سال ہو گئے۔ لیکن آج بھی کشمیری لوگ ان کو عزت اور پیار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے کشمیر سے مختلف ملکوں میں خیر سگالی جذبے کے تحت سفیر روانہ کئے ان ملکوں میں خراسان، ترکستان،

مصر اور دہلی قابل ذکر ہیں۔آپ نے کشمیر کی صنعت وحرفت پر کافی توجہ دی اور باہر کے ملکوں خاص کر سمرقند سے یہاں قابل کاریگر اور صنعت کار بلائے۔

مسجد کی مشرقی دیوار کے ایک پتھر پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الا الہٗ الا لئہٗ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہے۔دوسرے پتھر پر یہ فقرے پائے جاتے ہیں۔بنی ہذا المسجد، الفقیر اور محمد المدنی۔ بڈشاہ اکثر سید مدنی کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرتا تھا۔حضرت مدنی کی اہلیہ حاجرہ خاتون محلّہ رعناواری میں سکونت پذیر تھی مرنے کے بعد اپنے مکان کے صحن میں ہی مدفون ہوئیں۔سید مدنی بڈشاہؒ کے عہد حکومت میں انتقال کر گئے اور اپنی عظیم الشان خانقاہ (مدین صاحب حول) کے نزدیک سپرد خاک کئے گئے۔آپ کے جنازے میں سلطنت کے اراکین وزراء اور خود سلطان زین العابدین شامل تھے۔نماز جنازہ کی امامت خود سلطان نے انجام دی تھی۔نماز جنازہ میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں شامل تھے۔ وفات کے بعد اُن کے روضہ پر عام مسلمان ہر جمعرات اور پیر کے دن آتے تھے۔اور خانقاہ مدنی میں نماز ادا کر کے ان کے روضہ پر فاتحہ خوانی بجالاتے تھے۔

علی مردان خان جو شاہجہاں کے وقت میں کشمیر کا گورنر تھا نے روضہ شریف اور مسجد مدنی کی مرمت کرائی۔ کہتے ہیں کہ اس روضہ پر اکبر اعظم جہانگیر اور شاہجہاں بھی حاضری دیا کرتے تھے اور شاہجہاں کے حکم سے اس روضہ کی مرمت علی مردان خان نے کروائی تھی علی مردان خان نے مدین

صاحب کے متصل ہی بڈشاہ کے تعمیر کردہ باغ حیدر میں اپنے رہنے کے لئے ایک عظیم حویلی بنوائی تھی۔ جس کے کھنڈرات اب بھی باغ میں نظر آتے ہیں۔ آج کل اس باغ میں محکمہ صنعت وحرفت کی مختلف فیکٹریاں قائم کی گئی ہیں اور گورنمنٹ ہائی سکول جڑی بل بھی اس باغ کے احاطے میں واقع ہے۔ اس باغ کے بارے میں بیان ہے کہ باغ میں جابجا فوارے آبشاریں، نہریں اور حمام کے علاوہ عالی شان عمارتیں قائم تھیں۔ جہاں مغل بادشاہ، امراء اور حکماء رہتے تھے۔ علی مردان کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم خان گورنر کشمیر مقرر رہوا۔ اس نے بھی روضہ اور خانقاہ کی مرمت کرائی تھی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت میں ۱۸۸۵-۱۸۵۷ء کے دوران بدقسمتی سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں ۱۸۷۲ء میں ایک زبردست ہنگامہ اس خانقاہ کے بارے میں ہوا۔ دونوں مسلکوں کے لوگوں کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ بہت سارے لوگوں کو قیدی بنایا گیا اور ان سے بھاری جرمانہ وصول کیا گیا۔ کچھ کو قلعہ ہاری پربت اور اوڑی کے جیلوں میں بند کردیا گیا۔ حکومت نے روضہ اور خانقاہ مدنی پر تالا چڑھا کر دونوں مسلک کے پیر وکاروں کو یہاں آنے سے روک دیا یہاں ہر قسم کے اجتماعات منسوخ قرار دیئے گئے۔ نہ وہ محفلیں رہیں نہ وہ وعظ خوانی سنی گئی۔ نہ وہ درود ازکار کا دور دیکھا گیا۔ تاحال روضہ اور خانقاہ خراب حالت میں ہیں۔

اس روضہ اور خانقاہ کے نام پر جو زمین تھی لوگوں نے ناجائز طریقے سے اس پر قبضہ کیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں کشمیریوں نے اس کو واگزار کرنے کی

کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے لیکن کچھ سال پہلے خانقاہ کو کھول دیا گیا تھا لیکن اس وقت بھی خانقاہ پر تالا چڑھا ہوا ہے مسجد مدنی تا حال مغل دور سے پہلے کشمیر طرز کی شاندار عمارت ہے۔اور اس وقت خستہ حالت میں ہے۔

خانقاہ مدنی میں ایک مسجد ہے اور اس کے دوسری طرف روضہ شریف حضرت سید محمد مدنیؒ کا ہے۔ مسجد مربع شکل کی ہے اور اس کی چار دیواریں اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ مسجد کی چھت Pyron idel ہے مسجد میں اندر جانے کے لئے لکڑی کا دروازہ ہے۔ مسجد کے اندر ختم بند نقاشی استعمال کی گئی ہے اور یہاں پر چار ستون لگے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں پر دیواری تصاویر کے اعلیٰ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ مسجد کے ایک محراب پر تیر کمان لئے اجداہا کی بنائی گئی تصویر نظر آتی ہے۔

روضہ شریف مسجد کے شمال میں واقع ہے اس کے دیواروں پر خوب صورت رنگین ٹائیں نظر آئی ہیں۔ جو اس پورے علاقے میں کہیں اور نظر نہیں آتی البتہ سمرقند کی عمارت میں اس زمانہ میں استعمال ہوتی تھیں۔ بہت ساری رنگین ٹائیں غائب ہوگئی ہیں۔ کچھ اس وقت سرینگر کے میوزیم عجائب گھر میں موجود ہیں۔

اور امغسلینڈ پھولوں کی تحسیدانویں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے بڈشاہ کے عہد میں بنی اس مسجد کی مرمت کا کام ہاتھ میں لیا۔اس کی چھت کی سرینگر میں اب یہ واحد تاریخی عمارت ہے جس پر بزرہ چھت لگی ہے۔ خانقاہ اور روضہ کی رکھوالی کے لئے ایک چوکیدار کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا۔

مرزا اکمل الدین کامل بیگ خان بدخشیؒ

آپ کشمیر کے مایہ ناز سپوت ہیں۔ وادی کشمیر کے ایک ممتاز عالم، شاعر اور ولی ہیں۔ آپ سلطان خواجہ احمد یسوی کی اولاد میں سے تھے آپ کا مشہور نام مرزا اکمل بیگ بدخشیؒ ہے۔ آپ کے آباد واجداد تاشقند (وسط ایشیا) سے آکر بدخشاں میں قیام پذیر ہوئے۔ اور اس وجہ سے ان کو بدخشی کہتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آکر شاہی ملازموں میں شامل ہوئے۔ آپ کے جد بزرگوار ملک محمد بیگ خان شاہجہان کے وقت میں (۱۶۵۸-۱۶۲۷ء) کشمیر کے میر مفتی مقرر ہوئے۔ ان کے فرزند ملک عادل خان کشمیر میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے۔

مرزا عادل خان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرزندار جمند عطا ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے تخت پر شہاب الدین شاہ جہاں براجمان تھا۔ مرزا عادل کو بادشاہ کے ساتھ خاص رسائی تھی اور ان کے فرزند بھی نہایت معصومیت میں شاہجہاں کے دربار میں پہنچے۔ شاہجہاں فارسی زبان کا ادیب تھا۔ اس کے علاوہ علماء اور فضلاء کا بڑا دلدادہ قدردان تھا۔ اس نے بچے کا نام کامل رکھا اور آگے چل کر کامل سے اکمل نام پایا۔ اور یہی بچہ مرزا اکمل الدینؒ بن گیا۔ اپنے نام اور نسب کے بارے میں مجز الاسرار میں خود فرماتے

ہیں۔

کامل ام شاہجہاں نام نہادہ آنروز

کا اندریں دارفنا کرد خدا میلادم

اکمل الدین لقیم کرد ز احسان مرشد

زانکہ لبِ یار خاک درِ او افتادہ ام

میری ولادت کے دنوں میں شاہجہاں نے میرا نام "کامل" رکھا اور اکمل الدین میر القب ہے۔ یہ ایک عطائی نام ہے جو مجھے اپنے مرشد کامل نے عنایت فرمایا۔ اس کی وجہ ہے کہ میں اکثر زمانہ میں ان کی صحبت بابرکت سے فیضیاب ہوتا رہا۔ نسب کے بارے میں آپ خود فرماتے ہیں کہ آپ حضرت شیخ احمد یسوی کے اولاد سے ہیں آپ خود فرماتے ہیں۔

اصل جدم بود یہ ترکستان

خواجہ احمد جدِ، جدمن داں

مرزا کاملؒ بچپن میں خواجہ حبیب اللہ عطار گائیؒ کے منظور نظر ہو گئے۔ بارہ برس کی عمر میں مرزا کاملؒ خواجہ سے تربیت حاصل کرنے لگے اور عبادت و ریاضت میں لگ گئے شاہی ملازمت چھوڑ دی اور فقیرانہ زندگی بسر کی ۲۵ برس کی عمر میں مرشد سے خلافت کا خلعت پایا۔ حقیقت اور معرفت کے سوت جاری ہوئے۔ آپ بچپن سے ہی آنحضورؐ کی سنت کی پیروی سختی سے کرتے تھے۔ آپ نے کم عمری میں ہی مروجہ ظاہری علوم میں مہارت حاصل کی جن میں تفسیر وحدیث وفقہ وغیرہ علوم شامل ہیں۔ آپ نے حضرت خواجہ حبیب

اللہ عطار گائیؒ کی خدمت گذاری کی اور ان کے باطنی فیوض سے مستفید ہو گئے۔

مرزا کاملؒ صاحب ایک طرف بلند پایہ صوفی بزرگ تھے دوسری طرف وہ اپنے زمانہ میں ممتاز ادیب اور شاعر تھے۔ آپ نے مسلمانان کشمیر کی رہنمائی کی۔ اس کے علاوہ آپ اپنے زمانے کے معروف خطاط بھی تھے۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اورادفتحیہ کا قلمی نسخہ۔ ابھی بھی اس وقت موجود ہے۔ آپ نے مرشد کامل خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کی وفات کے بعد کسی صوفی یا بزرگ کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کی تربیت نہایت پختہ، مضبوط اور تسلی بخش طریقے سے کی گئی تھی۔ اس سے خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کی عظمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

حضرت مرزاؒ ہر لحاظ سے شریعت کے پابند تھے۔ آپ کو کشمیر میں جنید ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحبؒ کو خدا تعالیٰ نے اپنی بے شمار عنایات سے نوازا تھا۔ بچپن میں ہی علوم فنون کا حصول زندگی کے ابتدائی ایام میں رہا۔ حضرت شیخ جمال الدین کو غائبانہ طور پر حکم ہوا کہ آپ بذات خود تشریف لے جاکر مرزا صاحبؒ کی تربیت کریں۔ مرزا صاحبؒ نے بہت ساری کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں خاص طور پر بحرالعرخان ہے۔ یہ ان کی شاندار تصنیف ہے جو ۸۰۰۰۰ بیات پر فارسی زبان میں ایک ادبی شاہکار ہے۔ مرزا صاحبؒ نے یہ کتاب حضرت جلال الدین رومیؒ کی شہرہ آفاق مثنوی کے طرز پر لکھی ہے۔ بحرالعرفان کے علاوہ آپ نے کئی اولیاء اللہ کی تعریف میں قصائد و مناقب لکھے ہیں اور کئی غزلیات بھی تحریر کی ہے آپ

نے ایک اور رسالہ مجز الاسرار کی تصنیف کیا ہے۔ یہ ۱۲۸۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ قناعت اور توکل میں گذارا صبح سے لے کر شام تک بلکہ رات کے کچھ حصے تک درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ آپ کا مدرسہ بھی برکت سے خالی نہ تھا۔ آپ کے وقت کشمیر میں کافی تعداد میں بزرگان دین موجود تھے۔ جن میں خاصی طور پر شیخ مراد نقشبندیؒ، خواجہ عبداللہ بخاریؒ اور شیخ محمد چشتی رادھو عشائیؒ قابل ذکر ہیں۔

آپ کے وقت میں موئے شریف آنحضورؐ کشمیر میں وارد ہوا۔ اس وقت موئے شریفؐ کی نشاندہی شیخ محمد چشتی رادھوؒ نے کی۔ اور آپ بڑی جماعت لے کر موئے شریفؐ کے استقبال کے لئے ہیرہ پور گئے اور ننگے پاؤں موئے مبارکؐ کے صندوق کو سر پر رکھ کر سرینگر روانہ ہوئے۔ آپ کے شاگرد اور خلیفہ لاتعداد تھے۔ جن میں خاص طور پر حاجی عبدالسلامؒ قلندر، حضرت فاروق صاحب، حضرت محمد اعظم سوکال پوری قابل ذکر ہیں۔

مرزا صاحبؒ ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۱۸ء میں آپ نے یعنی ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۳۱ ہجری انتقال فرمایا۔ آپ کا روضہ سرینگر میں علمگری بازار اور حول کے درمیان سڑک کے کنارے واقع ہے۔ آپ کی مناسبت سے اس پورے علاقے کو مرزا کاملؒ صاحب کہا جاتا ہے۔ روضہ شریف کے احاطے میں شاہ نعمت اللہ کلو، خواجہ قائم الدین پتلو اور شہزادہ خانم بھی سپرد خاک کئے گئے ہیں۔ آپ کا آستانہ عالیہ خواجہ قائم الدین پتلو نے ۱۷۲۰ء میں تعمیر کروایا۔ اس کے شمال کی جانب ایک مسجد بھی بنوائی۔ روضہ شریف کی لمبائی

۵۷فٹ اور چوڑائی ۲۷فٹ ہے۔ جس میں جنوب کی جانب نور خانہ ہے۔ جس میں شیشے لگے ہیں اندرونی چھت میں ختم بند لگا ہوا ہے۔ آپ کی تاریخ وفات خواجہ اعظم دیدمری نے تحریر کی۔ آپ کی تاریخ وفات پر وقت کے کئی بزرگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں چند یہ ہیں۔

دریغا پیر کامل بحر عرفان
طراوت بخش بزم اہلِ ایقان
گزشت از ماہ حج چوں بُست نہ روز
بہ یک شنبہ شداد فردوس افروز
بسوئے گلشن جنت روان شد
زہجرش چشم جان گوہر فشان شد
بمژ گان گوہر تاریخ سفتم
ز عالم پیر کامل رفت گفتم
۱۱۳۱ھ (از خواجہ اعظم دیدمریؒ)

آپ کی تربت مبارک پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

ایں کامل اکمل مقدس
تاریخ تو خاتم کمل بس

شیخ یعقوب صرفیؒ

حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ نہ صرف کشمیر کے ایک بلند پایہ روحانی پیشوا تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر، عالم اور سیاستدان بھی تھے۔ آپ کا نام شیخ یعقوبؒ اور صرفی تخلص تھا۔ باپ کا نام میر حسن تھا جو ذات کے گنائی تھے۔ گنائی کشمیر میں لکھنے والے کو کہتے ہیں۔ کشمیر کے بیشتر نامور علماء اور مفتیان کرام اسی قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ یہاں گنائی کو دانا کہتے ہیں۔ صرفیؒ صاحب ۱۵۲۱ء ۹۲۸ھ میں سرینگر میں تولد ہوئے سات برس کی عمر میں درسِ قرآن پاک سے فراغت حاصل کی۔ حضرت صرفیؒ نے شعر گوئی کا آغاز سات آٹھ سال کی عمر میں کیا۔ ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد ازاں ملا آنی سے درس وتدریس حاصل کیا۔ ملا آنی عبدالرحمان جامی کے شاگردوں میں سے تھے۔ صرفی نے ان سے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مولانا آنی نے حضرت صرفی کو جامی ثانی کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ عبدالوہاب نوری کے بقول شیخ یعقوبؒ کا تخلص صرفی بھی مولانا آنی کا ہی تجویز کردہ ہے۔ صرفیؒ نے اپنی تعلیم مولانا رضی الدین اور مولانا مفتی فیروز گنائی کے درسگاہوں میں حاصل کی۔ فیروز گنائی اپنے وقت کے چوٹی کے عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کو روحانیت پر بھی کافی عبور حاصل

تھا۔ آپ نے اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کا اپنا نام روشن ہو چکا تھا۔ جب آپ بیس اکیس برس کے تھے تو باطنی طور پر آپ کو حکم ہوا کہ آپ شیخ حسن خوارزمی کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے خوارزم تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد آپ سفر کی تیاری میں لگ گئے اور خوارزم پہنچ گئے اور شیخ حسن سے تربیت حاصل کی اس کے بعد آپ واپس کشمیر آ گئے اور راستے میں شیخ سلیم چستیؒ اور شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانیؒ) سے ملاقات کی۔ جب وطن واپس آ کر دیکھا کہ کشمیر میں خانہ جنگی اور افراتفری کا ماحول تھا۔ مسلکی تعصب عروج پر تھا۔ آپ کے عہد میں کشمیر پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ صرفیؒ ۱۵۸۷ء میں حرمین شریف کی زیارت کے لئے مکہ شریف روانہ ہوئے۔ واپسی پر مختلف مما لک سے تفسیر، فقہ، حدیث اور دیگر علوم کی بیش بہا کتابیں اپنے ساتھ لائے۔ مشہور ہے کہ حضرت صرفیؒ کے کتب خانے میں نادر کتابوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ تھی۔

حضرت صرفیؒ کی شادی ۲۵ برس کی عمر میں سید علاؤ الدین کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ایک فرزند محمد یوسف پیدا ہو گیا لیکن ان کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا۔ حضرت صرفیؒ کی شہرت ان کی زندگی میں ہی دور دور تک جا پہنچی تھی۔ چنانچہ کشمیر اور بیرون کشمیر کے سینکڑوں شاگردوں نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کا شمار بلند پایہ علماء اور مفکروں میں ہوتا ہے۔ حضرت صرفیؒ نے تصوف، معرفت، علم تفسیر، شریعت و طریقت، شعر و شاعری غرض ہر مضمون پر قلم اُٹھایا ہے۔ پڑھنا اور پڑھانا ان کی زندگی

بھر کا مشغلہ رہا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں خطہ کشمیر کے باہر جن عظیم لوگوں سے مراسم رہے تھے۔ ان میں شہنشاہ ہندوستان اکبر کے نورتن تھے۔ جن میں خاص طور پر ملا عبدالقادر بدایونی، ابوالفضل، فیضی، راجہ ٹوڈرمل قابل ذکر ہیں۔ کچھ عرصہ قبل قرآن پاک کی عربی تفسیر لکھنا شروع کی تھی مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور یہ نیک کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

شہنشاہ اکبر کے ساتھ بھی آپ کے خوشگوار تعلقات تھے۔ چنانچہ دور ان سیاحت آپ کو اکبر کے درباریوں سے ملاقات ہوئی۔ ان ہی کی وساطت سے آپ دربار اکبری تک پہنچ گئے۔ چونکہ اکبر بھی خود علم کا زبردست دلدادہ تھا۔ آپ کی عقل و نقل، ظرافت اور علم و فضل دیکھ کر کافی متاثر ہوا آپ کے ساتھ عزت سے پیش آتا تھا حتیٰ کہ آپ کے استقبال کے لئے خود نکلتا تھا۔ اکبر نے آپ کو شیخ اُمم کے خطاب سے نوازا۔

آپ کے ہم عصروں میں اولیائے کرام، علماء سادات کی بڑی تعداد تھی جو علم وادب تقویٰ میں الگ الگ امتیازی شان رکھتے تھے ان میں چند قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔ شیخ حمزہ مخدومؒ، سید احمد کرمانیؒ، حضرت میر میرک اندرابیؒ، حضرت بابا ہردی ریشیؒ، میر اسماعیل شامیؒ، شیخ بابا داؤد خاکیؒ، حضرت بابا علیؒ، مسعود پانپوریؒ، شاہ نعمت اللہ قادریؒ، مولانا فیروز گنائیؒ، مولانا جوہر نانتؒ اور قاضی موسیٰؒ شہید غرضی حضرت صرفیؒ کی زندگی ہوش سنبھالتے وقت سے آخری سانس تک شریعت کی اشاعت اور معرفت کی قیادت کے لئے وقف تھی۔ لوگوں کی دینی اور دنیوی بہتری کا خیال ہمیشہ دامن گیر رہا۔ آپ کا شمار چوٹی کے عالموں اور بلند پایہ شاعروں میں ہوتا

ہے۔فارسی شعر گوئی میں انہیں جامی ثانی کا لقب ملا تھا۔ایران کے شاعروں کا ان کے سامنے سر تسلیم خم تھا۔صرفی تخلص کرتے تھے۔ان کی بے شمار تصانیف ہیں خاص طور پر۔مغاز النبی، مقامات مرُشد، رباعیات صرفی، مناسک حج، وامق عذر، لیلیٰ مجنون اور مناقب اولیاء ہیں۔

آخر کار ۷۵ سال کی عمر میں ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۹۲ء حضرت صرفی کا انتقال ہو گیا یوں کشمیر ایک اقبال مند سپوت سے محروم ہو گیا۔آپ کو اسی جگہ سپرد خاک کیا گیا جہاں پر آپ کے آباو اجداد کی تعمیرات اور زمین تھی۔اس محلے کا نام آپ کے ہی لقب نام ایشاں صاحب سے مشہور ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں ہی ایک خانقاہ یہاں تعمیر فرمائی تھی۔جس میں خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ اور حضرت شاہ قاسم حقانیؒ کے لئے الگ الگ کوٹھریاں بنوائی گئی تھیں۔جن میں تینوں عبادات میں مشغول رہتے تھے۔کچھ مدت کے بعد آپ کے روضہ کے ارد گرد دیوار بندی کرائی گئی بعد میں آپ کی اہلیہ محترمہ نے تمام زیورات فروخت کر کے وہاں خانقاہ تعمیر کروائی۔آپ کے روضہ اطہر میں آپ کی اہلیہ اور میر احمد اسحاقؒ مدفن ہیں۔

☆☆☆

حضرت بابا داوٗد خاکیؒ

حضرت بابا داوٗد خاکیؒ بلند مرتبہ صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ آپ سرکردہ مصنف اور بلند پایہ انشاپرداز تھے۔ علم وفضل اور دینی مسائل میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس نسبت سے آپ کو ابو حنیفہ ثانی کے لقب سے پکارتے ہیں۔ آپ ۹۰۸ھ بہ مطابق ۱۵۲۱ء میں سرینگر کے محلہ کلاش پورہ میں پیدا ہوئے حضرت بابا داوٗد خاکیؒ کے خاندانی حالات کے مطابق آپ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں جب آپ کا خاندان واردِ کشمیر ہوا آپ کے بزرگوں نے شاہی دربار کے محاسب کی حیثیت سے کام سنبھالا۔ اس زمانے میں ہر پڑھے لکھے شخص کو گنائی یعنی منشی کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ چونکہ اس خاندان کے بزرگ، علماء وفضلا گزرے ہیں لہٰذا گنائی کہلانے لگے۔ آپ کی والدہ مشہور درویش بزرگ جناب سید میرک اندرابیؒ ملارٹہ کی اولاد سے تھی۔ آپ نے آخوند ملا بصیرؒ، مولانا رضی الدینؒ، آخوند ملا شمس الدینؒ جیسے علماء اور روحانی پیشواؤں کی مشہور دینی درسگاہوں میں فقہ، حدیث، تفسیر اور ادب کی تعلیم سے منور کیا گیا۔ کمسنی میں ہی آپ نے میر افضل کے مدرسہ سے فلسفہ نجوم، منطق، اور تاریخ ریاض کی تعلیم حاصل کی۔ بے پناہ متاعِ علم سے منور ہونے کے باعث ملا دولت داوٗد

کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لڑکپن سے ہی شعر گوئی سے رغبت تھی اور خاکی
تخلص کرتے تھے۔ آپ کی قابلیت کے معترف سلطان محمد شاہ جب چوتھی بار
بادشاہ بنا نے آپ کو شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اتالیق مقرر کیا۔ کچھ
عرصے کے بعد آپ کو ناظم تعلیمات کا عہدہ دے کر دربار سے منسلک کیا
گیا۔ اس کے بعد آپ کی حاضر جوابی سے آپ کو قاضی شہر بنایا گیا۔ آپ
بچپن سے ہی صوم وصلواۃ کے پابند تھے۔ پابندی سے مسجد میں نماز فجر ادا
کرتے تھے۔ اس کے باوجود حشمت، دولت اور ثروت سے لگاؤ تھا اور شان
وشوکت سے رہتے تھے۔ کبھی گھوڑے پر اور کبھی کشتی کے ذریعہ نوشہرہ عدالت
میں جایا کرتے تھے۔ وقت کے اتنے پابند تھے کہ لوگ آپ کے گزرنے پر
وقت کا تعین کرتے تھے۔ ایک دن سہ پہر آپ نالہ مار سے کشتی میں گزر رہے
تھے حضرت مخدوم صاحبؒ جو اپنے خانقاہ مخدوم منڈو میں رہائش پذیر تھے جو
کہ نالہ مار کے کنارے پر واقع ہے کے کانوں میں گھنگھروں کی آواز گونجی
تو آپ نے اپنے خادم اللہ داد سے دریافت کیا۔ کہ یہ آواز کیسی ہے۔ اس
نے کہا کہ کشتی میں بابا داؤد خاکیؒ سوار ہے۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا کل
جب وہ یہاں سے گزریں گے تو انہیں میرا سلام کہنا۔

حضرت شیخ حمزہؒ نے ایک دفعہ ایسے خادم کے ذریعے بابا داؤد خاکیؒ کو
پیغام بھیجا کہ ایک سائل آپ سے ایک دینی سوال کے بارے میں دریافت
کرنا چاہتا ہے۔ آپ کے خادم نے تعمیل حکم کیا۔ اور بڑے صبر سے شیخ حمزہؒ کا
پیغام بابا داؤد خاکیؒ کو سنایا بابا داؤد خاکیؒ اُٹھ کھڑے ہوئے اور شیخ حمزہؒ کے

پاس پہنچے اور سلام بجالائے۔آپ کو بیٹھنے کے لئے کہا گیا معمولی سی چٹائی پر
بیٹھتے ہی آپ کی جاہ طلبی اور غرور کا نشہ اُتر گیا۔ شیخ حمزہؒ نے بابا داوٗد خاکیؒ سے
دریافت کیا۔ کہ خداوند کریم نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ بتایئے
انسان دن اور رات میں کتنی سانس لیتا ہے۔ ملا داوٗد خاکیؒ نے جواباً کہا جتنے
پیغمبر گزرے ہیں جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ جناب شیخ حمزہؒ
نے سوال کیا۔ جو انسان ایک سانس بھی بغیر یادالٰہی کے گزارے اس بارے
میں شرعی حکم کیا ہے۔ وہ سانس جو یادالٰہی کے بغیر گزرے ایک نبی کے قتل
کے مترادف ہے۔ مولانا خاکیؒ نے جب مسئلہ کی وضاحت کے لئے اپنی
کتاب (بیاضی) کھولی تو وہ کورے کاغذ میں بدل گئی یہ دیکھ کر حیران و
ششدر ہو کر مخدوم صاحبؒ کی طرف نظر ڈالی پھر نظر جھکا کر سر خم کیا اور گھر
میں رات بھر سوچنے لگے۔ دوسرے دن مخدوم صاحبؒ سے استدعا کی کہ
مجھے اپنی خدمتگاری کا شرف بخشیں۔آپ نے ان کو نماز کے لئے وضو اور غسل
کا پانی لانے پر مامور کیا۔اور بابا داوٗد خاکی نے عزت، دولت اور شہرت چھوڑ
دی۔ایک دن شیخ حمزہ مخدومؒ ذاکر مسجد کوہ ماراں میں عبادت کر رہے تھے
اور بابا داوٗدؒ باہر پہرے پر کھڑے تھے کہ اچانک ان کے دل میں خیال گزرا
کہ میں نے شان و شوکت، جاہ و جلال سب کچھ چھوڑ کر فقیری اختیار کی۔
آپ اسی خیال میں تھے کہ ذاکر مسجد سے مخدوم صاحبؒ نے آواز دی میرے
لئے مٹی کا انتظام کرو۔ مجھے کلوخ کرنا ہے۔ (حاجت بشری) بابا داوٗد خاکیؒ
نے کوہ ماراں پر نظر ڈالی سارا پہاڑ سونے کا نظر آیا۔حضور یہاں مٹی کا کئی نام و

نشان نہیں ہے پہاڑ سونے میں تبدیل ہوا ہے۔ فرمایا سونے کا ایک ڈھیلا ہی لا کے رکھو۔ بابا داؤد خاکیؒ نے کہا حضور شریعت سونا کلوخ (حاجت بشری) کے کام نہیں آسکتا۔ اس کے بعد مخدوم صاحبؒ نے ان کو خانقاہ کے اندر بلایا اور فرمایا جو سونا کلوخ کے بھی کام نہ آئے اس کی تمنا بے معنی۔ اس پر بابا داؤد خاکیؒ شرمندہ ہوئے اور توبہ کی حضرت خاکیؒ اپنے مُرشد کامل سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے اور ان کی محبت میں یہ لافانی شعر کہہ چکے ہیں۔

شکر اللہ حال من ہر لحظہ نیکو تر شد است
شیخ شیخاں شیخ حمزہ تا مرار بر شد است

یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو حضرت مخدومؒ کے خلیفوں اور مُریدوں میں سب سے زیادہ ہم رکاب رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

۱۵۵۳ء میں سلاطین کشمیر کا خاتمہ ہوا اور کشمیر چک حکمرانوں کے قبضہ میں آگیا۔ غازی چک بادشاہ کشمیر اور مخدوم صاحبؒ کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے اور غازی چک نے مخدوم صاحبؒ کو جلاوطن کر دیا۔ اس وقت شیعہ سُنی منافرت کو بھی ہوا لگی تھی۔ اس وقت بابا داؤد خاکیؒ کشمیر سے باہر ملتان اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں تشریف لے گئے۔ بابا داؤد خاکیؒ نے کم بیش تیس سال حضرت مخدومؒ کے ساتھ گزارے۔ آپ نے بہت ساری کتابیں تحریر کی ہیں وردالمریدین قصیدہ جلالیہ دستور سالکین۔ کشمیر سے باہر ملتان میں بابا داؤد خاکیؒ کو ملیریا کا عارضہ لاحق ہوا۔ سرینگر پہنچ کر کچھ دن قیام

کرنے کے بعد آپ بابا ہردے ریشیؒ کے آستانہ کی زیارت کے لئے اسلام آباد چلے گئے ۔ جہاں ۳ ماہ صفر ۱۵۸۶ء کو اٹھاسی سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی ۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کے مُرید اور خادم حضرت زین الدین رعنا واری کو خواب میں حضرت شیخ حمزہؒ نے یہ ہدایت دی کہ بابا خاکی کو میرے پہلو میں کوہ ماراں میں سپرد خاک کرو۔ مغل فوج کے گورنر قاسم خان کے تعاون سے بابا داؤد خاکیؒ کے جسد پاک کو اسلام آباد سے سرینگر لایا گیا۔ اس طرح آپ کو بڑے ہی عزت واحترام کے ساتھ آستانہ مخدوم صاحبؒ کے روضہ مبارک کے پہلو میں آسودہ کیا گیا۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ

کشمیر اپنی خوبصورتی اور قدرتی مناظر کی وجہ سے تو دنیا میں مشہور رہا ہے اور اس خطہ کو جنت بے نظیر کہا گیا ہے لیکن یہ سرزمین صوفیوں، علماء اور بزرگان دین کی آماجگاہ بھی ہے اور اسے اسی لیے ''پیرواری'' یا ''ریشی واری'' بھی کہا گیا ہے یہاں کے بسنے والے مختلف مذاہب کے پیروکار آپسی محبت اور انسان دوستی کے جذبہ سے زندگی گذارتے رہے ہیں۔ اور ان میں مذہبی رواداری پائی جاتی ہے انہیں یہ تربیت بزرگوں کی دین ہے۔ دسویں صدی ہجری میں کشمیر میں بڑے بڑے صوفیاء اور علماء پیدا ہوئے ان بزرگوں نے علوم ظاہری اور باطنی میں اپنے تمام ہم سفروں سے سبقت حاصل کی ان میں خاص طور پر شیخ یعقوب صرفیؒ، ملا محسن فانیؒ، بابا داؤد خاکیؒ اور خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ قابل ذکر ہیں۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ، ''حبی'' ۹۶۳ ہجری بمطابق ۱۵۵۵ء میں علی شاہ چک کے عہد حکومت میں سرینگر کے محلّہ نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ کا تعلق گنائی خاندان سے تھا۔ آپ کے والد شمس الدین گنائی تھے۔ آپ نے اپنے آبائی گھر میں پرورش پائی۔ چونکہ اُس زمانے میں دینی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ حبی کو دینی علوم کے علاوہ

مروجہ علوم کی طرف بھی دلچسپی رہی۔ قرآن حکیم حفظ کرنے کے علاوہ دیگر علوم وفنون میں بھی بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ فقہ، حدیث اور اس کے علاوہ فارسی زبان کا بھی مطالعہ کیا۔ چنانچہ آپ کشمیر کے ممتاز علماء میں شمار کئے جانے لگے۔ آپ نے اپنا تخلص جبی رکھا۔

خواجہ جبیؒ نے کھیل کود سے ہمیشہ بے رخی کی اور ساری جوانی تصوف کے دائرے میں رہ کر بسر کی۔ بزرگان دین کی تربیت خصوصاً جناب میر سید علی ہمدانیؒ اور جناب شیخ یعقوب صرفیؒ کے علاوہ علماء، فضلا و اولیاء کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوتے رہے۔ فقیرانہ زندگی بسر کی اور عموماً روزہ رکھا کرتے تھے۔ پوری زندگی میں کوئی چیز کسی سے مانگ کر نہ کھائی، جس دن گھر میں کھانے کا سامان نہ ہوتا تھا بہت خوش ہوتے اور فرماتے تھے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔ مرید جو ہدیہ یا تحفہ جات پیش کرتے تھے۔ اس میں سے تھوڑا سا حصہ اپنے ذاتی اخراجات کے لئے صرف کرتے تھے باقی کو حاضرین فقراء و غرباء میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے آپ نے لنگر خانہ قائم کیا تھا۔ قیمتی لباس سے آپ کو نفرت تھی چوغا قمیض کرتا زیب تن فرماتے تھے فیاضی کا یہ عالم تھا کوئی سائل سوال کرتا تو چوغا یا کرتا جو کچھ بدن پر ہوتا اُتار کر دیتے تھے۔

والد بزرگوار کے حکم سے نمک فروشی کی دکان لی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کبھی ترازو ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ دکان پر بیٹھ کر تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہوتے گاہک نقدی یا جنسی کے بدلے خود ہی سودا

تول کر لے جاتے۔ دکان پر بھی زیادہ تر یادِ الٰہی میں ہی مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ آپ کے والد کو اس بات کا احساس ہوا کہ جبی کو دکان پر بٹھانے سے کاروبار میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے اور انہیں دنیاوی مشاغل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے بعد جبیؒ ملا حسن آفاقیؒ کی خدمت میں رہنے لگے۔ ملا حسنؒ اپنے زمانے کے بڑے عالم فاضل اور صوفی تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ یہاں عربی اور فارسی کی اعلیٰ کتابوں کا درس حاصل کرتے رہے۔ پھر حدیث تفسیر قرآن، فقہ منطق، فلسفہ کی تربیت جناب شیخ یعقوب صرفیؒ سے حاصل کرتے رہے۔ ان کی محبت اور روحانی تربیت نے جبیؒ کی زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہ ایک دکاندار کے بجائے عالم دین بن گئے۔ جبیؒ ملا حسن آفاقیؒ کے علاوہ میر محمد خلیفہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے اور میر محمد خلیفہ بھی حضرت صرفیؒ کے شاگرد تھے اور یہاں بھی انہوں نے روحانی اور باطنی کمالات حاصل کیئے۔ جبیؒ سماج کے بہت دلدادہ تھے ملا آخون حسن خبازؒ (آخون صاحب حول) نے آپ کے ساتھ سماع (گانا بجانا) کی جوازیت پر بڑے بڑے مباحثے کیئے۔ یہ واقعہ کشمیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ یہ تنازعہ حکام وقت کے پاس فیصلہ کے لئے پیش کیا گیا۔ تاریخ کبیر از محی الدین مسکین سرائے بلی میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز جہانگیر بادشاہ جھیل آنچار میں شکار کی غرض سے سیر کر رہا تھا اور خواجہ جبیؒ کے چکور ایک چنار کے درخت کے اردگرد پرواز کر رہے تھے اور بادشاہ کے باز چکوروں کو پکڑنے کے لیے

اُڑنے لگے چکوروں نے اُچھل کر بازوں کی آنکھیں نکال دیں جب بادشاہ
اس واقع سے مطلع ہوا اور پوچھا یہ چکور کس کے ہیں تو عرض کیا گیا۔ یہ چکور
حضرت جبیؒ کے ہیں اور پھر بادشاہ جہانگیر ان کی ملاقات سے ممتاز اور مشرف
ہوا۔ حضرت جبیؒ کی مقدس ہستی کو اولیائے کشمیر کی صف میں ایک نمایاں درجہ
حاصل ہے بنی نوع انسان کی خدمت کو انہوں نے اپنا اصول بنالیا تھا۔ خود
فاقہ کرتے لیکن بھوکوں کو کھلاتے تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں ان کی شان
نرالی تھی۔ حقیقت اور معرفت میں ڈوبے ہوئے تھے راتوں کو بیدار رہتے
تھے۔ آپ نے ۶۳ سال کی عمر میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۰۲۷ ہجری بمطابق
۱۶۱۷ عیسوی میں انتقال فرمایا۔ قدرت نے آپ کو دو فرزند عطا کئے اور وہ
دونوں کمسنی میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے اس کے بعد آپ اکثر آہ
وزاری کرتے رہتے تھے۔ آپ کے بے شمار خلیفہ تھے جن میں خواجہ زین
الدین، مولانا مہدی، خواجہ حبیب اللہ نوری اور میر شمس الدین کے نام قابل
ذکر ہیں آپ کی تصانیف میں دیوان جبی یا مقامات حضرت ایشان جس
میں آپ کے مرشد حضرت یعقوب صرفیؒ کے احوال وکمالات کے بارے
میں لکھا گیا ہے۔ یہ تصنیف آپ نے ۱۰۱۱ھ میں قلم بند فرمائی۔ اس میں جبی
نے اپنے مرشد حضرت یعقوب صرفیؒ کے عادات روحانی مراتب کرامات کا
ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جبیؒ نے حمد خدا، مدح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم،
معراج نبوت، منقبت حضرت امیر کبیرؒ وغیرہ کے بارے میں اشعار لکھے ہیں
۔ اس کتاب کا دوسرا نام سیاحت نامہ بھی ہے چنانچہ حضرت جبی نے اس میں

اپنے مرشد صرفی صاحب کے کشمیر سے باہر سیر و سیاحت کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے حسب و نسب، پیدائش اور خاندانی حالات کا ذکر بھی کیا ہے۔

''مداۃ القلوب'' نثر میں لکھی گئی ہے یہ کتاب تصوف کے بارے میں روشنی ڈالتی ہے۔ ''رسالہ تصوف'' راحت القلوب، ''رسالہ اور انصاف'' ان کی شاعری کا عروج ہر دور میں ہوا۔ جبیؒ کی اکثر غزلیں درد و سوز کے جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔ خواجہ صاحب کا بیشتر کلام محبوب حقیقی کے لیے وقف رہا ہے اور آپ نے اپنے کلام میں اپنے محبوب کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور حسن کی جا بجا تعریفیں کی ہیں اور حُسن کی تعریفیں کی ہیں۔ خواجہ جبی کو غزل کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے رباعیات بھی لکھی ہیں۔ جبیؒ کے دیوان کے قلمی نسخے ہندو پاک کے تمام کتب خانوں میں موجود ہیں اور کشمیر کے بعض علم دوست حضرات کے گھروں میں بھی ان کے دیوان موجود ہیں ۱۳۸۱ھ میں خواجہ حبیب اللہ کاملی نے دیوان جبی ایک فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

خواجہ جبیؒ کا کشمیری کلام بہت کم ملتا ہے جس قدر دستیاب ہوا ہے۔ اس سے آپ کے شاعرانہ مرتبہ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ خواجہ صاحبؒ کے آستانہ عالیہ پر ہر سال ۱۹/۲۰ ذی الحجہ کو عرس کی تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے خاص کر محفل مولودِ خوانی اور ان کی نظر فیض کی بدولت لوگ ہزاروں کی تعداد میں شامل ہو کر اپنا دامن مراد بھر لیتے ہیں۔

کشمیر کا مشہور و معروف مزار کلاں

مقبرہ بہاؤالدین گنج بخشؒ

سرینگر میں بہت سارے تاریخی قبرستان موجود ہیں۔ جن میں خاص طور پر مزارِ سلاطین، مزار کلان مقبرہ بہاؤالدین گنج بخشؒ قابل ذکر ہیں۔ مزار کلان تاج خاتون بیہقی بیگم سلطان زین العابدین بڈشاہ کی چہیتی بیوی کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کی جدائی سے بادشاہ کو دلی صدمہ پہنچا اور آپ ہمیشہ غمگین رہتے تھے۔ بیہقی بیگم سید محمد بیہقی کاندہامی کی نیک دختر تھی۔ یہ قبرستان دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور قلعہ ناگرنگر ہاری پربت کی دیوار تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مقبرے میں بڑے بڑے عالی دماغ امرا۔ وزراء علماء اور نامور خواتین اور شاہی بیگمات دفن ہیں۔ اس احاطے میں ایک چھوٹا سا احاطہ ہے۔ جو ''سیدواری'' قبرستان کہلاتا ہے۔

مزید اس میں کشمیر کا بادشاہ سلطان حسن شاہ اور بیہقی سادات سپرد خاک کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حافظ مریم جو کہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء بیگم کی خاص مصاحبہ تھی بھی دفن ہے۔ اس مزار میں کچھ ایسی بھی قبریں ہیں جن پر عربی و فارسی اور شاردا رسم الخط موجود ہیں۔ مزار سے کچھ فاصلہ پر

خواجہ اعظم دیدمری مصنف ''واقعات کشمیر'' کا مزار خستہ حالت میں ہے اور جلاہوں کے مکانات کی دیوار سے لپٹا ہوا ہے۔ مزار کلان کے دروازے کے اندر بائیں طرف ایک بلند چبوترہ ہے اس میں تین چار قبریں افغانستان کے شاہی خاندان کے نامور افراد کی ہیں۔ جن میں خاص طور پر سردار محمد ہاشم خان ہے۔ روضہ کے آس پاس تربتوں پر کندہ عربی اور فارسی رسم الخط تاریخی لحاظ سے اس وجہ سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ خوش اسلوبی اور عمدہ طرز تحریر کے دلکش نمونے ہیں۔ مزار کلان کے وسیع احاطہ میں دو مشہور اولیائے کرام شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ اور سید احمد کرمائیؒ کے مزار بھی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ بڈشاہ کے عہد حکومت میں اس مزار میں اس کی بیوی بیہقی خاتون کو دفن کرنے کے لئے جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۱ دسمبر ۱۴۳۹ء کو شیخ بہاؤالدینؒ کا انتقال ہوا تو سب سے پہلے اس مزار میں انہی کو دفن کیا گیا۔ بہاؤالدین کا روضہ ۲۶ فٹ چوکور ہے اس کے چاروں طرف گیارہ محرابی کھڑکیاں ہیں ۷ فٹ اونچی اور ساڑھے ۶ فٹ چوڑی۔ ان تمام کھڑکیوں پر نقاشی کی گئی ہے روضہ کے مشرق کی جانب ۷ فٹ اونچا ۵ فٹ چوڑا دروازہ ہے جس کے دائیں طرف اللہ اور بائیں طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہوا ہے۔ روضہ کے احاطہ میں مغرب کی طرف مشہور شاعر میر الٰہی کی قبر ہے۔

<u>بہاؤالدین گنج بخشؒ</u>:۔

آپ خواجہ اسحاق ختلانی کے مریدوں میں سے تھے۔ کافی مدت تک

گوشہ نشینی اور گمنامی کے پردے میں چھپے رہے۔ آپ پکے ہوئے چاولوں
کے دانے گلیوں اور کوچوں میں سے دن کو چلتے چلتے اُٹھاتے اور دھوکر کھاتے۔
کہتے ہیں کہ آپ نے زینہ کدل پُل کے نیچے ایک چھونپڑی بنائی تھی اور اس
میں ریاضت اور عبادت کرتے تھے ایک دن سلطان بڈشاہ آیا اور عرض کی
''میری کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کی سیر سے دل بہلائیں''۔ جناب نے نہ
مانا۔ بادشاہ نے پُر زور اصرار کیا۔ اس کے جواب میں جناب نے اپنی جائے
نماز کو پانی پر ڈال دیا اور خود اس پر بیٹھ گئے اور جائے نماز دریا پر اس تیزی
سے چلا کہ شاہی ملاحوں کی کوشش ان کو پکڑنے میں ناکام رہی۔

آپ سلطان بڈشاہ پر بہت مہربان تھے ایک دفعہ ان سے فرمایا کہ ہم
تم کو اپنے وقت کا بادشاہ بنا دینگے اور بے شمار خزانے آپ کو ملیں گے۔ زیادہ
وقت گزرنے نہ پایا تھا کہ بڈشاہ اپنے بھائی علی شاہ پر غالب ہو کر بادشاہ بنے
اور بے شمار خزانے ان کی تحویل میں آئے۔ آنجناب اسی لئے گنج بخشؒ کے نام
سے مشہور ہو گئے اور آج تک اسی نام سے مشہور ہیں۔ ایک رات کرشہ بل
نزدیک صفا کدل آپ عبادت میں مشغول تھے کہ چوروں کی ایک جماعت
نے اس جگہ آکر مال مسروقہ آپس میں بانٹ دیا اور جب بانٹ کر فارغ ہو
ئے تو اُن کو دیکھا۔ چوروں کے دل میں ڈر پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ راز کھل
جائے اسی اندیشہ سے انہیں شہید کیا۔ کہتے ہیں اس واقعہ سے پہلے شیخ نے
دوستوں کو وصیت کی تھی کہ مجھے مرنے کے بعد پاؤں میں رسی باندھ کر گھسیٹتے
گھسیٹتے قبرستان تک لے جائیں۔ بڈشاہ نے گھاس کو رسی کا تابوت جیسا بنوا

کر نعش کو اس میں رکھ دیا اور تابوت کو قبرستان تک پہنچایا۔ حضرت کو سعید مدنیؒ اور شیخ نور الدین ولیؒ کے ساتھ دوستی اور محبت تھی اور آپ کو مزار کلاں میں سپرد خاک کیا گیا۔

میر سید احمد کرمانیؒ :-

میر سید احمد کرمانیؒ کرمان کے رہنے والے تھے آپ کے والد بزگوار کا نام سید محمود مکرمی تھا۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت امام حسینؓ شہید کربلا سے ملتا ہے۔ آپ نے کرمان سے نکل کر سیر وسیاحت کا راستہ اختیار کیا اور حرمین شریفین کی زیارت سے فیضیاب ہوئے۔ جہاں بھی گئے وہاں علمائے دین سے روحانی اور علمی فیض حاصل کرتے رہے آخر دنیا کا سفر کاٹ کر سرزمین ملتان کو اپنا مسکن بنایا۔ اُس کے بعد آپ کشمیر تشریف لے آئے۔ آپ سعید مخدوم جہانیاںؒ کے مرید تھے۔ کشمیر کے سلطان نازک شاہ نے آپ کی خدمت گزاری دل وجان سے کی۔ اُس نے آپ کو اور آپ کے خادموں کے لئے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کروائی۔ اس کے ساتھ ہی خانقاہ کے خادموں کے لئے تین ہزار خروار شالی سالانہ بطور وظیفہ رکھ دیئے۔ یہاں حضرت خواجہ مسعود نروریؒ آپ کی ارادت میں آئے۔ آپ کی تربیت سے دلی کامل بن گئے۔ حضرت کرمانیؒ نے اُن کو تبرکات عطا فرمائے۔ روایت ہے کہ ان میں حضرت فاطمہ الزہرؓ کا ڈوپٹہ اور حضرت امام حسینؓ کے جامہ شریف تھے یہ تبرکات مسعودی خاندان کی تحویل میں ہیں۔ آپ کو شیخ حمزہ مخدومؒ کے ساتھ گہرے تعلقات تھے آپ نے یہاں لاتعداد لوگوں کو روحانی فیض وبرکت

سے سرفراز کیا آخر ۲۱ ماہ رمضان المبارک۹۸۲ھ میں انتقال پُر ملال
فرمایا۔اور مزار کلان میں سپرد خاک کیئے گیئے ۔ یہاں پر ہر سال ۲۱ ماہ
رمضان المبارک کوآپ کے عرس مبارک کی تقریب منائی جاتی ہے۔

مزار سلاطین

۱۳۲۰ء میں رینچن شاہ کشمیر کا وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ جو پہلے بدھ مت کا پیرو کار تھا۔ اس کی ملاقات حضرت شرف الدین بُلبُل صاحبؒ کے ساتھ ہوئی۔ جو وسط ایشیاء سے کشمیر آئے تھے ان سے متاثر ہو کر رینچن شاہ نے اسلام قبول کیا اور بُلبُل صاحبؒ نے ان کا اسلامی نام صدر الدین رکھا۔ رینچن شاہ کے قبول اسلام کے ساتھ ہی ان کے وزیروں اور امیروں نے بھی اسلام قبول کیا۔ آپ نے ۱۳۲۰ء سے لیکر ۱۳۲۳ء تک کشمیر میں حکومت کی اور ان کو محلّہ بُلبُل لنکر میں سپرد خاک کیا گیا۔ سرزمین کشمیر پر یہ کسی مسلمان کی پہلی قبر ہے۔ جس پر کوئی کتبہ تحریر نہیں۔ رینچن کے مزار کے قریب حضرت شرف الدین بُلبُل صاحبؒ کی قبر ہے۔ اس پر بھی کوئی کتبہ تحریر نہیں ہے۔ رینچن شاہ کے انتقال کے ۱۶ برس بعد سلطان شاہ میر کشمیر کا بادشاہ بنا۔ سلطان شاہ میر کا انتقال ۱۳۴۲ء میں ہوا اس کی قبر اندر کوٹ سمبل میں ہے اندر کوٹ کا یہ تاریخی مزار شاہ میری سلاطین کا اوّلین مزار ہے۔ سلطان شاہ میر کے بعد سلطان جمشید کشمیر کا بادشاہ بنا۔ اس کی قبر زینہ پورہ میں ہے۔ جمشید کے بعد ۱۳۴۳ء میں علاالدین کشمیر کا بادشاہ بنا اس کی قبر ملک آنگن فتح کدل سرینگر میں مشرق کی طرف سڑک پر واقع ہے۔ سلطان علا الدین کے بعد سلطان شہاب الدین ۱۳۵۴ء میں کشمیر کا حکمران بنا۔ اس کی قبر مہاراج

گنج پوسٹ آفس کے نزدیک ہے۔سلطان قطب الدین ۱۳۷۳ء میں کشمیر کا حکمران بنا۔اس کی قبر صراف کدل پیر حاجی محمد صاحب کے آستانہ میں موجود ہے۔مزار سلاطین شاہ میری بادشاہوں کا ایک اہم اور تاریخی مقبرہ ہے۔یہ بڈشاہ کے ڈمٹھ کے قریب مہاراج گنج زینہ کدل میں جہلم کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد اس کا لڑکا سلطان سکندر ۱۳۸۹ء میں کشمیر کا بادشاہ بنا۔اس نے اپنے عہد میں زینہ کدل سرینگر میں اپنی آخری قیام گاہ مقرر کی اور ۱۴۱۳ء میں انتقال کر گیا۔اس کے بعد ان کو مزار سلاطین زینہ کدل سرینگر میں سپرد خاک کیا گیا۔اس طرح اس سلاطین کے مزار میں یہ اوّلین سلطان سکندر کی قبر ہے۔جو پہلی صف میں مغرب میں پہلی قبر ہے۔سلطانوں کے اس مزار میں سلطان سکندر کے اکثر سلاطین جس میں خاص طور پر کشمیر کا مشہور اور ہر دل عزیز بادشاہ سلطان زین العابدین بڈشاہ ہے جو کہ سلطان سکندر کی ماں کے گبند نما مقبرہ کے باہر شمال میں واقع ہے۔اس مقبرہ کے چاروں طرف پتھروں کی دیوار ہے۔بڈشاہ کی قبر اس کے والد کی قبر کے نزدیک ہی ہے جس پر فارسی کے اشعار کندہ ہیں۔ بڈشاہ کی قبر ۱۶ فٹ لمبی اور ۷ فٹ چوڑی ہے اور یہ بیان اس وقت کے تاریخ دان شری ور کے بیان سے میل کھاتا ہے۔اس قبرستان میں شاہ میری خاندان کا آخری بادشاہ سلطان حبیب شاہ ۶۵-۱۵۶۱ء بھی دفن ہے۔اس بات کا اشارہ اس کتبے سے ملتا ہے جو مزار سلاطین کی مشرقی دیوار پر خستہ حالت میں سڑک کے کنارے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔کتبے پر مندرجہ ذیل اشعار

در زیارت روضۂ اجداد خود سلطانِ حبیب
دید و گفت ایں جائے شاہان تنگ گردو عنقریب
صاف درو وازہ دِگر با پہلویش فرود
تا ازیں روضہ نگر دو ہیچ شاہی بے نصیب
گاہے تعمیر بنائے نوشیدم از شروش
سالِ نازہنش مزار ثانی سلطانِ حبیب

۹۸۰

اس مزار میں مرزا حیدر دوغلت کاشغری بھی دفن ہے۔ جو سلطان ہند شہنشاہ بابر کا خالوزاد بھائی تھا۔ مرزا حیدر اگر چہ خود کشمیر کا بادشاہ نہیں بنا لیکن وہ ایک بادشاہ کا رُخ موڑنے والا شخص ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے وہ بادشاہوں سے بھی اعلیٰ شان رکھتا تھا۔ اس نے کشمیر پر ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۰ء تک حکومت کی۔

مزار سلاطین میں مرزا حیدر کا مقبرہ دیگر تمام قبروں سے بلند و بالا ہے اس پر جو کتبہ لگا ہے وہ کافی بڑا ہے اور اس پر یہ عبارت درج ہے۔

شہ گورگان مرزا حیدر آخر کار
بملکِ شہادت زدہ کوش شاہی
رضائے الٰہی چُنیں بود تاریخ
شد از بہرِ فوتش ''قضائے الٰہی''

۹۵۷ھ ۱۵۵۰ء

قبر پر فرش کی طرز پر ایک بڑا پتھر لگا ہے جس پر فارسی نثر میں مرزا حیدر کے حالات زندگی کندہ ہیں۔ یہ کتبہ 1824ء میں انگریز سیاح مور کرافٹ کے ہاتھوں لگایا گیا ہے۔اس پر مرزا حیدر کی مختصر سوانح عمری درج ہے۔ چونکہ مور کرافٹ اپنی سیاحت کے سلسلے میں وسط ایشیاء کے مختلف علاقوں میں گھوما تھا اور وہاں اس نے مرزا حیدر دوغلت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اس لئے اس اشتیاق سے وہ مرزا حیدر کی قبر کو دیکھنے کے لئے کشمیر آیا اس مقبرہ میں بہت سارے عالم سپرد خاک ہیں جیسے قبر مولانا کمال جو بڈشاہ کے عہد کا ایک زبردست عالم اور فاضل تھا اس کی قبر پر خط ثلث میں کتبہ لگا ہے۔

<u>قبر داؤد بن قاضی محمد</u>:-

یہ بڈشاہ کے وقت کا قاضی اور حاکم شرع تھا۔

<u>قبر دوست میر</u>:-

اس کا سال وفات 1398ء ہے وہ سلطان سکندر کا ہم عصر تھا۔

<u>قبر محمد صالح</u>:-

یہ شخص اپنے وقت کا ایک بہادر اور جری پہلوان تھا۔

اس کے علاوہ مولانا اسحٰق کمال، سید جلال الدین بخاری، سید حسین منتقی، علامہ دوار کی، سید ابراہیم خان، بابا عثمان اور حبیب گنائی یہ سب اس قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ مزار سلاطین اب ایک عام قبرستان کی شکل میں ہے۔ کیونکہ عام لوگ بھی اس قبرستان میں اپنے مردے دفن کرتے ہیں۔ کشمیری پنڈت اس جگہ کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس

جگہ کے نزدیک ایک مندر راجہ پرورسین نے تعمیر کیا تھا اور اس مندر کا نام
مہاشری تھا۔ مقبرہ کے جنوب مشرق میں ایک خوبصورت بازار ہے جسے
مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بنوایا (۱۸۸۵-۱۸۵۷ء) مہاراجہ رنبیر سنگھ اور پرتاپ
سنگھ (۱۹۲۵-۱۸۸۵) کے وقت میں اس بازار کی بڑی اہمیت تھی اور یہ کشمیر کا
بڑا تجارتی مرکز مانا جاتا تھا۔ ان مہاراجوں نے پنجاب سے تاجر لائے اور
ان کو یہاں پر بسایا۔ یہ لوگ تجارت کے کام سے اچھی طرح واقف تھے
۱۹۴۰ء کے بعد تجارتی مرکز لالچوک امیرا کدل میں منتقل ہوا بڈشاہ کے مقبرہ
کے نزدیک ہی زینہ کدل ہے جس کو بڈشاہ نے ۱۴۲۷ء میں تعمیر کروایا تھا۔

مقبرہ سلاطین کے اندر ہی والدہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کا گبند
نما (ڈومٹھ) مقبرہ جہاں بڑے بڑے اونچے گمبندے کھڑے ہیں جو کہ ارد
گرد مکانوں سے بہت اونچے ہیں۔ یہاں پر بڈشاہ کی والدہ سپرد خاک
ہے۔ اس کے والدہ کے مقبرہ کا اوپر والا حصہ خود سلطان نے تعمیر کیا۔ نیچے والا
حصہ خیال کیا جاتا ہے کسی پرانے عمارت کا حصہ ہے۔ مقبرے کے اوپر پانچ
گمنبد ہے۔ سب سے بڑا گمبند درمیان میں ہے۔ خاص بات اس مقبرہ میں
ہے وہ اس میں نیلے رنگ کے ٹائیلیں لگی ہوئی ہے۔ جو بہت خوبصورت
دکھائی دیتے ہیں۔ مقبرہ کے اندر لکڑی کے روشن دان، بڑے اچھے ڈھنگ
سے سجائے ہوئے ہیں۔ درمیان والے گمبند میں ایک لوہے کی
Chain پلیٹ میں پیوست ہے جو لٹکتی ہے۔

☆☆☆

پتھر مسجد/شاہی مسجد سرینگر

اگر چہ مغلوں نے کشمیر پر ۱۵۸۶ء میں قبضہ کیا۔ تاہم انہوں نے یہاں خوبصورت باغات اور مسجدیں تعمیر کیں۔ شاہان مغلیہ تعمیر کے بڑے دلدادہ تھے جہانگیر ہندوستان کے تخت پر ۱۶۰۵ء میں جلوہ افروز ہوا۔ جہانگیر اور اس کی ملکہ نور جہاں کو کشمیر کے قدرتی نظاروں کوہساروں اور آبشاروں سے بے حد لگاؤ ہو گیا کشمیر کی خوبصورتی نے ان دونوں کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ بار بار کشمیر آتے رہے کشمیر کے متعلق جہانگیر نے لکھا ہے۔

''کشمیر ایک صدا بہار باغ ہے جو شاہی محل کا ایک آہنی قلعہ اور درویشوں کے لئے پھولوں سے لدا ہوا دلفریب ورثہ اس کے خوبصورت مرغزار اور دلکش چشمے بے شمار فوارے تعریف کے لائق ہے۔ جب جہانگیر نے اپنے والد کے ساتھ کشمیر کا سفر ۱۵۸۹ء میں کیا تو کشمیر سے آپ کو پیار ہو گیا۔ ہندوستان کی گرمی سے بچنے کے لئے جہانگیر اور نور جہاں کشمیر کا رُخ کرتے ، وادیوں، مرغزاروں اور جھیلوں کا سیر کرتے ۔ جب کبھی جہانگیر یا نور جہاں کشمیر میں کسی پہاڑ پر کوئی چشمہ یا آبشار دیکھتے تو ان پر خوبصورت باغ بنواتے اور پھولوں سے ان کو سجایا کرتے جیسے شالیمار باغ ، اچھ بل، ویری ناگ اور پتھر مسجد جو سرینگر میں ملکہ نور جہاں نے دریائے جہلم کے بائیں

کنارے ۱۶۲۳ء میں تعمیر کی جو کہ خانقاہ معلّٰی کے بالمقابل واقع ہے۔ یہ مسجد کشمیر میں مغل فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے اس مسجد کو پتھر مسجد، نئی مسجد اور شاہی مسجد سے بھی پکارا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکھ اور ڈوگرہ دور میں مسجد کے دروازے بند کئے گئے اور مسجد کے احاطے کو شالی سٹور میں تبدیل کیا گیا لیکن مسلمانان کشمیر کی کوششوں سے ۱۹۳۴ء میں مسجد کے دروازے پھر کھول دیئے گئے مسجد کی تعمیر میں مشہور تاریخ دان اور انجینئر حیدر چاڈورہ نے کام کیا۔ آپ نے جامع مسجد سرینگر کو بھی از سر نو تعمیر کیا۔ مرزا حیدر کو جہانگیر اور نور جہاں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ نور جہاں نہ صرف جہانگیر کے دل پر حکومت کرتی تھی بلکہ وہ ملکہ ہندوستان ۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۷ء تک رہی۔ اور ہندوستان پر حکومت اپنے خاوند جہانگیر کے ساتھ تقریباً ۱۶ سال کی۔ آخر آپ اس دنیا فانی سے ۱۶۴۵ء میں انتقال فرما گئی۔ آپ کو لاہور میں سپرد خاک کیا گیا۔

پتھر مسجد کچھ عرصے کے لئے غیر آباد رہی کئی جگہوں پر اس کے غیر آباد ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے چونکہ یہ مسجد ایک عورت کے کہنے پر بنائی گئی تھی۔ اس لئے اس میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جب ملکہ نور جہاں سے پوچھا گیا کہ مسجد تعمیر کرنے میں کتنی رقم صرف ہوئی۔ تو اس نے اپنی جوتی کی طرف اشارہ کر کے ایسا جواب دیا کہ لوگ ناراض ہو گئے اور اس میں نماز پڑھنے سے گریز کیا۔ اس طرح بہت عرصہ تک غیر آباد رہی۔ کشمیر کے سیاسی پس منظر میں پتھر مسجد کی اپنی ایک اہمیت اور افادیت

ہے مسجد کے جنوبی حصہ کی طرف مجاہد منزل ہے جو کہ نیشنل کانفرنس کا ہیڈ کوارٹر رہا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں مجاہد منزل کی تعمیر شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں ہوئی۔ یہاں سے ڈوگرہ حکومت اور مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف جدو جہد شروع ہوئی اور کشمیر چھوڑ دو اور بینامہ امرتسر توڑ دو کا نعرہ کشمیریوں نے بلند کیا اور پتھر مسجد میں بھی آزادی کے حق میں اجلاس منعقد ہوئے۔

پتھر مسجد ۱۸۰ فٹ لمبی اور ۵۴ فٹ چوڑی ہے۔ مسجد کی بنیاد تراشے ہوئے دیوری پتھروں کی بنی ہے۔ پتھر کے بنے سردل پر کنول کی پتیوں کی شکل میں ڈوریاں اُبھاری گئی ہیں۔ سردل کے اوپر مسجد کے سامنے کی طرف صدر دروازے کے دائیں بائیں چار چار محرابیں ہیں جو کھڑیوں کا کام دیتی ہیں۔ انہی محرابوں کے عین سامنے قبلے کی سمت میں بھی نو محرابیں ہیں۔ ان میں سے دروازے کے سامنے کی مرکزی محراب سب سے بڑی ہے۔ محراب کے دائیں بائیں جو چار محرابیں ہیں ان پر محرابی طرز کے روشن دان ہیں۔ مسجد کی پوری لمبائی تین حصوں میں منقسم کی گئی ہے اور یہ کام آٹھ آٹھ ستونوں کی دو قطاروں سے لیا گیا ہے۔ ہر ستون نیچے پتھروں سے اور اوپر اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ اینٹوں والے حصے پر چونے سرخی کا پلستر کیا گیا ہے۔ مسجد کی چار دیواری پر بھی چونے سرخی کا ہی پلستر کیا ہوا ہے۔ ستون اوپر کی طرف ایک دوسرے سے اس طرح ملا دیئے گئے ہیں کہ چار دیواری سمیت ہر چار ستونوں کے بیچ میں ایک گنبد بنا ہے اس طرح سے چھت میں ۲۷ گنبد ہیں جو کھلے ہوئے کنول کی شکل کے ہیں۔ محراب کی سیدھ میں بڑا گنبد کرنیل

مہان سنگھ نے ۱۸۴۳ء میں مسمار کرایا۔ مرمت کے بعد یہ گنبد باقی ۲۶ گنبدوں جیسا خوبصورت نہیں بن پایا ہے۔

گنبدوں پر پیپر ماشی کی گئی تھی۔ چھت ٹپکنے سے یہ نقاشی اُتر گئی تھی۔ اس وقت ان پر بھی لپائی کی گئی ہے اور چھت کے اوپر بھی سیمنٹ کیا گیا ہے۔ چھت کے دامن کے ذرا نیچے مسجد کے اردگرد دیوری پتھروں کا چھجا سا ہے اور چھت کے دامن میں چاروں اطراف گویے اُبھارے گئے ہیں جن کے اردگرد کنول کی پتیوں کی نقاشی کی گئی ہے۔ ایسی نقاشی مسجد کے سامنے والی دیوار پر بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ قبلہ کی سمت (برلب سڑک) جو دکانیں بنی ہیں اُن میں آگ لگنے کے باعث اس طرح کے پتھر (آگ کی گرمی کے باعث) ناہموار ہو گئے ہیں۔

پتھر مسجد کے صحن میں دیوری پتھر اس طرح بچھائے گئے تھے کہ سارا صحن ایک ہی پتھر جیسا نظر آتا تھا۔ صحن کا فرش بھی مہان سنگھ نے ہی اُڑوالیا ہے اور وہاں سے نکالے گئے پتھر اُسی کی نگرانی میں بسنت باغ اور شیر گڈھی کے گھاٹوں میں لگائے گئے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے مسجد کی کئی جگہوں پر مرمت کی ہے اور محفوظ رکھنے کی خاطر اس کی دوا پاشی بھی کی ہے۔

فاضل خان کے وقت (۱۷۰۴-۱۶۹۶ء) میں اس مسجد کی تجدید کی گئی اور اس کے ساتھ ایک حمام اور درسگاہ بھی تعمیر کئے گئے۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں مسجد غیر آباد نہیں تھی۔ ۱۷۵۴ء کے قحط میں کشمیر کے

گورنر سکھ جیون نے مسجد میں شالی جمع کی اور اس طرح بہت عرصہ تک اسے بطور گودام استعمال میں لایا گیا۔ میر ہزار خان کے وقت میں ۱۷۹۳ء میں اس مسجد کی دوبارہ تجدید کی گئی۔ اس کا مادۂ تاریخ مندرجہ ذیل اشعار سے نکلتا ہے۔

شکر حق کر دُعای اہلِ یقین	باز آباد گشت خانہ دین
کرد سردار خط میر ہزار	مسجدِ نوبنا بصد تزئین
اختر و نقشِ او فروزان باد	تابود برفلک مہ و پروین
این چُنین مسجد از بلندئ قدار	آسمانی بُود بروئے زمین
عاقبت روسیاہ ملعون شُد	ہر کہ اوغلہ می نہاد دریں
خبر از ہاتفی پُر سیدم	تا کُند سالِ آں مرا تلقین
ہاتفی گفت ''عہدِ میر ہزار''	نوشُد آباد مسجدِ سنگین
۱۲۰۸ھ	۱۷۹۳ء

یہ اشعار اُس کتبے پر کندہ کئے گئے ہیں جو مسجد کے صدر دروازے کی دہلیز کے اوپر نصب کیا گیا ہے۔

اس طرح سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مسجد نئے سرے سے آباد کی گئی۔ اس کے بعد کب سے اس میں نماز پڑھنے سے روکا گیا، اس بات کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ یہ بات مسلمہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں یہ مسجد لوگوں کے مطالبے پر مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں کھول دی گئی۔

کشمیر کی پہلی اسلامی دانش گاہ

کشمیر اور کشمیریوں پر حضرت شاہ ہمدانؒ کی عنایات اس درجہ روشن ہیں کہ ہم تو کیا ہماری آنے والی نسلیں بھی انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ آپ کے رفقاء نے بھی یہاں اسلامی تعلیم پھیلائی اور مذہبی، ثقافتی زندگی کو ایک نیا رُخ عنایت کیا۔ دین کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کو حضرت امیرؒ اور ان کے رفقاء نے وسط ایشیائی اور ایرانی علوم وفنون سے بھی روشناس کیا۔ زبان، رسم و رواج، لباس، رہن سہن یہاں تک کہ پکوان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور کشمیر ایران صغیر کہلایا۔ کشمیریوں نے بجا طور پر اپنے اس محسن کو امیر کبیر شاہ ہمدانؒ علی ثانی جیسے القاب سے بھی یاد کیا اور کرتے رہیں گے۔ حضرت امیر کبیر علی ثانی میر سید علی ہمدانیؒ ۱۳۱۴ء کو ایران کے مشہور شہر ہمدان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ اور آپ کے والد ماجد کا نام سید شہاب الدین تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب شاہ ولایت حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ حضرت امیر نے بہت ہی چھوٹی عمر میں سارا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اُس کے بعد آپ نے تصوف اور معرفت کی تعلیم اپنے ماموں سید علاالدین سمنانی سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ شیخ مشرف الدین کے مُرید ہوئے۔ آپ نے ۲۱ سال کی عمر میں دنیا کا سفر شروع کیا۔

آپ ۱۳۷۲ء میں سلطان شہاب الدین کے عہد سلطنت میں کشمیر تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ ۷۰۰ سید تھے چار ماہ کے قیام کے بعد اس وادی سے تشریف لے گئے اور ادائے حج کے بعد دوبارہ کشمیر تشریف لائے۔ اس وقت سلطان شہاب الدین کے بھائی سلطان قطب الدین کی حکومت تھی اس دفعہ آپ کا قیام یہاں اڑھائی برس تک رہا اور لداخ کے راستے آپ ترکستان روانہ ہوگئے۔ تیسری دفعہ آپ ۱۳۸۳ء میں کشمیر تشریف لائے۔ ناسازی طبیعت کے سبب آپ بہ طرف پکھلی روانہ ہوئے یہاں کچھ عرصہ مقیم رہنے کے بعد آپ ۱۳۸۴ء میں اس دنیا فانی سے رحلت کر گئے۔

آپ کے بہت سے رفقاء آپ کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے تھے۔ ان میں قاضی حسین، سید جلال الدین، سید حیدر اور سید پیر حاجی محمد صاحب قابل ذکر ہیں۔ پیر حاجی محمد حضرت شاہ ہمدانؒ کے صاحب کمال رفیقوں میں سے تھے اور حافظ قرآن تھے ان کے ہمراہ سالکانِ راہِ خدا کے قافلے کے ساتھ کشمیر میں اللہ کا نام بلند کرنے کی غرض سے وارِد ہوئے پیر حاجی محمد قاریؒ گویا حاجی محمد قاریؒ کے مختصر نام سے جانے جاتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی کمالات عالیہ کے مالک تھے دونوں طریقوں کے بلند مراتب آپ میں جمع تھے۔ حافظ قرآن تھے اور ساتوں قراتوں میں تلاوت کرتے تھے۔ آپ کا علاقہ تبلیغ وتدریس حضرت شاہ ہمدانؒ نے شہر سرینگر ہی مقرر فرمایا۔ سرینگر میں آپ کو حضرت شاہ ہمدانؒ نے پادشاہِ وقت سلطان قطب الدین شاہ میری کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے بھی متعین فرمایا۔ سلطان موصوف نے آپ کے

خادموں کے لئے ایک الگ خانقاہ تعمیر کی اور اس کے اخراجات کیلئے کشمیر کے دو پرگنوں کی آمدنی وقف کردی۔ یہ خانقاہ صراف کدل کے نزدیک تھی۔ جو کشمیر میں پہلی اسلامی دانش گاہ مانی جاتی ہے۔ آپ اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ حضرت پیر حاجی محمد قاریؒ نے انتہائی جوش وخروش کے ساتھ وادی بھر میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی قیادت میں شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور دینِ اسلام کے فرمودات واحکام اور دینی علوم کو جاری کرنے میں حصہ لیا بالخصوص جب حضرت شاہ ہمدانؒ کی طرف سے مستقل طور پر انہیں کشمیر میں رہنے کی اجازت ملی تو آپ نے سرینگر میں مسجدوں کو تعمیر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

پیر حاجی محمد قاریؒ نے سر درد کی تکلیف کی وجہ سے ۸ ماہ رجب ۷۹۲ھ کو انتقال فرمایا۔ آپ کا نماز جنازہ موجودہ خانقاہِ معلیٰ کے صحن میں پڑھا گیا۔ محلّہ صراف کدل کے علاقہ ملہ پورہ نامی محلّہ میں آپ مدفون ہیں۔ آپ کا روضہ شریف محلِ فیوض وبرکات ہے اور خاصا معروف ہے۔ اسی روضہ شریف کے متصل سلطان قطب الدین شاہ میری (وفات ۷۹۳ھ) کو بھی دفن کردیا گیا۔ سلطان قطب الدین ۱۳۷۳ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھا اور آپ نے ۱۳۸۹ء میں انتقال کیا۔ اس قبر کے ساتھ ہی مغرب میں سلطان بڈشاہ کی ایک بیگم کی قبر ہے اس پر حرم سلطان زین العابدین لکھا ہے۔ اس قبر اور سلطان قطب الدین کہ قبر میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ اور یہ مقبرہ اس وقت خستہ حالت میں ہے اس کے ایک حصہ پر ایک بیکری دکان قائم ہوئی ہے۔

جناب حضرت امیر کبیرؒ کے حکم اور سلطان قطب الدین کے مشورے سے آپ اس سرزمین کشمیر میں لوگوں کی تعلیم وتربیت میں مصروف ہوگئے۔ سلطان قطب الدین کو شاہ ہمدانؒ سے بڑی عقیدت تھی آپ نے اُن کی شان میں ایک منقبت تحریر کی ہے۔

جانم فِدا بر قدمِ خاک تو بادا یا امیرؒ
روحم فِدا برشرفِ نامِ تو بادا یا امیر
از آمدنت مشرف بہ اسلام گشتہ ام
اِسم فِدا بر آمدنِ تو بادا یا امیرؒ
خواہم کہ روزِ حشر شفاعت مراکنی
ہر چار عُنصر فدای اسم تو بادا یا امیرؒ
قطبی اگر چہ کرد گناہاں زحد و محد
آخر مرا نصیب شفاعتِ تو بادا یا امیرؒ

سلطان کی ہی کوششوں سے پہلی اسلامی دانش گاہ ترقی کی منزلوں سے ہمکنار ہوگئی۔آپ کے اور پیر حاجی محمد کی بدولت کشمیر میں قرآن وسنت اور حدیث کی تعلیم عام ہوئی اور آپ ہی کی بدولت سرینگر میں ایک عالی شان دانش گاہ ۱۸۱۹ء تک قائم تھی اور سکھوں کے دورِ حکومت میں اس کو بند کیا گیا۔اس ادارے میں بڑے بڑے عالم درس دیتے تھے۔جن میں مشہور عالم ملا جوہر نانت بھی شامل تھے آپ ۱۵۴۰ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے اور اس دانش گاہ کی ترقی کے لئے ناقابل فراموش کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

آپ نے عمر کا بیشتر حصہ علم حاصل کرنے میں صرف کیا۔ اُس زمانے میں حج
کی سعادت حاصل کرنے کے لئے مکہ معظمّہ اور مدینہ منور تشریف لے گئے۔
اس سفر کے دوران جہاں کہیں بھی کسی بزرگ کا نام سنتے اُن سے ملاقات
کرنے کا فیض حاصل کرتے۔ آپ مخدوم صاحبؒ کی خدمت میں بھی حاضر
ہوئے تھے۔ اور ان کو محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ آپ ۱۶۱۶ء میں
انتقال کر گئے اور حول میں آخون ملا حسینؒ کے مقبرہ میں سپرد خاک کئے
گئے۔ اس ادارہ کے مشہور اساتذہ میں خاص طور پر ملا محسن فانی قابل ذکر ہیں
وہ ایک مشہور فلاسفر اور عالم تھے اس مایہ ناز سپوت پر کشمیر کو فخر ہے آپ نے
بہت سارے ممالک کی سیاحت کی۔ آپ کی کتاب دبستان آج بھی مشہور
ہے۔ مغل شہزادہ داراشکوہ کے ساتھ آپ کے اچھے تعلقات تھے۔ شیخ رحمت
اللہ تاربلی، ملا طاہر غنی عشائی، محمد زمان اور ملا محمد بھی اس ادارے کے درخشندہ
ستارے رہے ہیں۔ یہاں سلطان قطب الدین نے طلباء کے لئے مفت
رہائش اور کھانے کا انتظام کیا تھا۔ اس کے بعد بڈشاہ نے جو سلطان قطب
الدین کا پوتا تھا ایک اور دانش گاہ نوشہرہ میں قائم کی۔ اس کے علاوہ سلطان
قطب الدین کے وقت میں جمال الدین نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جہاں
پر طالب علم قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور سلطان قطب
الدین کے کہنے پر کشمیر میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے۔ اس مدرسہ کے
کھنڈرات آج بھی سرینگر کے عشائی کوچہ فتح کدل میں موجود ہیں۔

قطب الدین کے فرزند سلطان سکندر نے بھی اس ادارہ کو خوب ترقی

دی ۔ انہوں نے مذہبی عالم خراسان اور ایران سے کشمیر لائے ۔ ان میں قاضی میر محمد علی بخاری قابل ذکر ہیں ۔ جو ادارہ کے سربراہ رہ چکے ہیں ۔ اور اساتذہ میں ملا محمد افضل بخاری حدیث پڑھاتے تھے ۔ ملا محمد یوسف فلسفہ پڑھاتے تھے ۔ ملا صدر الدین ریاضی پڑھاتے تھے اس کے بعد بڈشاہ کا سنہری زمانہ آتا ہے آپ نے ایک عالیشان یونیورسٹی قائم کی ۔ جس کی سربراہی ایک بہت بڑے عالم ملا کبیر نحوی نے کی ۔ آپ کو شیخ الاسلام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ۔ آپ کے ماتحت بڑے قابل اساتذہ کام کرتے تھے جن میں سے ملا احمد کشمیری ، ملا حافظ بغدادی ، ملا بخاری ، ملا جمال الدین اور ملا یوسف قابل ذکر ہیں ۔ یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں ترجمہ کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا ۔ یہاں سنسکرت اور شاردا کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا ۔ بڈشاہ ہندو عالموں اور تاریخ دانوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ بادشاہ نے ایک ایسا قطب خانہ بنایا جو اُس کے عہد میں کسی اور کے پاس نہ تھا ۔ !!!

مسجد مُلّا آخون شاہ

اسے مسجد مُلّا آخون شاہ اور مسجد داراشکوہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سرینگر میں قلعہ ہاری پربت کے جنوب میں دامن کوہ میں واقع ہے۔ مسجد کے اوپری حصّے میں حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کا روضہ ہے۔ یہ مسجد ۴۰-۱۶۳۹ء میں مغل شہزادہ داراشکوہ نے اپنے اُستاد ملا آخون شاہ کے لئے بنوائی اور اس کے قریب ہی ایک حمام بھی تعمیر کروایا۔ مسجد کے آس پاس زائرین کے لئے دو الگ سرائیں بھی بنوائی گئیں۔ مسجد کی دیواریں پختہ اینٹوں کی بنی ہیں جن کے اوپر سنگِ بلّور کی نقاشی کی گئی اور اوپر چکنی سلیں ہیں۔ یہ سلیں اندر اور باہر چاروں طرف دیواروں کے ساتھ جوڑی گئی ہیں۔

مسجد کے جنوب میں ایک اور مشرق میں دوسرا دروازہ ہے۔ جنوب کی طرف سے اس کے باہر پانچ ڈوری دار محرابیں ہیں۔ کناروں کی چار محرابوں میں پتھروں کے بنے دو فٹ مربع جالی دار پنجرے لگے ہیں اور محرابوں کے اوپر دس حصوں میں منقسم ملا آخون شاہ کے نام چند استقبالیہ اشعار کندہ ہیں۔

مسجد کے اندر مغرب کی طرف منبر ہے اور اس کی سیدھ میں اُوپر کی جانب سنگِ بلّور کا بنا ہوا کنول کی شکل کا کلش ہے۔ ایسا ہی ایک کلش ڈیوڑھی کے اوپری سرے پر بھی چڑھایا گیا ہے۔ اس کے تین اطراف غلام گردش

ہے۔ غلام گردش کے ساتھ قبلے کی سمت تین محرابیں ہیں جن پر بیل بوٹے بنائے گئے ہیں، اس کے جنوب میں پانچ اور مشرق میں اندر کی جانب تین محرابیں ہیں، شمال میں چار چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں جن میں شاید اعتکاف کے لئے بیٹھنے والے رہتے تھے۔ یہ مسجد ہاری پربت کے ڈھلوان کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ کیونکہ مسجد کے مشرق میں پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی سرائے ہے جو ڈھلوان کے اِردگرد بنائی گئی ہے۔

اس سرائے میں اوپر سے نیچے تک محراب دار غلام گردش ہے جس کی دیواروں پر نقاشی کی گئی ہے۔ آج کل یہ نقاشی مٹ گئی ہے اور سرائے کی دیواریں چاروں طرف خستہ ہوگئیں ہیں۔ مسجد سے قریب پانچ سو گز کی دُوری پر بڑ شاہی اینٹوں کا بنا ایک حمام ہے جس میں آٹھ غسل خانے اور ایک چھوٹی مسجد ہے۔ مسجد کے عین بیچ میں دیوری پتھروں کا ۳۶ انچ کا گھیرا اور ۱۰ فٹ اونچا ایک آراسی ستون ہے جس پر اوپر سے نیچے تک دُوریاں اُبھاری گئی ہیں اور قبلے کی جانب محراب کے ساتھ پتھروں کا بنا منبر ہے جو اب بالکل خستہ ہو چکا ہے۔ حمام کے غسل خانوں کی چھتیں مسطح نہیں بلکہ کمانی طرز کی ہیں۔ مسجد اور حمام کے درمیان آج بھی ایک پختہ تالاب کے آثار موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی قسم کا نہایت ہی خوبصورت تالاب تھا اور اس میں ایرانی طرز کے بے رہٹ کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یہ مسجد آج کل بے چراغ ہے۔ حمام اور مسجد کا مادۂ تاریخ ایک کتبہ پر کندہ ہے۔ اس مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔

یک جائے وضو آمد ویک جائے نماز

۱۰۴۹ھ

<u>مُلّا آخون شاہ:۔</u>

شاہ محمد نام اور وطن بدخشان تھا جوانی کے جوبن میں علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ اور ہمعصروں پر فوقیت پائی۔ شاہ جہاں کے بیٹوں میں اگر چہ شہزادہ داراشکوہ ہندوستان کا حکمران نہ بن سکا لیکن وہ صاحب سیف اور صاحب قلم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ تصوف کی آبیاری میں گذارا۔ وہ عالم اور مفکر بھی تھا۔ شاعر اور صوفی بھی تھا۔ اور صوفیوں اور درویشوں کی محفلوں میں اپنا زیادہ تر وقت گذارتا تھا۔ کیونکہ ایسی محفلوں میں اسے اپنے دل کو سکون ملتا تھا۔ شہزادہ مُلّا شاہ کا مُرید بھی تھا۔ شاہ جہاں حضرت میاں میر لاہوری سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ داراشکوہ کو بھی اپنے والدِ محترم کے ساتھ ان کی درگاہ میں حاضر ہونے کا موقع میسّر ہوا اور داراشکوہ حضرت میاں میر کے روحانی کمالات سے متاثر ہوئے۔ اور لاہور ہی میں حضرت میاں میر کے پاس مُلّا شاہ بدخشی سے ملاقات ہوئی۔ جب داراشکوہ نے حضرت میاں میر کا مُرید ہونا چاہا تو حضرت کا وصال ہوگیا۔ تو داراشکوہ کو مُرشد کی تلاش ہونے لگی کیونکہ وہ مکمل طور پر روحانیت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ اسی دوران داراشکوہ بہت سے صوفیوں سے ملا۔ آخر میں ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر ۱۶۳۹ء میں بیعت کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ملا شاہ بدخشی چونکہ حضرت میاں میر لاہوری کے مُرید اور قادری سلسلہ سے وابستہ تھے۔

اس لئے داراشکوہ بھی قادری کہلائے جانے لگے۔

شہزادی جہاں آراء: ۱۵۹۲-۱۶۶۶ :-

شہزادی جہاں آرا شاہجہاں کی دختر اور داراشکوہ اورنگ زیب عالمگیر کی ہمشیرہ تھی آپ بھی مُلّا آخون شاہ سے کافی متاثر تھی اور اپنے مُرشد مُلّا آخون پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ شہزادی کو تصوف اور صوفیوں سے خاص لگاؤ تھا۔ اور اپنے وقت کے ولیوں اور صوفیوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ شہزادی کئی بار کشمیر میں مُلّا آخون کے پاس کوہ ماراں تشریف لائیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا شہزادی جہاں آراء دہلی میں آستانہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مقبرے کے باہر سپرد خاک ہے۔ آپ کے مقبرہ کے اوپر کوئی گنبد وغیرہ نہیں ہے۔ آپ نے ۱۶۶۶ء میں وفات پائی۔

داراشکوہ کے پیر طریقت مُلّا شاہ بدخشی بدخشاں کے ایک گاؤں ارکسا میں پیدا ہوئے آپ کا اصلی نام شاہ محمد تھا۔ لیکن تاریخ میں آپ آخون مُلّا شاہ بدخشی کے نام سے مشہور ہیں آپ نے ۱۶۱۴ء میں بدخشاں سے لاہور ہجرت کی۔ اور یہاں پر حضرت میاں میر لاہوری کے مُرید ہو گئے۔ آپ نے تیس سال تک حضرت میاں میر لاہوری کی خدمت کی۔ اور ریاضت اور عبادت میں مشغول رہے۔ حضرت مُلّا شاہ اپنے مُرشد حضرت میاں میر کے افضل مُریدوں میں سے تھے جب حضرت میاں میر دنیا سے رخصت ہونے والے تھے۔ تو انہوں نے حضرت مُلّا شاہ بدخشی کو اپنا جانشین بنایا۔

جب آپ ہر طرح سے کامل ہو گئے پھر اپنے مُرشد کی اجازت سے

کشمیر تشریف فرما ہوئے۔ کشمیر کی سیاحت کے دوران آپ کوہ ماراں کے دامن میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں پر آپ کے لئے شہزادہ داراشکوہ نے ایک خوبصورت خانقاہ اور مسجد تعمیر کی۔ آپ کی زیر تربیت جتنے بھی حضرات آئے وہ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے یہاں پر آپ وعظ بھی فرماتے تھے۔

داراشکوہ اپنی اہلیہ نادرہ بیگم کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ملاشاہ توحید اور معرفت کے بڑے شہنشاہ اور تاجدار تھے۔ شاہجہاں کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں اس وقت دو بادشاہ ہیں ایک مُلاّ شاہ اور دوسرا میں۔ شاہ صاحب کی خدمت میں جو بھی آتا تھا چاہئے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا تھا عارف کامل بن جاتا تھا۔

مزید داراشکوہ نے اپنے مُرشد کے لئے زبرون پہاڑ کے ڈھلوان پر ایک خانقاہ تعمیر کروائی جس کو شہزادہ مذکورہ کی بیگم کے نام پر پری محل پڑ گیا۔ اس خانقاہ میں علمی محفلیں ہوا کرتی تھیں جن میں زیادہ تر تصوف اور توحید کے بارے میں بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ مزید اسے علم نجوم کی ایک رسید گاہ کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ اور یہاں پر ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کیا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں مُلاّ شاہ کے بھائی اور رشتہ دار بدخشاں سے چل کر آپ کو ڈھونڈتے ہوئے کشمیر آئے۔ اور اتفاق سے آپ سے ملاقات ہوئی۔ پھر آپ سے آپ کے نام وطن کے بارے میں دریافت کیا آپ نے جواب دیا کہ میں ہی شاہ محمد ہوں جسے اب لوگ یہاں مُلاّ شاہ کہتے ہیں) چنانچہ آپ کے رشتہ دار بھی

یہاں سکونت پذیر ہوئے۔
مُلّا شاہ عمر بھرا کیلے اور تنہا رہے کبھی شادی نہ کی۔ کشمیر میں کئی لوگوں نے کفر ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں مولانا شاہ گدا، ملا مسکین مغل، محمد امین کشمیری، خواجہ حسن بچہ، حاجی عبدالرحیم قادری وغیرہ تھے۔ آپ دن ورات عبادت الٰہی میں گذارتے تھے۔ حالانکہ تیس ۳۰ سال تک ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوئے۔ آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ دنیاوی جاہ وحشمت سے آپ کو نفرت تھی۔ بڑے بڑے امیر، فاضل، مشائخ اور نامور لوگ ان کی خدمت میں آ کر ظاہری اور باطنی فیض پاتے رہے۔ شاعر تھے اور خداداد موزون طبیعت کے مالک تھے۔ تقریباً ایک لاکھ شعروں کا دیوان ان کی تصنیف ہے۔ جس کے شعر معرفت، حقیقت اور وحدانیت کے مخزن ہیں۔ ایک دن شاہجہاں نے موسیٰ خان صدر کو امتحان کی غرض سے ان کے پاس بھیجا۔ آخون نے کوئی تعظیم نہ کی۔ خان نے کہا میں موسیٰؑ خان ہوں۔ آخون نے جواب دیا۔ ہم محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ موسیٰؑ اور عیسویٰؑ کو نہیں جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آخون ہمیشہ توحید کے سمندر میں غوطہ زن رہتے تھے۔ اور ان کے اندرون حال کو بیرونی کثرت اور نمود نمائش سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں پہنچتی تھی۔ جب عالمگیر نے داراشکوہ کو قتل کرایا۔ اور اپنی بادشاہیت کا اعلان کیا۔ حضرت آخون کو بھی طلب کرایا۔ حضرت آخون لاہور پہنچے اور وہیں اُمید وبیم کی حالت میں کئی سال گذارے۔ فرماتے تھے شکر ہے خدا کا میرا اوّل اور میرا آخر دونوں

مسافرت اور غربت میں گذرے جب اس دنیا سے کوچ کرنے کے دن
نزدیک آ گئے۔ تو ایک دن پالکی میں سوار ہو کر نکلے اور اپنے مُرشد بزرگوار کی
ہمسائیگی میں زمین خرید کر وصیت کی کہ مجھے اس زمین میں دفن کیا جائے۔
پھر دن بدن کمزور ہوتے گئے۔ اور رحلت کی رات کو میاں مُلّا محترم اور میاں
اسماعیل لاہوری کو اپنے مرنے کی خبر دی۔ اور تجہیز و تکفین کی تاکید کی۔ یہ
دونوں آخون کے سرہانے بیٹھے اور آخون نے اپنی وفات کی تاریخ خود کہہ کر
زبان بند کی۔ داد در توحید مُلّا شاہ جان ۱۰۷۲ھ یہ رُباعی ان کی طبع زاد ہے۔
وفات پا کر آپ کو اپنے مُرشد کے مزار کے ساتھ ہی آپ کی وصیت کے
مطابق سپرد خاک کیا گیا۔

مفتی غلام سرور صاحب نے یہ تاریخ وفات دی ہے۔

شیخ حق آگاہ عالیجاہ مُلّا شاہ دین
ہر کہ روئے روشن اودید رشک ماہ گفت
شد چو از دنیا سوئے جنت خرد تاریخ او
زاہد پنجاب قطب وقت مُلّا شاہ گفت

بابا داؤد ریشیؒ (بتہ مالو)

سرزمین کشمیر میں سلسلہ ریشی کشمیر کا خالص اپنا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ کشمیر کے ماضی اور اس کے تمدن کی گہری چھاپ ہے۔ یہ اس وقت بھی رائج تھا جب جنت کشمیر نور اِسلام سے ابھی منور نہ ہوئی تھی ۔ یوں تو کشمیر کے ریشیاں کرام کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تاہم شیخ داؤد ریشیؒ المعروف بتہ مول صاحب پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ بتہ مول صاحب وڈیارن پل کے قریب پانپور میں پیدا ہوئے ۔شیخ شنگلی بٹ کے تولد ہوئے ۔ آپ کے سال ولادت کے متعلق مورخ خاموش ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ آغاز میں آپ حد سے زیادہ گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

شروع شروع میں آپ تھنہ منڈی راجوری سے نمک لا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ قدیم زمانہ میں تھنہ منڈی نمک کی منڈی کی حیثیت سے مشہور تھی ۔ مگر اب یہاں سوائے چند دکانوں کے اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ نمک کی تجارت کے علاوہ آپ کاشتکاری اور زراعت کا کام بھی کرتے تھے ۔ یہ زراعت قصبہ پانپور میں تھی جہاں آپ کی آبائی زمین تھی شیخ داؤد کا عہد روحانیت اور خدا طلبی کا عہد تھا۔ صوفیوں اور خدا دوستوں کی کثرت تھی اس ماحول میں بتہ مول صاحب الگ تھلگ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے اپنے دور

کے مشہور بزرگ خواجہ یوسف کانجو کے شاگرد ہوئے۔ خواجہ یوسف کانجو اُس وقت خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اس کے بعد آپ کے تعلقات ایک اور بزرگ جناب اللہ داد ریشی سے پیدا ہوئے۔ جن کے بابا زین الدین ریشی سے گہرے تعلقات تھے۔ بتہ مول صاحب اگر چہ علوم ظاہر سے ناواقف تھے۔ لیکن علم ترقی (خدائی علم) بہت کچھ پالیا تھا۔

عابد، عارف اور ریشی ہونے کے باعث درویشی میں قدم رکھ دیا تھا۔ کھیتی باڑی میں مصروف ہونے کے باوجود روزہ دار ہوتے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ اسی لئے بتہ مول کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ایک سال کشمیر میں خشک سالی رونما ہوگئیں۔ لوگ بھوک سے پریشان تھے۔ اس طرح آپ مٹی کے برتن میں پتلا چاول تیار کیا کرتے جس کو کشمیر میں ''اُوگرہ'' کہتے ہیں۔ جو وہ کھیت کے راستے پر صبح شام سے خاص و عام کو دیتے تھے۔ لوگوں کو مفت کھانا تقسیم کرنے کے باعث آپ بتہ مول سے بٹہ مالو ہوگئے۔ آپ کو بتہ مول کہے جانے کی ایک اور وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ کشمیر میں بتہ مالو صاحب کے مُریدوں میں بڑی تعداد کشمیری پنڈتوں کی بھی تھی۔ اس لئے بتہ مول کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آخر کار آپ ۱۶۶۰ء میں اپنی قیام گاہ یعنی موجودہ بٹہ مالو میں سپرد خاک کئے گئے۔ بعد از مرگ آپ کی روحانیت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ علاقہ آپ کے نام پر بٹہ مالو مشہور ہے۔ بٹہ مالو صاحب روشن ضمیر تھے۔ ان کے بہت سارے خلیفہ اور شاگرد تھے۔ جن میں خاص طور پر۔ روپہ ریشی، ہمت ریشی، شیخ نور محمد پروانہ وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔

یہ آستانہ بٹہ مالو صاحب امیرا کدل سرینگر سے بطرف جنوب ۲ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے یہ آستان ایک منزل ہے۔ اس کی چھت جو کشمیری میں بام کہلاتی ہے چینی بُدھ وہاروں کی طرز پر بنی ہے۔ آستان کا مینار عمودی ہے اور خالص چوبی ہے۔ جس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی گیلریاں ہیں مینار کی بلندی تقریباً ایک سو فٹ ہے۔ آستان کے چار دیواری کے عین وسط میں ایک گز بلند بتہ مالو صاحب کی ضریح مبارک ہے یہ ضریح سبز چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ آستان کا دروازہ لکڑی کا ہے جس پر یہ تاریخی منظوم قطعہ درج ہے۔

سال تاریخ وتش ہاتفی

داد اہامی مرا از بہر آن

شیخ مومن باسر اخلاص گفت

بٹہ مالو کردہ ماو ادر جنان

آستان بٹہ مالو کی تعمیر کم بیش ایک سو سال پہلے ہوئی ہے ایک شخص جو بٹہ مالو صاحب کا معتقد تھا اور نام عمر خان تھا نے تعمیر کیا۔ یہ شخص آستانہ کے احاطہ میں مدفون ہے۔ پچاس فٹ کے فاصلے پر بطرف مغرب خانقاہ بتہ مول کا لنگر خانہ ہے۔ کسی وقت یہ محتاجوں کے لئے بطور لنگر خانہ استعمال ہوتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اس عمارت کی اہمیت ضرور ہے۔ خیال ہے کہ یہ لنگر خانہ خود حضرت بٹہ مالو صاحب کے عہد کا ہے۔ آستان بٹہ مالو چرار شریف کے

آستان کے نمونہ پر اینٹوں اور لکڑی سے اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ ایک راد اینٹوں کا اور ان کے اوپر ایک راد دوفٹ لمبی لکڑی کا ہے۔ کشمیر میں یہ طرز تعمیر قبل از اسلام رائج تھا۔ ۱۸۹۰ء سے پہلے بٹہ مالو سرینگر کا ایک مضافاتی گاؤں تھا۔ اور اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ شمال مغرب کی جانب ایک بڑا رقبہ تھا جہاں ڈوگرہ حکمران جموں کشمیر کے سپاہیوں کو ٹریننگ دیتے تھے۔

سید محمد امین اُویسیؒ (ویسی صاحب)

سید محمد امین اُویسیؒ میر سید حسین منطقیؒ کے دوسرے فرزند تھے۔ پہلے فرزند میر سید حسن منطقیؒ جن کا مزار بمقام اونتی پورہ کشمیر میں شاہراہ عام پر واقع ہے۔ سید محمد امینؒ کا حقیقی نام اگر چہ یہی ہے۔ مگر آپ عوام میں اویسی صاحبؒ کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اویسی صاحب کے خاندان کا دوسرا لقب منطقی بھی ہے۔ کیونکہ آپ کے والد بزرگوار اور میر سید حسن منطقیؒ (Logic) میں وقت کے ماہر بزرگ مانے جاتے تھے۔

روایت ہے کہ میر سید محمدؒ کی دختر جو ویسی صاحب کے چاچا تھے سلطان بڈشاہ کے عقد میں تھی۔ سے سلطان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لئے اس نے اویسی صاحب کے والد میر سید حسینؒ سے خواہش فرزند ظاہر کی۔ میر سید حسینؒ نے اِسی وقت اپنی آستین سے ایک نوزائد بچہ نکال کر سلطان کی تحویل میں دے دیا اور ساتھ ہی ہدایت کی۔ اس کا نام محمد امینؒ رکھا جائے یہ فرزند جو نوزائد تھا۔ شاہی محل میں رہنے لگا۔ اور اس طرح سید محمد حسینؒ نے اپنا بچہ سلطان بڈشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اویسی صاحبؒ نے قرآن وسنت کی تعلیم بابا ادہم سے حاصل کی۔ حاجی ادہم افغانستان کے باشندے تھے۔ طریقت ومعرفت میں حضرت اُویسیؒ سید ہلال نقشبندیؒ کے شاگرد

تھے۔ سید ہلال نقشبندیؒ خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ کے مُرید تھے اور امیر تیمور کے حملوں کے باعث کشمیر آ گئے تھے۔ بعد از اں سید محمد امین سلسلہ اُویسی میں داخل ہو گئے۔ اویس قرنی محبت رسول میں اس قدر غرق تھے کہ اپنا وجود تک فنا کر دیا تھا۔ اس مناسبت سے سید محمد امینؒ نے اُویسی تخلص رکھا تھا۔ سلطان بڈشاہ حضرت اویسی صاحبؒ کا زبردست معتقد تھا آپ نے اُویسی صاحب کے لئے اشم (سونہ واری) میں آپ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کی جہاں پر آپ عبادت کرتے تھے اس سے قبل آپ کوہ ماراں (ہاری پربت) کے دامن میں گوشہ نشین ہوئے تھے یہاں آپ نے ایک باغ بھی لگایا تھا جو انتہائی دلکش تھا۔

روایت ہے کہ بڈشاہ کی یہ خواہش تھی کہ آپ کو اپنا خلیفہ یا جانشین مقرر کرے اس سلسلے میں سلطان نے اکثر امور سلطنت آپ کی نگرانی اور تحویل میں دیا۔ لیکن سید محمد امین کو ان دنیاوی چیزوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ عشق الٰہی میں محو تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جھیل وُلر میں جب زینہ لانک پایہ تکمیل کو پہنچا۔ تب بڈشاہ نے ایک جشن منایا اور سبھی اراکین حکومت جمع کئے۔ لیکن اس وقت محمد امین اُویسی نے جھیل ولر میں چھلانگ لگائی۔ اور خوشی غم میں تبدیل ہوگئی ملاحوں نے وُلر میں چھلانگیں لگا دیں۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور سب نا اُمیدی اور غم کی حالت میں سرینگر کی طرف روانہ ہوئے۔ بڈشاہ جب صفا پور عشم کے نزدیک پہنچا تو محمد امین اُویسی کو ایک درخت کے نزدیک قبلہ کی طرف عبادت کرتے دیکھا۔ سلطان بہت خوش ہوا

اور خدا کا شکر بجالایا۔ اس کے بعد سلطان ۔
کی اجازت دی۔ آپ کے لئے عالی کدل
خانقاہ تعمیر کرائی۔ اب اس کو خانقاہ میر اویسؒ
جاتا ہے۔

اسی خانقاہ میں آپ بعد شہادت سپر
کشمیر سادات کے خلاف ہوگئے۔ ان کے خ
کے سیاہ سفید کے مالک بن گئے تھے۔ ا
سادات کے بہت سارے آدمی شہید کر دیئے
اُویسی صاحبؒ بھی شامل ہیں اُس وقت آ
ساتھ نوشہرہ سرینگر میں مقیم تھے۔ تاریخ دانو
محلّہ عالی کدل کے نزدیک ملچھر کی خانقاہ میں
بخود رہ گئے ۔ اور پھر اُسی خانقاہ میں آپ
۱۴۸۴ء سپرد خاک کیا گیا۔ شہید کشمیر تاریخ
ایک سیاہ پتھر پر مزار کی بیرونی دیوار پر جلی ح
امین اُویسیؒ خدا دوست ہونے کے علاوہ با
کے کلام میں تصوف عرفان اور غزلیات میں
ہے۔ شہادت سے قبل آپ کی عبادت گاہ
حسب ذیل شعر خون آلودہ انگلیوں سے لکھ کر
سے جاملے۔

من فارغم ز مصلحت اہل روزگار
میدان یقین کہ کشتن من بود بے گناہ
اکنون بہاؤ نجو اِن پر مزار من
تاروئے ظالماں ستمگر شود سیاہ

پس میں اہل زمانہ کی مصلحت سے الگ تھلگ ہوں یقین سے جان لے کہ مجھے بے گناہ قتل کیا گیا۔اب آؤ اور میری قبر پر شعر پڑھ تا کہ ظلم پیشہ ظالموں کا مُنہ کالا ہو جائے۔

خانقاہ شاہ نیاز نقشبندیؒ

(خوشاہ صاحب)

نقشبندیہ صوفی سلسلہ کا ایک قدیم سلسلہ ہے اس سلسلہ کو حضرت خواجہ بہاؤالدین محمد نقشبند مشکل کشاؒ نے قبول عام بنا دیا آپ بخارا وسط ایشا میں ۱۳۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۹ء میں انتقال کر گئے۔ کشمیر میں اس سلسلہ کی بنیاد سید ہلالؒ نے ڈالی۔ جو یہاں سلطان سکندر کے عہد حکومت ۱۴۱۳-۱۳۸۹ء میں تشریف لائے۔ حضرت بلالؒ خواجہ بزرگؒ کے خلیفہ تھے۔ شاہ نیاز نقشبندیؒ۔ نقشبندی سلسلہ سے وابستہ تھے آپ کی خانقاہ سرینگر خانیار میں ہے۔ شاہ نیازؒ خواجہ سید عبدالرحیم کا دوسرا فرزند تھا۔ سید عبدالرحیم ترکستان تاشقند کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ یہاں سے لاہور تشریف لے گئے۔ پھر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اور خواجہ صاحب کچھ مدت جموں میں ٹھہرے۔ پھر خواجہ موسیٰ خان کی ملاقات کے لئے ترکستان روانہ ہوئے اور بہت مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ پھر مرشد کے فرمانے پر یارقند کے راستے سے کشمیر تشریف لائے۔ کچھ وقت بابا محمود جیؒ اور خواجہ کمال الدین نقشبندیؒ کے گھروں میں گذارا۔ یہاں پر مکانات اور

باغات بنوائے۔اور اسی خانقاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

شاہ نیاز نقشبندیؒ ان کا دوسرا فرزند تھا اور آپ کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے والد بزرگوار کی چھوڑی ہوئی جائیداد خرچ کر کے ۱۷۹۷ء میں یہ خانقاہ تعمیر کرائی۔خانقاہ میں ایک حمام، سرائے، مسافر خانہ اور درسگاہ بھی شامل ہیں۔جب اس خانقاہ کی تعمیر مکمل ہوئی شاہ نیاز نقشبندی نے زائرین کی سہولیت کے لئے آستانہ کے صحن کے درمیان دولت کول نامی ایک نہر نکالی وقت گذرنے کے ساتھ یہ نہر خشک ہوگئی۔

شاہ نیازؒ کی خدمت میں ترکستان سے اعلیٰ وفد یہاں پہنچا جس نے انہیں ترکستان آنے کی دعوت دی۔یہ وہ وقت تھا جب کشمیر میں سکھ حکمرانوں کا دور شروع ہوا تھا۔شاہ نیاز نقشبندیؒ بلند پایہ شاعر، عالم اور فاضل تھے انہوں نے فارسی زبان میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔جن میں چائے نامہ، دیوان نیاز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔آپ شریعت کے پابند اور پرہیز گار تھے اپنے والد سے تصوّف اور سلوک کے سبق سیکھے۔میاں ضیاء الدینؒ سے معرفت اور حقیقت کا سرمایہ جمع کیا۔عبدالغنی مرجان پوری سے احادیث نبویؐ کی سند حاصل کی۔شہر کے حاکم اور عالم ان کی عزت کیا کرتے تھے۔تین چار دفعہ آپ ترکستان کی سیاحت کو گئے۔وہاں کے بادشاہوں، امیروں اور دولت مندوں نے آپ کی قدم بوسی کی۔(۱۸۴۶-۱۸۱۹) کے دوران برطانیہ کا ایک انگریز سیاح کرنل مور کرافٹ ترکستان کی سیاحت کے لئے وہاں گیا جاسوسی کے شک پر کئی جگہوں پر گرفتار ہوا۔اور شاہ نیاز صاحبؒ کی

توجہ سے رہائی پائی۔ ان کی اس مہربانی کے صلے میں مور کرافٹ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ان کو جاگیر واگذار کی جو آج تک ان کی اولاد کی جاگیر ہے جو سکھ حکمرانوں نے اپنی تحویل میں لی تھی۔ اور مور کرافٹ نے خواجہ شاہ نیازؒ سے خوشنودی حاصل کی۔ آخر خواجہ صاحب ترکستان کی سیر کو نکل کر کابل میں سکونت پذیر ہوئے اور ۱۸۲۹ء میں انتقال کیا۔ اُن کی تُربت کابل کے شاہی قبرستان میں سپرد خاک کی گئی۔

سرینگر کی خانقاہ میں شاہ نیاز نقشبندیؒ کے والد عبدالرحیم صاحب سپرد خاک ہے۔ خوشا صاحبؒ کا آستانہ نہایت خوبصورت اور شاندار تھا اس کے بعد اُس کی از سر نو مرمت خواجہ سلام شاہ نقشبندی نے کی۔ یہاں عبدالرحیم صاحبؒ اور شاہ نیاز صاحبؒ کے یہ تبرکات موجود ہیں۔ (۱) موئے مبارک ابوبکر صدیقؓ (۲) جامہ مبارک حضرت امام اعظمؒ (۳) عمامہ مبارک غوث العظمؒ (۴) عصائے مبارک امام موسیٰ کاظمؑ (۵) کمر بند آنحضورؐ (۶) قرآن شریف کے وہ ڈھائی سپارے۔ جو حضرت عثمانؓ اس وقت تلاوت فرما رہے تھے جب ان پر حملہ کیا گیا۔ اور جام شہادت نوش کیا ان سپاروں پر خون کے نشان بھی ہیں۔ یہ سپارے مغلوں نے خاندان نقشبندیہ کو بطور تحفہ دئے تھے۔

اس خانقاہ پر ایک برج چڑھایا گیا ہے۔ جس پر پتوں کی شکل کا پتیل کا ٹوپ ہے۔ اس برج پر تین کھڑکیاں ہیں۔ آستانہ کے چاروں طرف شیشے کی کھڑکیاں ہیں آستانے کی لمبائی اور چوڑائی شمال میں ۵۵ فٹ اور جنوب

میں ۵۵ فٹ مشرق میں کھلی زمین ہے۔ مغرب کی طرف سڑک راہ عام ہے۔ اس خانقاہ کی دیکھ بال خواجہ محمد شاہ نقشبندی کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے پوتے ڈاکٹر محمد اشرف نقشبندی یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اب ان کے فرزندان تبرکات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

خواجہ حبیب اللہ گانی عرف عطارؒ

آپ رئیس کشمیر خواجہ ابراہیم گانی کے بیٹے تھے اور حد درجہ خوبصورت تھے باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ تو با قاعدہ تعلیم سے محروم ہو گئے لیکن آپ نے اپنی تربیت بڑے بڑے صوفی بزرگوں کے زیر سایہ حاصل کی۔ اور آپ خود ایک صوفی بزرگ بن گئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے خواجہ یعقوب دارؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ قاسم حقانیؒ کے مرید ہو گئے تھے۔ خواجہ یعقوب دارؒ کی وفات کے بعد شاہ قاسم حقانیؒ نے خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

در حقیقت خواجہ حبیب اللہ عطارؒ دو تہنی بزرگ تھے ایک جانب حضرت یعقوب دار سے اعتقاد تھا اور دوسری جانب شاہ قاسم حقانیؒ کے محرم اسرار تھے۔ مرشد کی وفات کے بعد آپ نے اہل علم کو راہ ہدایت دکھائی۔ نقل ہے کہ خواجہ عطار کا ایک مرید لاہور گیا ہوا تھا۔ اس کی والدہ ایک روز آپ کی خدمت میں آئی کہ وہ بیٹے کے فراق میں سخت اضطراب میں ہے۔ خواجہ کو عورت کی حالت پر ترس آیا۔ اسی وقت مرید کو راتوں رات اپنی سواری کے خاص گھوڑے پر سوار کر کے محلّہ کی مسجد میں پہنچا دیا۔ ماں بیٹے کی اس قدر جلد واپسی پر خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کوہ بانہال پر گوشہ نشین تھے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

آپ پر جلوہ افروز ہو کر فرمانے لگے اے حبیب تیری پسند ہماری پسند ہے۔ فرمایا ہے کہ اورادفتحیہ پڑھنے کے دوران جب میں الصلوٰۃ واسلام علیک یا شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچا تو دیدار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا فرمایا اے حبیبؒ تیری زبان سے یہ کلمہ مجھے بے حد پسند ہے تب سے یہ کلمہ ہمیشہ تین بار دہراتا ہوں۔ آپ کے مرید خواجہ یوسفؒ کا بیان ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب جب ۱۶۶۵ء میں وارد کشمیر ہوئے۔ بعض درویشوں کی بذات خود زیارت کی اور بعض کو روبرو طلب کیا۔ خواجہ حبیب اللہ عطارؒ کو بھی پیغام بھیجا کہ یہاں آئیں یا مجھے حکم دیجئے کہ میں آؤں۔ لیکن خواجہ صاحب بادشاہؒ کے پاس جانے سے انکاری ہو گئے بالآخر خواجہ عبدالرحیم گائیؒ کے اسرار پر آپ اورنگ زیب بادشاہ کے پاس جانے پر راضی ہو گئے۔ اور آپ کی ملاقات شہنشاہ اورنگ زیب سے روپہ لانک چار چناری میں ہوئی۔ بادشاہ خواجہ صاحبؒ کی قابلیت سے بڑا متاثر ہوا اور اسے کچھ تحفے دئے۔ لیکن خواجہ صاحب نے انکار کیا۔ آخر پر اورنگ زیب نے خواجہ صاحب سے گزارش کی کچھ نصیحت مجھ کو کریں۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمیشہ ہر کسی سے نرمی سے پیش آؤ۔ اور کسی کا دل مت دُکھاؤ۔

حضرت خواجہؒ کی وفات ۲ رجب ۱۰۸۰ھ بمطابق ۲۶ نومبر ۱۶۶۹ء میں ہوئی۔ بوقت وفات آپ ۷۰ برس کے تھے۔ محلّہ قطب الدین پورہ (زینہ کدل ڈب تل) میں آپ کا مزار محل زیارت خاص و عام ہے۔ آخری وقت میں ان کے پاس مرید صادق مرزا اکمل دین بیگ خان بدخشیؒ تھے۔

میر شمس الدین اراکیؒ

کشمیر میں شیعہ مسلک فقیہ جعفریہ کے بانی میر شمس الدین اراکیؒ کا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ اس خاندان کی ایک شاخ ہمارے یہاں دوسو سال سے قیام پذیر ہے۔ مرحوم آغا سید محمد یوسف الموسوی جو اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے نے باضابطہ یہاں ایک دینی دانش گاہ جامعہ باب العلم کے نام سے بڈگام میں کھولی۔ جو آج انجمن شرعی شیعیان کے موجودہ صدر آغا سید حسن الموسوی جو اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں کی زیر نگرانی چل رہی ہے۔

اراکی صاحبؒ کی ولادت ۱۳ رجب ۷۹۹ھ کو ایران کی راجدھانی ہمدان کے جنوب مشرق میں ایک سیاحتی شہر ''اراک'' میں ہوئی ہے۔ میر شمس الدین اراکی کا اصلی وطن یہی ہے غلطی سے کچھ مورخ ایران کے شہر اراک کو ملک عراق سمجھتے ہیں میر شمس الدین اراکی بچپن ہی میں اپنے والد کے سایہ سے محروم ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنے آبائی وطن اراک کو چھوڑ کر اصفہان چلے گئے۔ وہاں پر ایک خاندان نے آپ کو گود لیا اور آپ اصفہانی بھی کہلائے۔ یہاں پر آپ نے بہت سارے علوم حاصل کرنے کے علاوہ سلوک اور عرفان کے سارے مدارج طے کئے اور اسی طرح سے ظاہری و باطنی علوم

سے پوری طرح مستفید ہوئے ۔ وہاں شاہی دربار میں بھی انہیں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔

شاہ قاسم نور بخشؒ اپنے دور کے مشہور صوفیائے کرام میں سے تھے اور شمس الدین اراکیؒ ان کے مرید خاص تھے اور ان ہی کے حکم کے مطابق اشاعت اسلام کے لئے کشمیر آئے تھے۔

شہمیری خاندان کے دسویں بادشاہ سلطان حسن شاہ (۱۴۷۲-۱۴۸۴ء) کے دور میں میر شمس الدین اراکی بادشاہ خراساں کی طرف سے یہاں سفیر بن کر آئے ۔ انہوں نے اپنے آٹھ سالہ قیام کے دوران وادی کشمیر میں اشاعت اسلام میں شیعہ مسلک کی داغ بیل ڈالی اور اس کی ترقی کے لئے کام کیا۔ کشمیر میں آکر آپ کو بابا اسماعیل کبرویؒ کے ساتھ تعلقات ہوگئے اس وقت کی ایک مشہور شخصیت اور صاحب ثروت بابا علی نجارؒ کو اپنا ہم خیال بنا چکے جو کہ حسن آباد رعناواری کا رہنے والا تھا۔ اس کے بعد ملک موسیٰ رینہ، ملک کاجی چک ، ملک محمد ناجی اور ملک دولت چک میر شمس الدین اراکیؒ کے ذریعہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے آپ نے قیام کشمیر کے دوران اپنی کوششوں اور تبلیغ سے چوبیس ہزار گھرانوں نے مسلک فقیہ جعفریہ اختیار کرلیا۔ کشمیر یں آٹھ سال رہ کر میر اراکی واپس ایران تشریف لے گئے اور اپنے مرشد کے کہنے پر دوبارہ کشمیر آئے ۔ یہاں آکر انہوں نے شدومد کے ساتھ تبلیغی کام شروع کیا اس بار ملک موسیٰ رینہ اور کاجی چک جس کا شہمیری دربار میں اونچا مقام تھا نے میر اراکی کے ہاتھ پر بیعت کروا کے شیعہ مسلک

قبول کروانے میں اہم رول ادا کیا ملک موسیٰ اور کاجی چک کی بیعت نے میرارکی کے امکانات کو روشن سے روشن تر کر دیا۔ وادی کشمیر کے اطراف و اکناف میں شیعہ مسلک کی تبلیغ کر کے میر شمس الدین اراکیؒ اسکردو چلے گئے۔ وہاں بودھ مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ وادی کشمیر کے مقابلے میں اسکردو میں انہوں نے کم سے کم وقت میں شیعہ مسلک کی اشاعت میں کامیابی حاصل کی وہاں سے فارغ ہو کر واپس کشمیر چلے آئے اور یہاں مستقل طور پر بود باش اختیار کرنے کا ارادہ کیا یہ اس دور کی بات ہے جب جڈی بل میں کوئی آبادی نہ تھی۔ اور یہ خطہ زمین سلطان فتح شاہ کے دور میں ملک موسیٰ رینہ کو بطور جاگیر عطا کیا گیا تھا۔ بعدازاں ملک موسیٰ رینہ نے وہ خطہ زمین میر شمس الدین اراکی کو اپنا مسکن اور خانقاہ تعمیر کرنے کے لئے بخش دیا۔ پھر میر اراکی نے ملک موسیٰ رینہ سے مکانات، جواہرات اور زیورات قبول کر لئے۔ اور ۱۴۹۶ء میں خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ اس خانقاہ کا سارا انتظام میر شمس الدین اراکیؒ کے ہاتھ میں تھا اور مجاوروں تقرری اور برخاستگی ان کے حد اختیار میں تھا۔

سلطان محمد شاہ نے ساری ذمہ واریاں میر اراکیؒ کو تفویض کیں۔ میر اراکیؒ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے سید میر دانیال خانقاہ کے منتظم اعلیٰ بن گئے۔ میر اراکیؒ نہ صرف مبلغ دین اور عارف باللہ تھے بلکہ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ وہ بہت بہادر باہمت اور مرد میدان تھے ان کا معرکہ ذال ڈگر جو ۱۵۰۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ جو ایک اہم لڑائی تھی جس میں ان کے

ہمراہ ملک موسیٰ رینہ، ملک علی رینہ، قاضی محمد شامل تھے۔ یہ جنگ ذال ڈگر کے قُرب وجوار میں جہاں رینو نام کا ایک مندر تھا اور یہ جگہ مے نوشی اور بدکرداری کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو کافروں، منافقوں اور فاسق لوگوں کا مرکز بن چکا تھا۔ یہاں پر غیر اسلامی حرکات کا مظاہرہ کھلے عام ہوتا تھا میر شمس الدین اراکیؒ کو جب ان بدعات کا علم ہوا تو وہ ایک جماعت لے کر رینو کو مسمار کرنے کے لئے چل پڑے اور اس کو شکست دی۔ اس فتح مندی کے بعد ذال ڈگر کا نام اسلام پور رکھ دیا گیا۔

میر شمس الدین اراکی آخر سرینگر میں رہ کر ۱۵۳۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اور ان کے جسد خاکی کو جڈی بل میں سپرد خاک کیا گیا۔ مگر مرزا حیدر دوغلت کے ڈر سے میر اراکی کے جسد خاکی کو جڈی بل سے منتقل کر کے چاڈورہ پہنچا دیا گیا اور وہاں پر ان کو پوشیدہ طور پر سپرد خاک کیا گیا بالآخر میر ار! کی کا مقبرہ گمنامی میں چلا گیا۔ پھر آغا سید مہدی الموسوی نے میر اراکی کے مقبرہ پر انیسویں صدی میں ایک روزہ تعمیر کروایا۔ اس کے بعد ان کے فرزند آغا سید احمد نے ۱۹۲۴ء میں میر شمس الدینؒ کا نیا روضہ تعمیر کروایا۔ اب یہاں ہر سال انجمن شرعی شیعان کی نگرانی میں وعظ و تبلیغ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

خانقاہِ زڈی بل

کشمیر میں شعیہ مسلک کے بانی میر شمس الدین اراکیؒ کشمیر سے ایران تشریف لے گئے وہاں بارہ سال قیام کرنے کے بعد سلطان فتح شاہ کے وقت دوبارہ کشمیر آئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب جڈی بل میں کوئی آبادی نہ تھی یہ خطہ زمین سلطان فتح شاہ کے دور میں ملک موسیٰ رینہ کو بطور جاگیر عطا کیا گیا تھا۔ بعد ازاں ملک موسیٰ رینہ نے وہ خطہ زمین میر شمس الدین اراکیؒ کو اپنا مسکن اور خانقاہ تعمیر کرنے کے لئے بخش دیا۔ ملک موسیٰ رینہ نے میر اراکیؒ کو تحائف بھی پیش کئے جن میں زمین، مکانات، جواہرات و زیورات شامل تھے۔ پھر ۱۴۹۶ء میں خانقاہ جڈی بل کی بنیاد پڑی۔

اس خانقاہ کا سارا انتظام میر شمس الدین اراکیؒ کے ہاتھ میں تھا۔ اور مجاودں کی تقرری اور برخاستگی ان ہی کے حد اختیار میں تھی۔ میر اراکیؒ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے سید میر دانیال خانقاہ کے بعد کے منتظم اعلیٰ تھے۔

آخر سید میر شمس الدین اراکیؒ اچھی خاصی عمر پا کر ۱۵۳۶ء میں وفات پا گئے۔ اور ان کو خانقاہ جڈی بل میں سپردِ خاک کیا گیا۔ لیکن بعد میں کشمیر پر

پر قاضی محمد قدسی کی مثنوی لکھی گئی۔ خطاط ملا ولی گنائی اور ملا حاجی گنائی تھے۔ ۱۵۴۸ء میں مرزا حیدر کاشغری کے وقت میں خانقاہ نذر آتش ہوئی۔ جس میں گردونواح کا پورا محلّہ جل کر خاکستر ہوا۔ مرزا حیدر کاشغری کے ۱۵۵۰ء میں قتل ہو جانے کے بعد میر شمس الدین اراکیؒ کے فرزند سید دانیال کی میت کو گاندربل کے شہید مزار سے نکال کر والد کی اس قبر کے قریب دفن کی گئی جس میں وہ پہلے دفن تھے۔ جہاں سلطان اسماعیل کے دور میں (۱۵۵۲-۱۵۵۱) خانقاہ کو دولت چک کے ذریعے نگین اور آرائش سے تعمیر کیا گیا۔ ۱۵۸۵ء میں اکبر کے دور میں خانقاہ میں پھر آگ لگ گئی۔ اس کے بعد ۱۶۲۰ء میں جہانگیر کے دور میں ملک حسن چاڈورہ کے ہاتھوں خانقاہ ازسر نو تعمیر ہوئی۔ مگر ۱۷۰۱ء میں خانقاہ تیسری مرتبہ نذر آتش ہوئی اور گردونواح کا پورا محلّہ بھی خاکستر ہوگیا۔ ۱۹۴۳ء میں آغا سید احمد الموسوی بڈگام نے اس احاطے میں خوشحال سر کی طرف ایک دیوڑھی تعمیر کروائی۔

۱۹۹۸ء میں انجمن شرعی شیعیان کی نگرانی میں آغا سید یوسف الموسوی بڈگام کے ذریعے خانقاہ کی ازسرنو بنیاد ڈالی گئی نئی تعمیر ۷۱ فٹ چورس مقرر کی گئی۔ قاضی جان محمد قدسی نے اس خانقاہ کی تاریخ اس چھوٹی سی مثنوی کی شکل میں منظوم کی ہے:-

قاسم فیض و واہبِ توفیق　　رہنمائے معارجِ تحقیق
طلعت افروز شمس دینِ نبیؐ　　شمسہ افرازِ کاخِ مُطلّی
دربلادِ ممالک کشمیر　　حرست عن طوارق اللہ میر
پرتو شمع نور بخش افروخت　　دیدۂ حاسدانِ منکر سوخت
ہمت ایں بزرگ صاحبِ خیر　　فی الحقیقت بغیر منّتِ غیر
خانقاہ چناں عمارت کرد　　کہ فرشہ درد زیارت کرد
برروانش نوشتہ رُوح الامین　　سالِ تاریخ کاشف المتین
بردرِ ایں مقام ہمچوہشت　　خیر اللہ ذوالبقاء نوشت

سید تاج الدینؒ (نوہٹہ)

تاج الدینؒ جنت کشمیر کے اُویسی بلند پایہ ولیوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے کشمیر کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے شرف بخش کر توحید کی تابانیوں سے منور کیا۔ سید تاج الدین ۷۶۲ھ میں اسلام پھیلانے کے لئے کشمیر وارد ہوئے ۔ اور ان کی بدولت بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔اور تبلیغ دین اسلام کشمیر میں باضابطہ طور چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ جب حضرت بُلبُل شاہ صاحبؒ وارد کشمیر ہوئے اور کشمیر کا بادشاہ رینچن شاہ، سلطان صدرالدین کے نام سے حلقہ بگوش اسلام ہوا۔اس واقع کی تاریخ ۱۳۲۰ء ہے۔اس نام سے وہ پہلے خود مسلم بادشاہ کی حیثیت سے تین سال یعنی ۱۳۲۳ء تک کشمیر میں حکومت کرتے رہے اور اسی سال اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔اس کے بعد سید تاج الدینؒ، حضرت امیر کبیرؒ کے ارشاد کے مطابق کشمیر میں تبلیغ دین اسلام کے لئے آئے۔اس وقت کشمیر کا بادشاہ سلطان شہاب الدین تھا۔(۱۳۷۳-۱۳۵۴) آپ نے ان کی بڑی آو بھگت کی اکے مُریدوں میں شامل ہوگیا۔اور دل وجان سے خدمت گزاری کے فرائض انجام دیتے رہے اور اپنے محل کے نزدیک جگہ دی۔آپ محلّہ شہاب الدین پورہ جس کو آج کل شہام پورہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے میں

قیام پذیر ہوئے ۔ یہاں بادشاہ کا پایہ تخت نزدیک تھا۔ بادشاہ نے یہاں ایک عالی شان مسجد بنوائی ۔ جس کے آثار آج تک شہاب الدین کی شان وشوکت کی گواہی دیتے ہیں ۔ بادشاہ نے ملک کو امن وامان اور خوشحالی سے منور کردیا۔ شہاب الدین پورہ کے نزدیک نوہٹہ واقع ہے۔ قریب ہی ملہ کھاہ ہے۔ حضرت بل اور رعناواری جانے کے لئے شہام پورہ کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ سلطان شہاب الدین کا دور حکومت کشمیر میں شاندار رہا ہے۔ جبکہ کشمیریوں نے اپنی بہادری اور فوجی طاقت سے دنیا کو مرعوب کیا۔ آپ نے کشمیر سے باہر اپنی فتوحات جاری رکھیں۔ للتادیتہً کے بعد یہ کشمیر کا ایک عظیم الشان بادشاہ گزرا ہے۔ بادشاہ نے سید تاج الدین کے خادموں کے لئے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کی ۔ اور آپ سید کی صحبت کے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی آرام نہ پاتے تھے ۔ یہاں تک کہ سلطنت کے کاروبار اور حکومت کے کاموں کو ان کے مشوروں اور مصلحتوں کے مطابق سرانجام دیتے تھے۔ مقدمات کی سماعت اور فیصلوں ملکی لڑائیوں اور مصالحتوں میں انہیں شامل رکھتے تھے۔ سلطنت کی فتوحات کی کثرت کو حضرت سیدؒ کی روحانی ہمت اور طاقت کا نتیجہ جانتے تھے ۔ ناگام گاؤں ان کے خانقاہ کے خادموں کے اخراجات کے لئے جاگیر تھا جب اس دنیا سے رحلت فرمائی تو شہاب الدین پورہ آج کل کا شہام پورہ میں سپرد خاک کئے گئے ۔ سال وفات ۷۸۰ھ ہے سید حسن بہادر آپ کے فرزند تھے صاحب دل اور جری سپاہی تھے شہاب الدین نے ان کی بہادری دیکھی تو ان کو کشمیری فوج کا سپہ سالار بنایا اور "رستم

ہند'' کا خطاب دیا۔آپ نے میدان جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی۔جب اس دنیا سے چل بسے تو والد بزرگوار کے مقبرے میں دفن کیئے گئے۔جب سلطان شہاب الدین اور فیروز شاہ تغلق (جو کہ اُس وقت ہندوستان کا بادشاہ تھا) کی افواج کے درمیان تصادم ہوا۔اور حضرت امیر کبیر کی بدولت ان کے درمیان صلح ہوئی۔اُس وقت کشمیری فوج کا سپہ سالار سید حسن بہادر تھا۔تو فیروز شاہ تغلق نے اپنی ایک دختر کی شادی میر حسن سے کردی سید تاج الدینؒ اُٹھارہ سال تک کشمیر میں رہے۔جناب شاہ ہمدان نے سید تاج الدینؒ،سید حسن سمنانیؒ اور سید حسن بہادر کو کشمیر میں تبلیغی مشن کے سفیر بنا کر روانہ کیا تو حضرات کشمیر کے حالات تہذیب وتمدن سے جناب میر سید علی ہمدانیؒ کو آگاہ کرتے رہے پھر جناب امیر کبیرؒ کی تشریف آوری سے کشمیر میں اسلامی انقلاب بپا ہوا۔ہمارا فرض ہے کہ اس اُویسی خانقاہ جہاں پر سید تاج الدینؒ سپرد خاک ہیں۔جو کہ سلطان شہاب الدین کے دور حکومت میں تعمیر ہوا کو از سر نو تعمیر کریں اس طرح اس عظیم مبلغ اسلام کو خراج عقیدت پیش کریں۔

شیخ محمد چستی رادھو عشائیؒ

شیخ صاحبؒ ۱۶۲۴ء میں فتح کدل میں ایک مالدار تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا نام خواجہ رفیق عشائیؒ تھا چار برس کی عمر میں حضرت مولانا حیدر چرخیؒ کے مکتب میں تعلیم شروع کی۔ فارغ التحصیل ہونے تک ان کی نظر عنایت میں رہے دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم اور سلوک کے آداب کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے عربی، فارسی، فلاسفی میں بھی قابلیت حاصل کی۔ اگر چہ آپ کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ لیکن اس سے آپ کو کوئی رغبت نہیں تھی۔ آپ کے والد صاحب نے آپ کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ آپ بھی خدا دوست اور صاحب علم تھے۔ آپ نے اپنے علاقہ میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جہاں آپ طالب علموں کو حدیث قرآن وفقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ ستھرویں صدی میں شیخ رادھوؒ نے کشمیر میں چستیہ سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ شیخ محمد علی جالندھریؒ جو کہ برصغیر کے بڑے ولی کامل تھے۔ ان کو باطنی طور پر ارشاد ہوا کہ آپ کشمیر جا کر شیخ محمد چستیؒ کشمیری کی رہبری کرے۔ آخر آپ جالندھر سے کشمیر آئے اور شیخ صاحبؒ کی تربیت کی اور ان کے رہبر بن گئے۔ اور ان کو چستی سلسلہ کے بارے میں جانکاری دی۔ اور شیخ رادھوؒ نے کشمیر میں چستیہ سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ شیخ محمد چستیؒ کے والد خواجہ رفیق

کی ہمشیرہ کی شادی ایک بڑے عالم دین مولانا عبدالصمد رادھوؒ سے ہوئی
تھی۔ بچپن میں شیخ رادھوؒ کو اپنی پھوپھی نے پالا پوسا اور تربیت کی۔ اور کچھ دیر
کے لئے آپ ان کے زیر تربیت رہے۔ لہٰذا آپ کو رادھوؒ کے نام سے بھی یاد
کیا جاتا ہے۔ آپ فارسی اور عربی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ نے
تقریباً ایک لاکھ شعر بیان کئے ہیں۔ جو صرف توحید اور خدا تعالیٰ کی بڑائی
کے متعلق ہیں۔ آپ کی توحید پر کتاب عدۃُ القاہ بہت مشہور ہے۔ اس کے
علاوہ آپ نے بہت ساری کتابیں تحریر کی ہیں جن میں خاص طور پر ''ترغیب
سالکین'' ہے۔ آپ اپنے زمانے کے اکابر اولیاء میں سے تھے۔ ریاضت،
تقویٰ اور کثرت عبادات میں اپنے قریبی ساتھیوں میں صاحب امتیاز تھے۔
آپ عمر بھر پابند شریعت رہے اور پرہیز گاری میں اپنی زندگی بسر کی آپ کو
شہرت اور خودنمائی سے نفرت تھی۔ ذکر جہر (بلند آواز سے یاد خدا کرنا) چستیہ
کے مطابق ہمیشہ کرتے تھے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی چستی طریقہ پر ذکر جہر
کرنے کی تعلیم ترغیب دیتے تھے۔ کمال کے حقیقت آشنا تھے۔ آپ کے زما
نے میں موئے مبارک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ خواجہ نورالدین
عاشوری نے سید عبداللہ اور اس کے فرزند سید حامد سے حاصل کیا تھا۔ کشمیر میں
تشریف آور ہوا۔ اور بد قسمتی سے نور الدین عاشوری لاہور میں انتقال
کر گئے۔ آپ کے ملازم خاص میدانش، خواجہ نورالدین کی نعش ساتھ اُٹھا کر
کشمیر کی طرف لاہور سے روانہ ہوئے آپ مغل روڑ سے ہیر پور پہنچ گئے۔ ا
س وقت کشمیر کا مغل گورنر فاضل خان تھا۔ اس وقت گورنر نے سرینگر کے علماء
اور عزت دار آدمیوں کی میٹنگ بلائی اور فیصلہ ہوا کہ شیخ محمد چستیؒ موئے

شریف کے استقبال کے لئے ہیرپورہ روانہ ہو گئے اور ان کے ساتھ عالم و فاضل بھی ہونگے۔

حضرت شیخ محمد چستیؒ ننگے پاؤں ہیرپورہ پہنچ گئے اور موئے شریفؐ کی پیشوائی کرتے رہے وہاں سے موئے مبارکؐ کو سر پر رکھ کر سرینگر ۱۶۹۹ء میں وارد ہوئے۔ پہلے پہل باغ یوسف موجودہ قاضی مسجد جہاں آپ سکونت پذیر تھے میں موئے شریفؐ کی زیارت لوگوں کو کرائی گئی وہاں پر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ موئے شریفؐ کو خواجہ معین الدین نقشبندیؒ (نقشبند صاحب) کے روضہ میں رکھا۔ ہجوم کی کثرت سے کئی آدمی جاں بحق ہو گئے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر شہر کے امیروں عالموں نے فاضل خان گورنر کشمیر سے مشورہ کر کے باغ صادق خان جہاں پر موجودہ آثار شریف ایک خوبصورت مسجد شاہ جہاں کے وقت میں بنی تھی جوڈل کے مغربی کنارے پر واقع ہے بہترین مقام جان کر موئے مبارکؐ کو وہیں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ محمد چستیؒ نے ۱۵ سال تک موئے شریفؐ کی نشاندی کی۔ آخر ۱۷۱۴ء میں آپ وفات پا گئے۔ اور آپ کو اپنے گھر کے پاس چستیہ کوچہ سونہ مسجد میں سپرد خاک کیا گیا۔ شیخ صاحبؒ کے انتقال کے بعد موئے شریفؐ کی نشاندہی کرانے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی نہ ان کے فرزندوں کو اسی اثناء میں شہر کے رئیسوں اور عالموں نے نشاندہی کرنے اور زیارت کرانے کا حق دار خواجہ نور الدین آشاوری کے داماد خواجہ بلاتی بانڈے کو تسلیم کر کے مبارک کام ان کے سپرد کیا خواجہ نور الدین کا اپنا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اور آج تک اس خاندان کے لوگ موئے شریف صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ملا آخون حسن خبازؒ (حول)

کشمیر اپنی خوبصورتی اور دلکش آب وہوا کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں دور دور سے سیاح آکر اپنی تفریح کا سامان بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔لیکن اہل باطن کے لئے بھی یہاں اطمینان وسکون قلب کا سامان موجود ہے۔ بزرگان دین نے یہاں اسلام پھیلانے میں عظیم کام کیا۔آج بھی ان بزرگوں کی تعمیر کردہ خانقاہوں میں سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ کشمیر میں ہر زمانہ میں عظیم انسان پیدا ہوئے جن میں علماء،صوفیائے کرام، مفکرین اسلام اور شعراء وغیرہ پیدا ہوئے۔

ان ہی میں سے ملا آخون حسن خبازؒ بھی ایک پیدا ہوئے جنہوں نے یہاں لوگوں کو گمراہی کی راہوں سے روک کر صحیح راستے پر گامزن کیا۔ مولانا کا نام حسن اور جائے پیدائش سرینگر تھی۔انہیں ''خبازؒ'' (نانوائی) اس لئے کہتے تھے کہ مولانا کی ایک نانوائی کے ساتھ بڑی دوستی تھی اور مولانا اکثر اس کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے ۔اس طرح لوگوں میں خبازؒ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے زمانے کے ایک بڑے عالم فاضل خواجہ اسحاق قاریؒ سے حاصل کی۔ جب خواجہ اسحاق قاریؒ کا مکہ معظّمہ میں انتقال ہوا۔تو مولانا کو بھی حرمین شریف کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ حج

سرانجام دینے کے بعد انہوں نے اکبر آباد میں خواجہ عبد شہید کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اوران کے شاگردوں میں شامل ہوگئے جب مولانا کشمیر آئے تو یہاں دین کی اشاعت میں مصروف ہوکر بدعتوں اور گمرائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نام کے ساتھ لفظ آخون لکھا ہے جو اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ کشمیر واپس لوٹ آنے کے بعد انہوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا ہوگا۔ اور درس وتدریس اور اشاعت دین میں مصروف عمل رہے ہونگے۔ کشمیر میں لوگ آج بھی ان کے روضہ کو آخون صاحبؒ کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں وہ کشمیر میں رائج بدعتوں کو مٹانے میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ صوفی شاعر خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ محفل سماع میں مشغول رہتے تھے ان کے ساتھ اکثر مباحثے اور مناظرے کرتے رہتے تھے۔

ان کا تعلق نقشبندی سلسلہ سے تھا وہ علم تفسیر۔ فقہ اور حدیث میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ بابا نصیب الدینؒ، مولانا حیدرؒ بھی آپ سے حدیث کی تعلیم لیا کرتے تھے مولانا بہت ساری کتابوں کے مصنف رہے ہیں۔ آپ کو فارسی نظم ونثر دونوں پر عبور حاصل رہا ہے مولانا خبازؒ سماع، رقص اور قوالوں کی صحبت اور موسیقی سننے کے شدید مخالف تھے۔ آپ پہلے عالم دین ہیں جو رقص وسماع کے خلاف کھل کر سامنے آئے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے تمام احادیث آپ کو زبانی یاد تھے۔ مسائل پوچھنے کے لئے طلباء اور علماء دونوں ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اکبری اور جہانگیری دور میں کشمیر میں ان صوفیانہ سلسلوں اور طریقوں کے عقائد میں زبردست ٹکراؤ اور تناؤ تھا اور

دونوں سلسلے اپنے عقائد کے بارے میں دلائل پیش کرتے تھے۔ مولانا کی نظر میں ہر وہ نئی بات ناپسندیدہ تھی جس کی سند آنحضورؐ سے نہ ملتی ہو۔ مولانا شاعر بھی تھے۔ عام طور پر ان کے اشعار شریعت اور طریقت کے اہم مسائل کی وضاحت کرتے ہیں۔ آپ کی فارسی نثر میں ایک کتاب ہے کفایت الاعتقاد اس کتاب میں آپ نے اہل سنت والجماعت کے اعتقادات پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا عالم تو تھے ہی اس کے علاوہ عابد و زاہد بھی تھے۔ ان سے کئی کرامات منسوب ہیں۔ مولانا کا وصال ۱۳ ذی الحجہ ۱۰۵۲ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۶۴۲ء کو ہوا۔ مولانا کا روضہ محلہ گوجوارہ سرینگر میں اسلامیہ کالج کے متصل واقع ہے۔ ۱۳ ذی الحجہ کو ہر سال مولانا کے یوم وصال پر آستانہ عالیہ میں ذکرو ازکار کی مجلس ہوتی ہے مقبرہ کے احاطے میں ایک پتھر ہے جسے بچے چاٹتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس سے ان کا قوت حافظہ تیز ہوتا ہے۔ آستانہ کے نزدیک ایک مشہور عالم ملا جوہر ناتھ کی قبر بھی ہے جو بچپن میں حضرت مخدوم محبوب العالمؒ کی خدمت میں آئے تھے۔ اور بابا داؤد خاکیؒ کے شاگرد بنے۔ وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔

شاہ نعمت اللہ قادریؒ

شاہ نعمت اللہ قادریؒ وہ بزرگ تھے جنہوں نے کشمیر میں قادری سلسلہ کی بنیاد ڈالی ۔ جو سولھویں صدی کشمیر میں وارد ہوئے ۔آپ غوث الاعظمؒ کے اولادوں میں سے تھے ۔ کشمیر آنے سے پہلے وہ ہندوستان میں کسی جگہ رہتے تھے ۔آپ ہمیشہ عبادت ، ریاضت اور خلوت میں رہتے تھے ۔ کشمیر میں آکر آپ چھتہ بل صفا کدل میں سکونت پذیر تھے اور وہاں پر ہی اپنی عبادت کرتے تھے ۔ وہاں اس وقت بھی آپ کا آستان ہے ۔آپ کشمیر میں زیادہ دیر نہ رہے اور واپس ہندوستان تشریف لے گئے آپ کے خلیفوں میں سید شمس الدین اندرابیؒ بھی شامل تھے ۔

حضرت میر نازک قادریؒ

بڈشاہ کا عہد حکومت کشمیر میں عہد زرین کہلاتا ہے۔ جو ۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء تک رہا ہے۔ اس زمانے میں کشمیر صنعت وحرفت کا گہوارہ تھا۔ سلطان نے دیگر ممالک خاص کر چین، سمرقند، بخارا اور روسی ترکستان سے رابطہ قائم کرکے وہاں کے علماء وفضلا کو دعوت دیکر کشمیر میں آباد کیا ان ہی میں سے ایک بزرگ قاضی میر محمد علی بخاریؒ تھے۔ بڈشاہ نے اُن کو ان کے علم و فضل کی بنا پر قاضی القفاء کے عہدہ پر فائز کیا۔ میر بخاری کا خاندان کشمیر میں پھلا پھولا۔ اس خاندان کے بارے میں بجا طور کہا جاسکتا ہے۔

ایں سلسلہ علمائے نائب است

ایں خانہ تمام آفتاب است

اس خاندان کے مشہور بزرگ قاضی موسیٰ شہید ہیں اور اس خاندان کے چشم وچراغ حضرت میر نازک نیازی قادریؒ ہیں۔ جو اپنے علم وفضل کے علاوہ زہد وتقویٰ اور معرفت الٰہی سے سرشار تھے۔ پرہیز گاری کے معاملے میں حضرت میر نازک نیازی قادریؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا میر صاحب کا شجرہ نسب یوں ہے۔ میر نازک قادریؒ بن میر حاجی محمد قاضیؒ، بن میر کمال الدینؒ بن میر سکندرؒ بن میر اسحاقؒ بن محمد علی بخاریؒ، بڈشاہی و میر نازکؒ کی تاریخ

ولادت کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ انکے والد میر حاجی محمد قاضی حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہؒ کشمیری کے ہم عصر تھے۔ ان کی کئی اولادیں بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ میر نازکؒ جب تولد ہوئے تو ان کے والد انہیں حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ کشمیریؒ کی خدمت میں لے گئے اور ان سے عرض کی کہ ان کی اس سے پہلے جو اولادیں ہوئیں وہ سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس لئے اس نومولود کو آپ کی خدمت بابرکت میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔ اس اعتبار سے کچھ دیر تک یہ بچہ حضرت سلطانؒ کی آنکھوں کے سامنے رہا اتنے میں آپ کے والد نے دیکھا کہ حضرت سلطان العارفینؒ کی آنکھیں پرنم ہوگئی ہیں وہ سمجھے کہ شاید یہ بچہ بھی زیادہ دیر تک زندہ رہنے والا نہیں حضرت سلطان العارفین نے بچے کے باپ کے شکوک کو دور کرنے کے لئے فرمایا اس بچہ کا عالم روحانی میں اتنا بلند مقام ہے کہ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ میرا مُرید ہوگا۔ مگر جناب محبوب سبحان شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ نے مداخلت فرمائی کہ ہم اسے اپنے سلسلے میں لے رہے ہیں۔

حضرت سلطان العارفین نے اس بچے کو اپنے خلیفہ خاص حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے حوالے کیا اور انہیں ہدایت دی کہ وہ اس کی تربیت کریں کیونکہ اس کا اصلی مرشد حضرت غوث پاکؒ کی ہدایت پر باہر سے آئے گا اور یہ سب اپنے وقت پر ہوگا۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ حضرت میرؒ کی تربیت کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد کشمیر میں جناب حضرت میر اسماعیل شامی رحمت اللہ علیہ کشمیر

تشریف لائے۔ آپ قادری سلسلہ سے وابستہ تھے اور شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کے اولادوں میں سے تھے۔ آپ تنہائی، گوشہ نشینی، پرہیز گاری، خداترسی، عبادت وریاضت ہر رنگ میں مرد کامل اور بے نظیر خدادوست تھے۔ روم، شام ہند کی سیاحت کے بعد ۱۵۸۱ء میں کشمیر آئے۔ جب حضرت شیخ بابا داوٗد خاکی نے ان کے حالات اور کمالات دیکھے تو ان کے ساتھ دوستی اور برادری کا رابطہ قائم کیا اور ایک دوسرے کی صحبت سے بہرہ آور ہوئے اور اپنے سلسلوں کی اجازت دی۔ حضرت شامیؒ نے بابا داوٗد خاکیؒ سے ایک طالب مانگا۔ انہوں نے عارفوں کے رہنما میر نازک شاہؒ کو ان کے حوالے کیا۔

کشمیر آکر آپ کو یہاں کے ریشیوں اور بزرگوں نے استقبال کیا اور دونوں نے کشمیر میں قادری سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ میر نازک قادریؒ ان کے پہلے شاگرد ہیں سید اسماعیل شامیؒ نے کشمیر میں قلیل عرصہ تک قیام کیا اور واپس ہندوستان چلے گئے۔ انہوں نے میر نازکؒ کو غوث الاعظمؒ کے کچھ تبرکات دیئے جن میں عصائے مبارک اور موئے شریف ہے۔ جو کہ اس وقت سرائے پائین کے آستانہ میں موجود ہیں۔ میر نازک قادریؒ کی وجہ سے کشمیر میں قادری سلسلے کو عروج ملا۔ یہ امتیاز ان ہی کو حاصل ہے کہ وہ اس ملک میں قادری سلسلے کے بانی ہوئے۔ تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ تقویٰ اور پرہیز گاری میں جناب میرؒ بے نظیر رہے ہیں۔ حضرت میر نازک قادری کے تقویٰ کی مورخوں نے کئی مثالیں دی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرت اس وقت تک کوئی بھی تحفہ قبول نہیں فرماتے تھے جب تک کہ اس کے ماخذ کے

بارے میں دریافت نہ کرتے ۔ تحفہ لانے والے سے پوچھتے تمہارا کوئی شریک تو نہیں۔ اگر ہے تو کیا اس کی اجازت حاصل ہے۔ کیا اس پر سرکاری ٹیکس ادا کیا گیا اگر ذرا بھی شبہ ہوتا تو تحفہ لینے سے انکار فرماتے تھے۔

حضرت میر نازکؒ نے سلسلہ قادری کے لازمی امورات ایک ایک کرکے پورے کیئے۔ فقیری اور تنہا نشینی اختیار کی کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں میں نہایت احتیاط مد نظر رکھتے تھے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بغیر کمرہ سے باہر نہیں نکلتے نذر و نیاز کی ساری آمدنی مسکینوں اور غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ایک دن ایک مُرید نے ان کو دعوت کرکے گھر بُلایا۔ وہاں معلوم ہوا اس کے بھائی بھی اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ حضرت نے ضیافت کھانے سے انکار فرمایا۔ کہ بھائیوں کی اجازت ضروری ہے کیونکہ وہ شریک ہیں شاید وہ مجھے یہاں بُلانا ناپسند کرتے ہوں۔ ایک دفعہ ایک سرکاری حاکم آپ سے ملنے آئے۔ آپ نے اس وقت تک اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ جب تک کہ خانقاہ کی ساری (چٹایاں) اُٹھوا نہ لیں اندر آکر حاکم وقت نے کچھ روپے بطور نذرانہ پیش کیئے۔ آپ نے حاکم کی موجودگی میں وہ ساری رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرڈالی مشہور ہے کہ اہل سماع (جو درویش صوفیانہ گانے کو سننا جائز مانتے ہیں) میں سے ایک بزرگ ان کی ملاقات کو آیا حضرت میرؒ نے ملاقات منظور نہ فرمائی۔ اس بزرگ نے پرچہ لکھ کر اندر بھیجا۔ ہم آپ کے دیدار کے شوق سے جل گئے ہیں۔ حضرت میر نے پرچہ کے پشت پر واپس لکھا ہم جل گئے۔ راکھ ہو گئے اور ہوا نے اس راکھ کو بھی اُڑا لیا۔ حضرت میرؒ کے حالات اور کمالات اتنے

زیادہ ہیں کہ لکھے نہیں جاسکتے۔ان کی کرامات اور برکتیں حد سے زیادہ ہیں۔
سلسلہ قادریہ نے ان سے اوران کے اولادوں سے کشمیر میں کافی رواج پایا جو
آج تک بدستور جاری ہے۔ کہتے ہیں کہ کشمیر میں ایک عجیب وغریب پرندہ
تین دفعہ جامع مسجد سرینگر میں نمودار ہوتا تھا جس کی شکل باز کی اور رنگ مور کا
ساتھا۔ پہلی بار ۱۰۲۲ھ ۱۶۱۴ء میں مشرقی دروازہ کی طرف سے چار بڑے
ستونوں کا طواف کر کے غائب ہو گیا اور میر نازک قادریؒ کا انتقال پر ملال
اسی سال ہوا۔ حضرت میر نازک قادری رحمتہ اللہ علیہ ۹ ذی الحجہ ۱۰۲۲ ہجری کو
اس دار فانی سے دار البقاء کی طرف روانہ ہوئے۔آپ کا مزار پر انوار اور
آپ کی خانقاہ کادی کدل میں واقع ہے۔ان کے وصال کے بعد ان کے
بڑے فرزند میر یوسف قادریؒ نے خانقاہ کا انتظام سنبھالا لیکن وہ بھی عین
جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔اس کے بعد خانقاہ کا انتظام میر نازکؒ کے
تیسرے فرزند میر محمد علی قادریؒ نے سنبھالا وہ بھی اس دنیا سے انتقال کر گئے۔

حضرت شاہ قاسم حقانیؒ (نر پرستان)

حضرت قاسم شاہ حقانیؒ میر شمس الدینؒ کے پوتوں میں سے تھے۔ جو حضرت امیر کبیرؒ کے ساتھ کشمیر آ کر یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ شاہ صاحبؒ کو کچھ لوگ ملا قاسمؒ اور کچھ حاجی قاسمؒ کہتے تھے۔ علم و ہنر دونوں میں پوری مہارت رکھتے تھے نیک کاموں کے کرنے اور بڑے کاموں کو چھوڑنے کی بڑی کوشش کرتے تھے۔ آپ کو حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ نے اپنا خاص آدمی بنایا۔ آخری وقت میں اپنا خرقہ پہنایا۔ اور خلیفہ مقرر کیا۔ حضرت شاہ قاسمؒ حضرت صرفیؒ کی عنایت اور مہربانی سے اس حال پر پہنچے کہ ایک دن یاد خدا کی گرمی سے ان کے پہنے ہوئے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ایک دن نماز تہجد کے غسل کے بعد سردی کی شدت سے سارے بدن سے خون نکلنے لگا۔ حضرت ایشانؒ کو خبر ہوئی انہوں نے اپنا جامہ پہنایا خون بند ہو گیا اور ٹھیک ہو گئے۔ حضرت صرفیؒ کے انتقال کے بعد شاہ قاسمؒ حج کو روانہ ہوئے، راستے میں بڑے بڑے خدا دوستوں سے ملے۔ صوبہ اجین میں شیخ فیض اللہ قادریؒ کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے۔ جب فیض اللہ قادریؒ نے ان کی ریاضت کو دیکھا تو ان کو سلسلہ قادریہ کی اجازت عطا کی۔ اور حضرت غوث الاعظمؒ کا ایک جامہ مبارک اور حضرت شاہ ہمدانؒ کا ایک خرقہ تبرک کے طور پر ان کو بخش دیا۔ جو ان کے اولادوں کے پاس نر پرستان میں آج تک موجود ہیں۔ اس

کے بعد آپ فتح پورہ سیکری پہنچے تو حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے ان کی ملاقات ہوئی آپ نے ان کو سلسلہ چستیہ میں داخل کیا۔ اور سلسلہ چسنیہ کا ارشاد عطا کر کے خواجہ معین الدین چستیؒ کی پگڑی جس کو کشمیری میں لونگی کہتے ہیں تبرک کے طور پر بخش دی سیر وسیاحت کے دن ختم ہونے پر شاہ صاحب واپس آئے اور کشمیر کے لوگوں کو راہ خدا دکھانے میں مصروف ہو گئے ۔ سینکڑوں بندگان خدا کو تعلیم و تلقین فرمائی۔

کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت شاہؒ اپنے گھاٹ پر کشتی میں بیٹھے تھے اور حضرت خواجہ مسعود پانپوریؒ ان کی ملاقات کو آئے۔ شوگہ باباؒ ان کے ساتھ تھے۔ بات چیت میں شوگہ باباؒ کی زبان سے کوئی گستاخی کی بات نکلی۔ حضرت شاہؒ نے جلال کی نظر ڈالی۔ خواجہ مسعودؒ نے ان کی نظر اور شوگہ باباؒ کی نظر کے درمیان ہاتھ رکھا یکدم ان کی آستین میں آگ لگی۔ اور حضرت شاہؒ سے معافی مانگی۔ انہوں نے شوگہ باباؒ کو ڈانٹا اور کہا کہ اگر میں ہاتھ بیچ میں نہ رکھتا تو جل کر راکھ کا ڈھیر ہوا ہوتا۔

۲۹ ربیع الثانی ۱۰۳۳ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ علاؤالدین پورہ نر پرستان میں سپرد خاک کئے گئے ۔ مقرب خاص تاریخ ہے چالیسویں روز جیسے کہ آپ نے خود فرمایا تھا کہ آپ کی قبر میں سے ایک نرکل آگئی اور سبز ہوگئی یہ نرکل ابھی بھی ہے۔ ایک دن رات میں سارا مقبرہ نرکل سے سبز ہو گیا۔ ان کے مقبرہ کے نزدیک ایک قصائی کا گھر تھا۔ اس کی بیوی بے خبری کے عالم میں جھاڑو دے کر کوڑا کرکٹ مقبرہ میں پھینک دیتی تھی اس کے چولہے میں نرکل نکل آئے قصائی گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔

سید محمد حسین قاضی شیرازیؒ

سرزمین کشمیر میں میر محمد ہمدانیؒ ایک درخشندہ ستارہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی شروعات ان کے والد بزرگوار میر سید علی ہمدانیؒ نے کی۔ آپ ۱۳۹۴ء میں کشمیر وارد ہوئے۔ اس وقت سلطان سکندر کشمیر کا بادشاہ تھا۔ تب ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ ان کے ہمراہ تین ہزار سادات کی ایک بڑی جماعت تھی کم عمر ہونے کے باوجود آپ علم ظاہری و باطنی سے پوری طرح واقف تھے۔ لہذا جوں ہی آپ یہاں پہنچے سلطان سکندر نے ان کی بھرپور آؤ بھگت کی۔ کشمیر میں اسلام پھیلانے کے لئے جو کام میر محمد ہمدانیؒ نے کئے وہ قابل قدر اور حیرت انگریز ہیں۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے خاص مرید اور رفقاء جو آپ کے ساتھ کشمیر آئے ان میں سید علی اکبرؒ، سید حسین شیرازیؒ جن کو قاضی ولی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سید احمد سمنانیؒ، سید صدرالدینؒ، سید حسن خورزامیؒ کے علاوہ سید نورالدینؒ، سید جلالؒ قابل ذکر ہیں۔ قاضی سید حسین شیرازیؒ علم وادب میں مرد کامل تھے۔ کشمیر آنے سے پہلے آپ شیراز (ایران) کے قاضی مقرر ہو کر دیانتداری سے مقدموں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ آخر کار حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے ساتھ خطہ کشمیر کو رونق بخشی اور یہاں ہی سکونت اختیار کی۔ سلطان سکندر ان کی بڑی عزت تعظیم کرتے تھے

بہت سے گاؤں بطور جاگیر عطا کئے۔ حضرت سیدؒ نے شریعت کے احکام کو چلانے اور بُرائیوں کو دور کرنے میں بہت کوشش کی۔ حدیثوں کو جمع کر کے ایک رسالہ مرتب کیا اور حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب آپ نے ارجعی کی آواز سنی تو محلہ فتح کدل میں حضرت شاہ قاسم حقانیؒ کے آستانہ کے قریب دریائے جہلم کے کنارے پر سپرد خاک ہوئے۔ آپ قاضی ولیؒ کے نام سے بھی مشہور رہیں۔

خواجہ زین علی دارؒ

خواجہ زین علی دار کے والد بزرگوار خواجہ عبداللہؒ، خواجہ رفیق عشائی ؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کی ایک دن خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کی حسن صورت اور حسن سیرت پر گرویدہ ہو گئے اور اپنی توجہ سے ان کو اپنی جماعت میں شامل کر کے ریاض و عبادت کی طرف مائل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس سماع گرم تھی اور اہل محفل وجد و حال اور قیل وقال میں پڑ گئے۔ زین علیؒ اپنی جگہ ہلنے جلنے کے بغیر خاموش بیٹھے رہے۔ جب محفل ختم ہوئی۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔ اصلی وجد اس جوان سے سیکھنا چاہیے۔ دوستوں نے دیکھا کہ ان کے ہر مقام سے لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کہتے ہیں زین علیؒ اپنے مرشد (خواجہ حبیب اللہؒ) کی نماز تہجد (آدھی رات کی نماز) کے واسطے ہر رات کو دریائے جہلم سے پانی کا گھڑا نوشہرہ لے جاتے تھے۔ ایک رات عید گاہ میں حضرت خضر علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے آپس میں بات چیت کرنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے پانی مرشد کے پاس پہنچانے میں دیر ہونے کا عذر کیا اور سیدھے پیر کے پاس گئے۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔ حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لئے تجھے مبارک باد دیتا ہوں۔ اب جلد ہی جا کر ان سے ملو۔ یہ

دوڑتے ہوئے آئے اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی۔ سلوک کے مرحلے اور منزلیں طے کرنے کے زمانے میں ان پر جذبہ، محویت، وجد اور حال کا اثر بہت سخت ہوتا تھا۔ ترانہ، نغمہ، گانا بجانا، ساز و سرور، چنگ، رباب کے نہایت دل دادہ تھے۔ برسات میں پانی کے کنارے بیٹھ کے لطف اُٹھاتے۔ مچھروں کا گھنگھنانا ان کے لئے نغمہ تھا اور ان کے ڈنک اور کاٹنے کا اثر ان پر نہیں ہوتا تھا۔ سماع، (نغمہ میں سننا) کے بارے میں ملا حسن خبازؒ کے ساتھ جھگڑے ہوئے لیکن یہ اپنے حال سے باز نہیں آئے۔ ۲۴ شوال ۱۰۴۲ھ کو رحلت کی اور زینہ دار محلّہ کاٹل میں دفن ہوئے۔ ''عارف خاص'' تاریخ وفات ہے۔

باباعثمان اوچپ گنائیؒ

سلطان زین العابدین بڈشاہ کا دور (۱۴۲۰-۱۴۷۰) کشمیر میں سنہری دور کہلاتا ہے۔ یہ ہر دلعزیز بادشاہ یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں یکساں مقبول تھا۔ اس لئے بعض لوگ اسے بڈشاہ یعنی عظیم بادشاہ کہتے ہیں۔ وہ علم وفن کا مربی تھا۔ عربی اور فارسی میں شعر کہتا تھا عالموں اور فاضلوں کا بڑا قدردان تھا اور خود نہایت متقی اور پرہیزگار تھا۔ چنانچہ صوفیا اور اولیاء کبار کا گرویدہ تھا۔ ان سے ہمیشہ عزت واحترام کیساتھ پیش آتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں اپنے بزرگان دین وادی کشمیر میں جلوہ افروز ہوئے جن میں اکثر بلند پایہ عالم وفاضل ہونے کے ساتھ ساتھ روحانیت کے عظیم علمبردار تھے ان میں سید محمد مدنیؒ، سید محمد عالیؒ، سید محمد امین اویسیؒ، شیخ نورالدین ولیؒ، بہاؤ الدین گنج بخشؒ، باباعثمان اوچپ گنائیؒ قابل ذکر ہیں۔ ان سب اولیائے کرام کے فیض وبرکت سے یہاں کے بے شمار لوگ مستفید ہوئے لیکن یہاں پر اس دور کے برگزیدہ ولی کامل باباعثمان اوچپ گنائیؒ کے حالات و کرامات پر تھوڑی بہت روشنی ڈالیں گے۔

حضرت اوچپ گنائیؒ سرینگر میں تولد ہوئے اپنے عہد کے باا ثر لوگوں میں سے تھے اس زمانہ کے رواج کے مطابق لکھے پڑے لوگوں کا

لقب جن میں عالم، منشی، مفتی، پٹواری وغیرہ تھے کو گنائیؒ کہہ کر پکارتے تھے
اوچپ گنائیؒ مروجہ تعلیم سے فارغ ہوئے خداشناسی کا ذوق اور شوق ان کے
دل میں موجزن ہوا۔آپ زمانے کے اکابرین اور شہر کے رئیسوں میں سے
تھے جاہ وحشم اور مال میں نامی گرامی تھے۔رات دن عبادتوں میں مشغول
رہتے۔آپ مرشد کی تلاش کی فکر میں پڑ گئے یہاں کے دوستوں سے مشورہ
کر کے سفر کا ارادہ کیا اور دنیا کے اطراف کی سیر وسیاحت کرتے ہوئے مکہ
شریف پہنچ گئے وہاں شیخ اسحاق شطاریؒ کی خدمت میں پہنچے جو سلسلہ عطاریہ
کے ایک کامل عارف تھے اور ان سے بیعت کی استدعا کی۔حضرت شطاریؒ
نے تسلیم کرتے ہوئے آپ سے فرمایا کہ آپ کے مرشد بہاؤالدینؒ کشمیر میں
ہیں۔حضرت اوچپ گنائیؒ ارکان حج پورا کرنے کے بعد کشمیر آئے اور
حضرت شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ کی محبت اور ملازمت سے مشرف یاب ہوئے
اور ان کے زیر تربیت رہ کر خود نہایت محنت اور جانفشانی سے وہ عبادتیں
بجالائیں جن سے وہ اعلیٰ مرتبہ پر پہنچے۔حضرت بہاؤ الدین کے علاوہ
حضرت شیخ نورالدینؒ، باباحاجی ادھمیؒ کی صحبت سے مزید فائدے حاصل
کئے۔سلطان زین العابدین بڈشاہ اوچپ گنائیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا
اور التماس کی کہ میرا ارادہ جھیل ولر کی سیر کرنا ہے۔اس لئے آپ کی رفاقت
چاہتا ہوں حضرت باباؒ نے اس کی التماس قبول کی اور فرمایا کہ آپ چلے
جائیں ہم بھی آجائینگے یہ سن کر بادشاہ کشتی میں بیٹھا اور جھیل ولر کی طرف
روانہ ہوا جب وہ جھیل کے بیچ میں پہنچا تو اُس۔نے دیکھا کہ باباعثمان گنائیؒ

اپنے سجادہ پر بیٹھے ہوئے پانی پر سے گزر رہے ہیں بادشاہ اور اس کے رفقاء نے ان کی اس کرامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انہوں نے مقرر شدہ جگہ پر پہنچ کر باہم ملاقات کی۔ گنائی کا لقب اوچپ گنائی کو بڈشاہ کے وقت میں ملا اس خاندان کے سب افراد اہل علم تھے۔ اس بناء پر کشمیر میں یہ شعر فرقہ گنائی کے متعلق مشہور رہے۔

گنائی بہ کشمیر دانا بود

خداوند تربیر و خامہ بود

کشمیر میں گنائی مختلف طبقوں میں منقسم ہیں ایک وہ جو حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو سید تھے یا مغل یا پٹھان یا قریشی جن کو یہ خطاب ملا ان کی اولاد بھی گنائی ہی کہلاتی رہی۔ تیسرے کشمیر کے نو مسلم جن میں برہمن کھتری ہیں، تاریخ شاہد ہے کہ اوچپ گنائیؒ کا خاندان کشمیر کا نامور ذی علم طبقہ رہا ہے۔ جن کے علم و فضل اور زہد پر کشمیریوں کو ہمیشہ ناز رہیگا۔ جن میں خاص طور پر ملا فیروز گنائیؒ، ملا الماس گنائیؒ، ملا نونی گنائیؒ اور نتو گنائیؒ گذرے ہیں۔ حضرت بہاؤ الدین گنج بخش سے فیض پانے کے بعد آپ ایک مدت تک ارشاد سید آیت کے مسند پر بیٹھے رہے اور طالبان حق کی رہنمائی فرمائی۔ جب آپ نے رحلت فرمائی تو مزار سلاطین زینہ کدل میں مرزا حیدر دوغلت کی قبر کی مغرب کی طرف سپرد خاک ہوئے۔

بُخاری سادات

سید جلال الدین بخاریؒ

ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تھا آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بڑا گروہ جو کہ وسط ایشائی ریاستوں کی سرسبز وادیوں میں سکونت پذیر تھا نے تمام آرام وآسائش ترک کر کے رختِ سفر باندھا تا کہ مختلف اطراف میں اسلام کی اشاعت کریں۔ ان ہستیوں میں جلال الدین بخاریؒ اور بہت سارے سادات کرام بھی شامل ہیں۔ ان سادات میں چند بزرگان نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کی۔

ان ہی بزرگوں میں سید جلال الدین بخاریؒ تھے۔ ان کو بخارا میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ یہ خاندان علم وفضل کے لئے بھی مشہور تھا۔ آپ بخارا سے ہجرت کر کے ملتان تشریف لائے۔ ملتان میں سید جلال الدینؒ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی خانقاہ میں مقیم رہے یہ خانقاہ دور دور تک مشہور تھا۔ آپ ۲۰ سال اپنے پیر ومرشد کی خدمت میں حاضر رہے۔ حضرت مخدوم بخاریؒ نے جہاں افغانستان، ایران، ترکی، عراق، کاشغر اور دوسرے ممالک کی سیر وسیاحت فرمائی وہاں کشمیر بھی ان کی تشریف آوری سے مستفید ہوا۔

آپ حضرت امیر کبیرؒ کے وارد ہونے سے کوئی چوبیس سال پہلے ۱۳۴۸ء میں سلطان علاؤالدین کے دور حکومت میں کشمیر وارد ہوئے۔ آپ نے کچھ عرصہ یہاں مختلف علاقہ جات کا دورہ کر کے تبلیغ اسلام کے لئے کام کیا۔ اس کے بعد واپس ہندوستان تشریف لے گئے آپ نے آٹھ مہینے کچھامہ بارہمولہ میں قیام کیا۔ آپ کی کشمیر میں تشریف آوری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ کا استقبال اس طرح ہوا۔ کہ تاریخ کشمیر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس خوشی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جہاں جگہ جگہ لاکھوں کی تعداد میں عام کشمیری ان کے استقبال کے لئے نکلے۔ وہاں رعایا کے ساتھ ساتھ کشمیر کے بادشاہ علاؤالدین اور ایک عارفہ کاملہ عورت جو کہ لل دید کے نام سے پورے ملک میں مشہور ہے بھی شامل استقبال تھی۔ جب لل دید بخاری صاحبؒ کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے عارفہ کو دلاسا دیا اور حضرت میر سید حسین سمنانیؒ کے کشمیر آنے کی بشارت دی اور کہا کہ دین کی راہ میں وہی تمہارے رہبر اور وہی تم کو حق الیقین تک پہنچائیں گے۔ آپ نے چالیس برس تک مختلف سفر کئے اور سات مرتبہ حج کئے۔ حضرت مخدومؒ ایک صاحب بصیرت بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عالم باعمل بھی تھے۔

حضرت مخدومؒ نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے آپ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت پابند تھے۔ عبادت، ریاضت میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ دن رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت کو عربی، فارسی زبانوں پر پورا عبور تھا۔ ہندی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انہیں عربی اور

فارسی کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔آپ کا ذاتی کتب خانہ معیاری اور نایاب کتب کا ایک بیش بہا خزانہ تھا۔ درس وتدریس حضرت کا محبوب مشغلہ تھا۔ عام طور پر فجر کے بعد آپ کا درس شروع ہوا کرتا تھا آپ طلبہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔اپنے پاس سے ان کو کتابیں دیتے تھے۔غریب طلبہ کی مالی امداد بھی فرماتے تھے۔آپ ۹۵ سال کی عمر میں ۱۹ جمادی الاول ۶۹۰ھ کو رحلت کر گئے اور اوچہ ملتان میں سپرد خاک ہیں۔سید علاؤ الدین بخاریؒ جو کہ حضرت جلال الدینؒ کے پوتے تھے۔آپ اپنے چار بیٹوں سید تاج الدینؒ، سید ضیاؤ الدینؒ، سید محمد بخاریؒ اور سید فخر الدینؒ کے سمیت وارد کشمیر ہوئے۔ حضرت سید علاؤ الدین بخاریؒ ایک سال تک وادی کشمیر کے مختلف اطراف میں ۷۸۶ھ میں تحصیل بیروہ کے موضع سکندر پورہ میں مستقل طور قیام پذیر ہوئے۔آپ نے یہاں احیاء دین کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کر کے درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔اس کار خیر میں آپ کے چاروں فرزندان ارجمند برابر کے شریک رہے۔اس خانقاہ سے کشمیر کے جنوب و مغرب کا پورا علاقہ خاص طور پر وحدانیت کے ابر بہار سے سرسبز شاداب ہو گیا۔ حضرت سید علاؤ الدینؒ ایک بہت بڑے عالم دین، مفسر اور محدث تھے۔ سلطان قطب الدینؒ کی وفات پر جب سلطان سکندر تخت نشین ہوا۔ سلطان حضرت سیدؒ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کا طالب اور مرید ہو گیا۔اس کے بعد بادشاہ کئی مرتبہ حضرت کے پاس حاضری دینے کے لئے آیا۔

سلطان سکندر نے سیدؒ سے سرینگر میں مستقل قیام فرمانے کی استدعا

کی چنانچہ آپ رضامند ہو گئے اور گیارہ بارہ سال کا ندہامہ میں گذارنے کے بعد شہر سرینگر آئے۔ سلطان نے آپ کے لئے شاہی محل کے ساتھ ایک عمدہ عمارت بنائی اور اس کے علاوہ ایک مسجد، ایک خانقاہ اور ایک مسافر خانہ بھی تعمیر کروایا۔ سلطان سکندر نے بیروہ بڈگام کے تین گاؤں سکندر پورہ کا ندہامہ اور آرت آپ کی جاگیر میں دیئے۔ اس طرح اپنی آخری عمر تک سرینگر میں ہی قیام فرمایا۔ کشمیر میں سولہ سترہ سال تبلیغ دین کرتے رہے اور ۸۰۲ھ میں انتقال کیا۔

حضرت امیر کبیرؒ جو ایک عظیم مشن لیکر وارد کشمیر ہوئے تھے اس کی تکمیل میں حضرت سید علاؤ الدین بخاریؒ کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے آپ کے انتقال پر سلطان سکندر نے تجہیز و تکفین خود کی اور آپ کے جسد مبارک کو مزار سلاطین سرینگر میں سپرد خاک کیا۔ آپ کے دو فرزند سید ضیاؤ الدینؒ اور سید فخر الدینؒ بہت ہی مشہور ہوئے آپ کی ذریت بھی ان ہی دو فرزندان سے ہوئی۔ باقی دو صاحبزادے لاولد رحلت کر گئے۔ سید فخر الدینؒ اپنے والد صاحب کے شہر سرینگر چلے جانے کے بعد حسب ارشاد والد محترم سکندر پورہ میں ہی سکونت پذیر ہوئے۔ سید فخر الدینؒ سے محمد مراد بخاریؒ ۷۹۸ھ میں تولد ہوئے۔ جناب سیدؒ نے قرآن پاک کم عمری میں حفظ کیا۔ اس کے بعد تفسیر قرآن علم وحدیث علم، فقہ اور دیگر علوم کا درس اپنے والد اور اس کے بعد اپنے چاچا سے لیا۔ جب آپ کی عمر تیس سال کی تھی آپ نے بخارا اور مشرق وسطی کا سفر کیا اس کے بعد آپ مکہ اور مدینہ بھی تشریف لے گئے۔

اپنی اٹھارہ سالہ سیاحت کے بعد ۸۴۶ھ میں آپ دوبارہ کشمیر وارد ہوئے۔ قصبہ بارہمولہ میں پڑاؤ ڈالا اور یہاں ہفتہ بھر قیام پذیر رہ کر آپ نے سکندر پورہ کا ارادہ باندھا۔ لہٰذا شاہراہ عام کے بجائے پہاڑی سخت راستے سے دوبارہ سفر شروع کیا۔ یہاں تک کہ آپ ایک گھنے جنگل میں واقع ایک مرغزار پہنچے اور یہاں پر پڑاؤ ڈالا۔ جناب سید پاکؒ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ قدرت کے نظاروں کا بھرپور مشاہدہ کیا اہل قافلہ کو ہدایت فرمائی۔ دل نے گواہی دی کہ یہی وہ جگہ ہے کہ جس کی بشارت مجھے پہلے دے دی گئی۔ لوگوں سے اس جگہ کا نام پوچھا تو جواب ملا اس جگہ کو کریری کہتے ہیں۔ جب حضرت سیدؒ کے وارد کشمیر بہ مقام کریری خیمہ زن ہونے کی خبر کشمیر کے اطراف واکناف میں پھیل گئی تو بڈشاہ اپنے وزیر ملک احمد یتو کے ساتھ کریری روانہ ہوا اور ان سے ملاقات کی۔ آپ نے بہت ساری کتابیں تصنیف کی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے حمد، مناجات لکھی ہیں۔ آپ 17 ذی الحجہ ۸۶۱ھ کو اس دنیا سے چل بسے۔ کریری میں آپ کی آخری قیام گاہ ہے۔ سلطان بڈشاہ اپنے وزراء کے ہمراہ آپ کے جنازے میں شریک ہوئے۔ حاجی محمد مراد بخاری کی ذُریت جن کو سادات بخاری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پورے برصغیر اور کشمیر کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کشمیر کے جن بخاری سیدوں نے ترک کشمیر کے بعد پنجاب میں سکونت اختیار کی ان میں سید احمد شاہ بخاری بھی ہیں۔ جنہیں ادبی حلقوں میں پطرس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خانقاہ اندرابیہ ملارٹہ

سید میر میرک اندرابیؒ

اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا فضل وکرم ہے کہ سرزمین کشمیر کے لوگ پہلے حضرت سید عبدالرحمٰنؒ المعروف بُلبُل شاہ صاحبؒ اور دوئم حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مزید اسلام کی نگہداشت کے لئے حضرت امیر کبیرؒ نے سادات کرام کا ایک وسیع کارواں اپنے ساتھ لایا اور انہیں یہاں دور دور تک بسایا۔ غالباً ان کی تعداد سات سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان ہی سادات کرام میں سے حضرت سید احمد اندرابیؒ اپنے ماموں جان حضرت امیر کبیرؒ کے ساتھ کشمیر میں جلوہ افروز ہوئے۔ ۲۵ واسطوں سے ان کا شجرہ نسب حضرت شاہ ولایت علی المرتضیٰؓ سے جاملتا ہے۔ سید احمد اندرابی کا ۸۰۴ھ میں انتقال ہوا۔ اور مزار سلاطین کلان میں سپرد خاک ہیں۔ سید احمدؒ کے جد امجد سید مسلمؒ نام ایک بزرگ گذرے ہیں جنہوں نے بعض وجوہات سے سرزمین عرب کو خیر باد کہہ کر اندراب کا رُخ کیا جو کابل اور بلخ کے درمیان ایک مشہور قصبہ ہے۔ سبد مسلمؒ کی اولاد نو پشت تک اندرابی میں رہی دسویں پشت سے پیدا سید احمد اندرابیؒ کشمیر

تشریف لائے۔ اس زمانے میں کشمیر میں سلطان قطب الدین کی حکومت تھی۔ حضرت امیر کبیر واپس تشریف لے گئے۔ لیکن بہت سارے سادات کشمیر میں ہی قیام پذیر ہوئے جن میں سید احمد اندرابیؒ بھی تھے۔ سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد جب سلطان سکندر کشمیر کا بادشاہ بنا تو وہ علماء اور سادات کی بڑی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ایران اور وسط ایشیا سے بہت سارے علماء اور صوفی کشمیر آئے۔ سلطان ان سے عزت واحترام سے پیش آتا تھا اور ان کو جاگیریں عطا کرتا۔ سلطان سکندر نے سید احمد اندرابیؒ کے لئے ایک خانقاہ ملارٹہ میں تعمیر کی۔ جس کو آج کل خانقاہ اندرابیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس خانقاہ کے اخراجات کے لئے چند دیہات بطور جاگیر نامزد کئے۔ محلّہ ملارٹہ بہوری کدل اور پاندان نوہٹہ کے درمیان واقع ہے۔ ملارٹہ ایک زمانے میں ملا عراقی ہٹہ کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ یہاں ملا محمد عراقی کی کئی دکانیں اور مکانات موجود تھے۔ ملا محمد عراقی اس زمانے میں جبکہ سلطان سکندر کشمیر کا بادشاہ تھا یہیں مقیم تھے۔ سلطان سکندر کی بنائی ہوئی اس خانقاہ کے ساتھ ہی سلطان بڈشاہ نے حسن عقیدت کی بنا پر ایک شاندار مسجد بنوائی۔ اس کے ساتھ ایک حمام بھی بنوایا۔ ابولبرکات خان صوبیدار کشمیر کے عہد میں خانقاہ اندرابیہ آگ کی ایک واردات میں شہید ہوئی لیکن مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور خانقاہ کو از سر نو تعمیر کیا گیا شیخ غلام محی الدین گورنر کشمیر کے وقت میں خانقاہ کی خوبصورتی کو اور بھی بڑھاوا دیا گیا اور یہ خانقاہ آج بھی اہل اسلام کے لئے باعث فیض و

برکت ہے۔ چونکہ سید احمد اندرابیؒ سے کشمیر آئے تھے۔ اس لئے اندرابی کے نام ہی سے مشہور ہیں اور آپ کی اولاد ہر چند کہ اب کشمیر اور کشمیر سے باہر مختلف مقامات پر ہیں سادات اندرابیہ کہلا رہی ہیں۔

سید احمد اندرابیؒ کی چوتھی پشت میں سید محمد میرک اندرابیؒ ہیں۔ ان کا شجرہ نسب یوں ہے۔ سید احمد اندرابیؒ، سید محمد عزیز الدینؒ، سید شمس الدین اندرابیؒ، سید میرک اندرابیؒ۔

سید میرک اندرابیؒ ملارٹہ سرینگر میں تولد ہوئے۔ آپ مادر زاد ولی تھے اور اپنے عہد میں عبادات اور کشف کرامات میں یکتا تھے۔ کہتے ہیں کہ اہل غفلت میں سے جو کوئی آپ کی کیمیا اثر نظر کے آگے سے گذرتا۔ اسی وقت اس نگاہ کی تاثیر سے آگاہ ہو کر یاد حق کا راغب ہو جاتا۔ ان کے عقیدت مندوں میں امراء و سلاطین وقت بھی تھے۔ مگر انہوں نے بارہا امراو سلاطین کی پیشکش ٹھکرائی کیونکہ صرف فضل اللہ و توکل تہ اللہ سے دل و جان کو محود مشغول رکھنا انہیں پسند تھا۔ فقر و فاقہ انہیں زیادہ عزیز تھا۔ کسی کا دیا ہوا تحفہ یا نقد و جنس کبھی بھی اپنے مصارف میں استعمال نہیں فرمایا۔ بچپن کے آغاز سے ہی رشد و صلاحیت کی علامتیں آپ کے جبین مبارک سے ظاہر تھیں۔ غیبی اشارے سے آپ نے حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ کا دامن پکڑ لیا۔ دنیوی مشاغل کو ترک کر کے تھوڑی مدت میں سلوک کے مقامات و منازل طے کر کے اپنے اسلاف کی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے اور عبادات میں محورہ کر کبھی رات کو مراقبہ میں کپڑے پھاڑ ڈالتے۔ راتوں کو سالہا سال

تک آپ ہمیشہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے اور صبح کی نماز کے بعد ہمیشہ کبرت احمر و اوراد شریف پڑھتے تھے۔ ہمیشہ باطہارت رہنے کی آپ کو عادت تھی۔ ۴۰ برس تک شب بیدار اور دن کو روزہ دار رہے۔ اکثر وقتوں پر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کی خاص صحبت سے مستفید رہتے۔ نیکیوں کے مجسمہ تھے اور ان کی دعائیں بارگاہ الٰہی میں مقبول تھیں۔

آخری عمر میں سید محمد حسن قمیؒ کے بیٹے سید عبداللہؒ کی بیٹی سے نکاح کیا۔ تین بیٹے اور چھ بیٹیاں اس سے پیدا ہوئیں۔ جن میں ایک بیٹی شیخ بابا داؤد خاکیؒ کی گھر والی تھی۔ ۵ صفر ۹۹۰ھ میں سفر عقبیٰ اختیار کیا اور ملا عراقی ہٹہ جواب نو ہٹہ کے نام سے مشہور ہے میں سپرد خاک ہوئے تب سے اب تک متواتر ان کا یوم وصال پورے عقیدت و احترام کیساتھ منایا جاتا ہے۔ آپ کی قبر پر یہ دو شعر لکھے ہوئے ہیں۔

چو میرک میر سید مرشد وقت
توجہ جانب فردوس فرمود
پی تاریخ وصلش سائل عقل
بگفتا پنجم از شہر صفر بود

☆☆☆

ملا محسن فانیؒ

آپ کا نام محمد محسنؒ تھا اور آپ نے فانیؔ تخلص اختیار کیا تھا والد صاحب کا نام شیخ حسنؒ تھا اور دادا جان کا نام شیخ محمودؒ تھا۔ آپ کے جد اعلیٰ شاہمیری بادشاہوں کے دربار میں کافی اثر ورسوخ کے مالک تھے جن کا نام میر محمد تھا۔ یہ خاندان میر اور شیخ دونوں قبیلوں کو یاد کیا جاتا تھا آپ نے علم وفضل میں کمال حاصل کیا۔ لاہور دہلی وغیرہ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی۔ جن میں خاص طور پر وسط ایشیاء کے ممالک شامل ہیں۔ سیاحت کے دوران وہ نذر محمد خان وائی بلخ کے دربار میں بھی رہے۔ سفر سے آکر شہنشاہ ہندوستان شاہ جہاں نے ان کے علم ونذیر کا لحاظ رکھتے ہوئے الہ آباد میں صدارت کے عہدے (چیف جسٹس) پر فائز کیا۔ اور پھر کشمیر میں اس عہدے پر تعینات کیا۔

۱۶۴۶ء میں جب شاہ جہاں کے فرزند مراد بخش نے بلخ فتح کیا اور حاکم بلخ نذر محمد خان مال ومتاع چھوڑ کر بھاگ گیا تو اس کے کتب خانے سے دیوان محسن فانیؔ ملا۔ جن میں خان مذکور کی تعریف میں ان کے اشعار موجود تھے۔ اس سے فانی شاہؒ جہاں کی نظروں سے گر گئے۔ اور اپنے عہدہ سے نکالے گئے۔ اس کے باوجود ان کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اور آخری

دم تک کشمیر میں درس وتدریس میں مشغول رہے۔ ان کے تعلقات شہزادہ داراشکوہ (فرزند شاہ جہاں) کے ساتھ بڑے خوشگوار تھے۔ اس زمانے میں کشمیر کے اکثر عالموں نے فانی کے بعض اقوال پر اعتراض شروع کردیئے اوران کے ساتھ ہمیشہ حسد اور رقابت رکھی۔ ان عالموں نے شاہ جہاں کو فانیؒ کے خلاف اُکسایا۔ شاہ جہاں نے اس وقت کے گورنر ظفر خان احسن کو لکھا ان مسائل کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے۔ مگر داراشکوہ نے مداخلت کر کے معاملے کو ٹال دیا۔ شہزادہ نے فانی سے تصوف، فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ بہر حال فانیؒ ایک آزاد خیال فلسفی عالم، شاعر، ادیب اور اعلیٰ پایہ کا مفکر تھا۔ صلح کل کا مفکر تھا آپ کے دولت خانہ میں عالموں، فاضلوں اور امراء کا ہجوم رہتا تھا۔ فانیؒ کے تعلقات سرمدؒ کے ساتھ بھی تھے کیونکہ سرمدؒ اس زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بھی ایک باعزت مقام رکھتے تھے۔ ان کی رباعیات بڑی پُر لطف ہیں۔ سرمدؒ کو اورنگ زیب نے دہلی میں جامع مسجد کے سامنے پھانسی کی سزا دی۔

فانیؒ کو ایک رقاصہ نچی سے محبت تھی اور دونوں کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ رقاصہ بڑی خوبصورت تھی۔ مُلا طاہر غنی اس کے برادر ملا محمد زمان نافی اور حاجی اسلم سلیم ان کے شاگرد تھے۔ ۱۶۵۸ء میں جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا۔ تو علماء نے پھر محسن فانیؒ اور ملا آخونؒ کے خلاف آواز اُٹھائی چنانچہ آگرہ سے ملا شاہؒ اور فانیؒ کی طلبی کا پروانہ جاری ہوا۔ لیکن کشمیر کے گورنر نے لکھا کہ یہ دونوں ان دنوں کشمیر میں کمزور اور بیمار ہیں

دونوں سفر کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ کچھ وقت گذر گیا ملا شاہؒ نے اورنگ زیب کی تعریف میں کچھ اشعار روانہ کئے۔ جو کہ ان کی تخت نشینی پر لکھے تھے۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے اپنا یہ حکم منسوخ کر دیا اور یہ لکھا کہ ملا شاہؒ بجائے کشمیر کے لاہور میں قیام کریں اور ۱۶۶۰ء میں لاہور گئے جبکہ محسن فانیؒ کشمیر میں ہی رہے اور گوشہ نشینی اختیار کی اور لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ فقط چند خاص حکام اور مریدان کے پاس آتے تھے۔ مگر درس و تدریس کا کام جاری رہا۔ اس کے علاوہ نمازوں میں مصروف رہتے تھے۔

جب اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۶۵ء میں کشمیر آیا تو محسن فانیؒ کو بھی اپنے دربار میں طلب کیا اور شاہی خلعت سے نوازا اور دو ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا اور دیر گئے تک ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ فانیؒ کی مثنویات کا مجموعہ جو مثنویات فانیؒ کشمیری کے نام سے مشہور ہیں شائع ہوا ہے اور ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے ایک فاضلانہ مقدمے کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ فانیؒ نے دیوان فانی بھی لکھی جو پہلی دفعہ ۱۸۹۳ء میں حیدر آباد دکن سے باہتمام مولوی محمد رحیم الدین شائع ہوا تھا۔

دبستان مذاہب:-

فانیؒ نے ۱۶۴۵ء میں کتاب ''دبستان کشمیر'' پری محل میں بیٹھ کر لکھی ہے اس پر اس زمانے کے تمام عالم ناراض ہو گئے۔ اور اس پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اس کتاب میں کشمیر کے واقعات بھی درج ہیں۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت ایک انگریز ولیم کی کوشش سے ہوئی۔ یہ بہت ہی مشہور کتاب ہے

اس میں براعظم ایشیاء کے مختلف مذاہب کے بارے میں جانکاری دی گئی ہے۔اس میں بارہ سیکشن ہیں جن کو تعلیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فانیؒ نے نجات المومنین کے نام سے نثر میں ایک رسالہ لکھا ہے۔فانی کی شاعرانہ عظمت وجلال کی برتری کو اس وقت کے عالموں نے سراہا ہے۔ ایرانی مفکرین نے بھی ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔طاہر غنی، اسلم اور محمد زماں نافع جیسے باکمال شاگردوں نے فانیؒ کی شاعری کو اور چمکایا۔فانیؒ اپنے کلام کے متعلق کہتے ہیں کہ میں گہری سوچ اور فکر کے بعد شعر کہتا ہوں۔ میرے شعر میرے دل سے خود رو پودے کی طرح پھوٹتا ہے۔ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ فانی صاحبؒ جب الہ آباد میں تھے تو وہ ہندوستان کی بہت سی چیزیں پسند کرتے تھے۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے کشمیر کو چھوڑ کر ہندوستان میں رہنا پسند نہیں کیا۔

فانیؒ لوگوں کو ہمدردی کا سبق دیتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ اخوت، مساوات سے پیش آنا بھی سکھاتے ہیں۔ دشمنوںؒ کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دوسروں کے عیبوں پر پردہ پوشی کرنے کی تلقین کرتے ہیں فانی نے عمدہ اور اچھی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان میں وعظ نصیحت کی ہے۔درس و تدریس دیا ہے۔ اگر چہ یہ رباعیاں تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔لیکن معنی کے لحاظ سے بلند پایہ اور قابل توجہ ہیں۔آپ کو ملا شاہ بدخشیؒ کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ جہاں آرا بیگم (شاہ جہاں کی بیٹی) بھی ملا شاہؒ کی مرید تھی۔ اپنی نسبت ایک جگہ لکھا ہے کہ میں بھی ملا شاہؒ کی مرید

ہوں اور آزاد خیال صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق ہے جو داراشکوہ اور اس کے مرشد کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ فانیؒ نے ۱۶۷۱ء میں سرینگر میں وفات پائی اور اپنے مکان کے صحن میں دفن کیے گئے۔ ان کا مقبرہ خانقاہ داراشکوہ عالی کدل اور زینہ کدل کے درمیان گور گاڑی محلّہ میں دریائے جہلم کے کنارے پر واقع ہے۔ فانیؒ کی اولاد کے بارے میں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک خواجہ قاسم ترمذیؒ کے نکاح میں تھی۔ اور دوسری ملا محمد کاؤسہؒ کے عقد میں تھی۔

سید نصیر الدین خانیاریؒ

سید نصیر الدین خانیاریؒ عالی شان سادات میں سے تھے جو پوشیدہ رہتے تھے۔لیکن کسی وجہ سے نمایاں ہو گئے۔محلّہ خانیار میں اس بزرگوار کی قبر شریف برکت اور انوار الٰہی کی جگہ ہے۔ان کی قبر کی ہمسائیگی میں ایک قبر نمودار ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک پیغمبر کی قبر ہے جو پرانے زمانے میں کشمیر میں مبعوث ہوئے تھے۔یہ جگہ پیغمبر کے مقام سے جانی جاتی ہے۔تاریخ کی کتابوں میں سے ایک تاریخ میں دیکھنے کو ملا کہ ایک سلطان زادہ نے زہد و تقویٰ کی راہ اختیار کر کے بہت ریاضت و عبادت کی اور کشمیر کے لوگوں پر رسول کی حیثیت سے مبعوث ہو کر کشمیر آ گیا۔رحلت کے بعد انزمر میں آسودہ ہوا۔اس کتاب میں اس پیغمبر کا نام یوز آصفؑ لکھا گیا ہے انزمر خانیار میں واقع ہے۔ملا احمد نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک پیغمبر زادہ یوز آصف سلطان زین العابدین کے عہد میں مصر سے یہاں آیا اور یہی پر رہا۔تحقیق سے معلوم ہوا کہ یوز آصف حضرت موسیٰ پیغمبر علیہ اسلام کی اولاد میں سے تھے۔یوز آصف نے سید نصیر الدینؒ کی دوستی اور ہم نشینی میں اپنی عمر گذاری روشن ضمیر اور صاحب دل لوگ کہتے ہیں کہ اس قبر سے نبوت کا نور جلوہ گر ہوتا ہے۔اس تاریخی مقبرہ کی اہمیت اس بات سے بھی بنتی ہے کہ مرزا غلام

احمد قادیانی کے مطابق اسی مقبرہ میں حضرت عیسیٰؑ سپرد خاک ہیں۔ان کے
مطابق حضرت عیسیٰؑ کو نہ صلیب پر چڑھا کر پھانسی دی گئی اور نہ ہی آسمان پر
چڑھایا گیا بلکہ وہ کشمیر آئے اور یہاں پر قدرتی طور پر ان کا انتقال ہوا اور
یہاں ہی روضہ بل میں سپرد خاک ہیں۔

امام باڑہ حسن آباد و دیگر تاریخی عمارات

کشمیر میں شیعہ مسلک کے بانی میر شمس الدین اراکیؒ جو ایران کے شہر اراک میں پیدا ہوئے تھے اور شہمیری خاندان کے بادشاہ حسن شاہ (جو زین العابدین بڈشاہ کا پوتا تھا) کے دور حکومت میں شاہ خراسان کی طرف سے بحیثیت سفیر کشمیر بھیجے گئے۔ یہاں ۸ سال قیام کے دوران تبلیغ دین کرتے رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے حسن آباد کے بابا علی نجار کو اپنا ہم خیال بنایا۔ اس کے علاوہ بہت سارے امراء اور وزرا امیر شمس الدین اراکیؒ کے پیرو کار بن گئے جن میں ملک موسیٰ رینہ ملک کاجی چک اور ملک دولت چک قابل ذکر ہیں۔ دولت چک سلطان اسماعیل شاہ کے وقت میں کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ دولت چک فقہ جعفریہ کا حامی اور سرپرست تھا۔ اسی دوران خانقاہ کو مسلکی فسادات سے کافی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد ۱۷۶۴ء میں خانقاہ کی تعمیر نو کی گئی۔ مگر اب اس خانقاہ کا نام ونشان ہی نہیں رہا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور حکومت میں اس خانقاہ سے بڑے بڑے پتھر اکھاڑے گئے اور ان پتھروں کو بسنت باغ گھاٹ میں استعمال کیا گیا۔ بابا علی نجار کا روضہ بھی اس کے نزدیک ہی ہے۔ جس کے اب صرف کھنڈرات موجود ہیں۔ حسن آباد میں جو امام باڑہ تعمیر ہوا ہے وہ خانقاہ معلیٰ شمس واری

سرینگر کے ایک دیندار تاجر مرزا محمد علی نے شیعیان کشمیر کے ایک روحانی عالم دین آغا سید مہدیؒ کی عظیم شخصیت سے متاثر ہوکر ڈل کے ان کمزور طبقوں کے لئے تعمیر کیا ہے جو کمزور طبقے امام باڑہ جڈی بل میں اس وجہ سے حاضری دینے میں کتراتے تھے کہ مذکورہ امام باڑہ پر روسائے ملت کا غلبہ تھا۔ مرزا صاحب نے امام باڑہ حسن آباد کی تعمیر اپنے ذاتی خرچہ سے کی ہے۔ اس کے علاوہ حسن آباد میں زمین کا ٹکڑا لنگر باغ کے نام سے ابھی بھی موجود ہے۔ جس کو دولت چک نے خانقاہ کے ساتھ ہی بنوایا تھا۔ امام باڑہ کے شمال میں لنگر باغ کے متصل پتھروں کی ایک مسجد ہے جو اب خستہ ہو چکی ہے۔ یہاں ساتھ ہی ایک مقبرہ مُلا مقبرہ کے نام سے موجود ہے۔ جس میں بڑے بڑے علماء، شعراء، مفکرین اور طبیب دفن ہیں۔ اس کے علاوہ نزدیک ہی ایک اور مقبرہ ہے جس میں کشمیری مرثیہ کے مصنفین دفن ہیں جو زیادہ تر خاندان حکیم اور خاندان منشی سے تعلق رکھتے تھے۔ دولت چک نے حسن آباد میں وسیع باغات پھل دار درخت لگوا کر حسن آباد کو بابا حسن نجار کے نام سے منسوب کر کے ایک علیٰحدہ محلّہ کی حیثیت دی۔ مگر مخالفین کے ڈر سے ان کی میت کو چاڈورہ منتقل کیا گیا۔ حسن آباد میں ایک اور آستان مرزا صاحب کے نام سے موجود ہے۔ مرزا صاحب ایک متقی پرہیز گار اور روحانی کمالات کے حامل شیعہ پیر بزرگ تھے۔

ملہ کھاہ

کشمیر میں جب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تو قبرستانوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ایک قدیم قبرستان وجود میں آیا جو شہر سرینگر میں شنکر آچاریہ یا تخت سلیمان کے دامن میں واقع ہے یہ تاریخی مزار ہے۔ اس میں علماء شعراء اور مورخین سپرد خاک ہیں چونکہ یہ مقبرہ اونچائی پر واقع ہے۔ لہٰذا برف اور بارشوں کے دنوں میں یہاں پر مردوں کو دفنانا مشکل کام تھا۔ لہٰذا ایک نئے قبرستان کی تلاش ہوئی اور وہ قبرستان رعناواری اور شیام پور موجودہ شہاب الدین پورہ کے وسط میں واقع ہے۔ جسے ملہ کھاہ مقبرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سلطان شہاب الدین نے ہاری پربت کے جنوب میں اپنا دارالخلافہ قائم کیا جس کا نام شہاب الدین پورہ ہے۔ اس وقت اس دارالخلافہ کا کوئی وجود نہیں۔ البتہ ان کے عہد میں وسط ایشیا سے سید تاج الدینؒ اس دارالخلافہ میں تشریف لائے اور وہ یہاں پر ہی سپرد خاک کئے گئے ہیں۔ اس دارالخلافہ کے نزدیک ایک بہت بڑا باغ تھا۔ جس میں میوے دار درخت لگے ہوئے تھے۔ اس باغ کو باغ انگوری کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ سلطان سکندر ۱۳۸۹-۱۴۲۳ء کے عہد حکومت میں میر محمد ہمدانیؒ نے اس باغ کو خرید لیا اور

مسلمانوں کے مقبرہ کے لئے وقف کیا اس کے بعد شیخ اسلام باباؒ، اسماعیل کبرویؒ نے بھی اس مقبرہ کی دیکھ بال کی۔ یہ سرینگر شہر کا وسیع ترین قبرستان ہے اس میں علماء امرا اور شیوخ الاسلام کی قبریں ہیں۔ اس قبرستان کے شمال میں مزار کلاں، بہاؤالدین واقع ہے جنوب مغرب میں سلطان شہاب الدین کا بسایا ہوا شہر شہام پور مغرب میں قطب الدین پورہ اور سکندر پورہ آباد ہیں۔

اس قبرستان میں قاضی موسیٰ شہید کی قبر ہے جو سنگی چبوتروں پر ہے قاضی موسیٰ شہید کی قبر کی لوح پر تاریخ شہادت الم نشرح لک صدرک لکھی ہوئی ہے۔ ان کی شہادت یعقوب شاہ چک کے عہد میں ہوئی۔ بدقسمتی سے مقبرہ پر ناجائز تعمیرات بنائے گئے ہیں جس سے مقبرہ کی خوبصورتی متاثر ہوئی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ مقبرہ کی زمین پر ناجائز قبضہ بھی کیا گیا ہے۔ اب حکام نے مقبرہ کے اردگرد ایک فصیل تعمیر کی ہے۔ بابا اسماعیل نے یہاں ایک مسجد بنوائی جس کو ہار مسجد کہا جاتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرینگر کے مختلف خاندانوں نے ملہ کھاہ کے الگ الگ حصوں پر قبضہ کیا۔ چنانچہ ملہ کھاہ کے بعض حصے مزار قاضی موسیٰ شہید، مزار خاندان میر واعظ کلاں اور مزار کاؤسہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ملہ کھاہ میں لاتعداد صوفی عالم اور فاضل دفن ہیں۔ البتہ جن قبروں کی نشاندہی کی گئی وہ یوں ہیں۔

قاضی موسیٰ، شیخ اسماعیل چستی، ملا مظہری، نازک کشمیری، مولوی رسول شاہ صاحب، مولوی غلام احمد صاحب، مولوی عتیق اللہ صاحب، قاضی اسداللہ، قاضی محمد اکبر اور قاضی مصطفےٰ وغیرہ۔

للّہ عارفہ (لل دید)

یوں تو کشمیر کے ادبی اور ثقافتی میدان میں ہزاروں برس سے بے شمار ممتاز اور نامور شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں اور اس جنت بے نظیر کے آسمان پر بہت سارے درخشندہ ستارے وقتاً فوقتاً جگمگاتے رہے ہیں۔ جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے نہ صرف وادی کشمیر کو منور کیا بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں چار چاند لگائے تاہم کشمیری مصنفوں، شاعروں اور فلسفیوں جنہوں نے ہماری سرزمین کو ممتاز اور قابل رشک بنایا۔ ان میں للّہ عارفہ عرف لل دید ایک خصوصی عظمت کا درجہ رکھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ کشمیری زبان میں لکھنے والوں کا منبع لل دید ہی ہے جس نے چودھویں صدی کے آغاز میں اپنی شاعری کا آغاز سلیس کشمیری میں کیا۔ اس سے پہلے ابھنیو گیت اور سوم آنند کی کتابیں سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہیں کشمیری زبان میں شعر کہنے کا اولین سہرا لل دید کے ہی سر ہے۔ اگر چہ اس زمانے کی کشمیری زبان میں بے شک سنسکرت الفاظ موجود تھے تاہم لل دید نے اس انداز سے شاعری کا دریا بہایا کہ یہاں کے رہنے والوں کو چھ سو سال کے بعد بھی وہ شاعری زبانی یاد ہے لل دید کے اشعار کو للہِ واکھ کہتے ہیں واکھ دراصل ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی زبان سے نکلی ہوئی بات۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ

Speech ہے۔ واکھ چار چار مصرعوں میں لکھے گئے ہیں۔

للہ واکھ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب موسیقی کے فنکاران کو ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں تو سامعین کے دل پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کی ترجمانی الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ یہ واکھ محض دل بہلانے کے لئے نہیں لکھے گئے بلکہ ایک گہرے روحانی تجربے کی عکاسی کرتے ہیں للہ واکھ ہمارے ورثے میں آتے ہیں جو ایک بیش بہا ثقافتی خزانہ ہے جس میں چھ سو سال سے زیادہ عرصہ گذرنے کے باوجود زمانے کے انقلاب سے کوئی رخنہ نہیں پڑا ہے۔ بیسویں صدی جس کو سائنس اور ٹیکنکلی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے میں رہ کر بھی لوگ للہ واکھ اسی ذوق سے سنتے ہیں جس طرح ہمارے بزرگ سنتے تھے اور عش عش کرتے تھے۔ لل دید کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے کچھ لوگ لکھتے ہیں کہ وہ پاندریٹھن میں پیدا ہوئی۔ کچھ لوگ کھنموہ میں اس کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ وہ سمپور گاؤں متصل پانپور ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئی۔ آپ کے والد کا نام ژندرہ بٹ تھا کہتے ہیں کہ لل دید بچپن سے ہی دنیاوی معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ شری ژندرہ بٹ کے خاندانی گورو پنڈت شری کنٹھ نامی ایک بلند درجہ کے سادھو، یوگی اور پیر کامل تھے۔ شری کنٹھ سدھ مول کے نام سے مشہور ہیں۔ مرشد نے شروع سے ہی لل دید کی صلاحیتوں کو بھانپا اور ان کی روحانی تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی لل دید ابھی گیارہ برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ رسم مروجہ کے مطابق ان کی شادی پانپور کے

ایک پنڈت گھرانے میں ہوئی یہاں آپ کا نام پدماوتی رکھا گیا۔ سسرال میں آپ کی زندگی بڑی دُکھ بھری گذری کہاوت ہے کہ آپ کی ساس آپ کو طرح طرح کی اذیتوں کا شکار بناتی، طعنے دیتی اور تنگ کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ آپ کے قدرتی رجحان کا جھکاؤ اس دنیا کے بجائے عقبیٰ کی طرف تھا کہا جاتا ہے ساس لل دید کے کھانے کے برتن میں ایک گول پتھر رکھتی تھی۔ تا کہ کھانا زیادہ لگے۔ مگر معرفت کی راہ پر چلنے والی یوگی اُف تک نہ کرتی۔ دن بھر گھر کا کام کاج کرتی اور رات اپنے معبود کی تلاش میں گذارتی تھی۔ ایک واکھ جو اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے یہاں ضرب المثل بن گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک تہوار پر جب لل دید حسب معمول دریا پر پانی بھرنے گئی۔ تو سہیلیوں اور پڑوسیوں نے پوچھا کہ آپ کے گھر کیا لذیز کھانا پکے ہیں تو اس خوب سیرت لڑکی نے جواب دیا۔ ؎

ہونڈ ماری تن کنہ کٹھ

للہِ نیلہ وٹھ ژلہ نہ زانہہ

چاہے بڑا بھیڑ ذبح کریں یا چھوٹا لل کا ساتھی نیلا پتھر ہی رہے گا۔

یہ اس راز کو چھپا کر رکھتی تھی اور کسی سے اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔

آپ کے سسر نے یہ بات سن لی اور دل میں رکھ لی۔ غذا کھاتے وقت اس نے برتنوں کا ملاحظہ کیا اور لل دید کے برتن سے ایک پتھر نکالا اور اسے اپنی بیوی کے سامنے پھینک کر اس کی ملامت کی۔ اس سے ساس کے حسد اور نفرت میں مزید اضافہ ہوا۔

آپ کے اس واکھ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ روحانیت کے راستے پر مضبوط ارادے سے گامزن تھی وہ دنیاوی ماحول سے ناطہ توڑنے کی کوشاں تھی۔ آپ کو یقین کامل تھا کہ آپ اس دنیا میں اپنے معبود کی تلاش میں گم ہونے کی خاطر ہی پیدا ہوئی۔ اور آپ اس منزل مقصود تک ضرور پہنچ سکے گی کوئی دشواری آپ کے راستے میں حائل نہیں ہوگی کہتی ہے ؂

آیس ته سیودی گژھ ته سیودی
سیدس ہول میہ کریم کیاہ
بہ لتس آسس آگرے ویدی
ویدس ته ویندس کریم کیاہ

میں سیدھے راستے سے آئی اور سیدھے راستے سے جاؤنگی، سیدھی راہ پر چلنے والی کو ٹیڑھا کیا کر سکتا ہے۔ میں ان سے آغاز سے ہی واقف تھی۔ مجھ واقف اور جانی پہچانی کو کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ لل دید کے واکھ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ کا نصب العین خدا کی ذات سے روحانی فیض حاصل کرنا اور جیتے جی دنیاوی ماحول سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کی راہ میں مال دولت کی لالچ، غصہ، جنسی خواہشات اور دنیاوی لگاؤ نیز اس قسم کی دیگر جسمانی اور نفسیاتی کمزوریاں حائل ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ للہ عارفہ وحدت کے سمندر کی تیراک تھی جس کی لہریں مذہبی تعصب دیواروں کو گرا کر پاش پاش کرتی ہیں اور یہ بات اس کے کلام کے ہر لفظ سے نمایاں ہے۔ للہ عارفہ صحراؤں کی طرف چل پڑتی۔ ان صحراؤں

اور ویرانوں سے وہ گھر کا رُخ نہ کرتی اور اپنے ملک کی قدیم زبان کشمیری میں شعر کہتی۔ للِ عارفہ شیخ نورالدین ولیؒ کی ہم عصر تھی۔ بلکہ جب شیخ کی ولادت ہوئی تو للِ عارفہ کبھی کبھی ان کے پاس جا کر اپنے پستان مبارک سے دودھ پلاتی۔ جب کشمیر میں میر سید علی ہمدانیؒ تشریف لے آئے تو للِ عارفہ آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگی جب حضرت سید حسن سمنانیؒ حضرت امیر کبیرؒ کے حکم سے کشمیر تشریف لائے تو للہ عارفہ نے آپ کا استقبال کیا اور آپ کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل کی۔ لل دید کے واکھ دنیا کے لوگوں کو عموماً اور کشمیریوں کو خصوصاً یہ سبق سکھاتے ہیں کہ معرفت کے بلند مینار سے نظر ڈالنے سے انسان کے اندر کے ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، رنگ و نسل کا فرق مٹ جاتا ہے۔ نفس پرستی، خود غرضی، حسد، فرقہ پرستی، غفلت، جہالت اور تعصب کی دیواریں اپنے آپ گر جاتی ہیں۔ آپ کی وفات کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا صرف اس قدر لکھا ہے کہ ایک روز للہ عارفہ بجبہاڑہ کی جامع مسجد کی دیوار کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک مشعل کی مانند کوئی چیز اس میں روشن ہوئی اور اس کا وجود اس نوری شعلے کی صورت میں آسمان کی طرف عروج کر گیا اور غائب ہوا۔

کھیر بھوانی

کھیر بھوانی کا استھا پن سرینگر سے ۲۲ کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔کھیر بھوانی کا تیرتھ کشمیر کے ایسے تیرتھوں میں شمار ہوتا ہے جس کی شہرت کشمیر سے باہر بھی پھیلی ہوتی ہے۔ جہاں کشمیری یاتری بھی درشن کے لئے آتے ہیں کھیر بھوانی کی تواریخ بہت پرانی ہے بتایا جاتا ہے راگنی دیوی رامائن کے دور میں لنکا سے کشمیر آئی تھی۔روایات کے مطابق لنکا میں ماتا دیوی کا نام شیا مارہا ہے۔ کہا جاتا ہے جس رات راگنی دیوی لنکا سے کشمیر آئی وہ رات راگنیا راتری کے نام سے موسوم ہوگئی۔راگنی ماتا کے استھاپن ٹکر (ہندواڑہ) منزگام، لوگری پورہ، منہ گام رائتھن اور بادی پورہ میں بھی ہیں۔لیکن تولہ مولہ کا استھاپن ان سب میں مشہور ہے۔اور یاتریوں کے لئے بے پناہ عقیدت اور توجہ کا مرکز ہے۔ ماتا کا روپ انکساری نرمی اور حلیمی کا روپ ہے۔راج ترنگی میں تولہ مولہ کا ذکر پہلی بار راجہ جے پیڈ کے دور میں ہوا ہے جب یہاں برہمن برادری نے ہڑتال کی تھی۔ برہمن برادری کی ہڑتال اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ راجہ جے پیڈ کے دور حکومت میں بھی تولہ مولہ کو نمایاں اہمیت حاصل تھی۔اس لئے یہاں بہت سارے برہمن اکٹھے ہوگئے تھے تولہ مولہ کا تیرتھ جس ندی کے کنارے پر واقع ہے۔اسے نیل مت پران میں چندر

باگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ چندر باگ سندھ نالے کی وہ شاخ ہے جو تولہ مولہ کے پاس گذرتی ہے اور آخر جہلم سے مل جاتی ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے تولہ مولہ اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا اور لوگ اس تیرتھ کو بھول گئے تھے کہتے ہیں کہ کرشن پنڈت نے خواب میں راگنی دیوی کو دیکھا کہ میرا استھاپن تولہ مولہ میں واقع ہے۔ اور ایک سانپ تمہیں وہ جگہ دکھا دے گا۔ کرشن پنڈت کشتی میں چڑھا اور سانپ آگے آگے چلا اور ایک جگہ ٹھہرا۔ جہاں آج کل کھیر بھوانی کا استھاپن ہے دارا شکوہ کے صلاح کار مہارشی شام سندر کول کے ساتھ تولہ مولہ میں عجیب واقع پیش آیا۔ جب اس کی گوشت کی ضیافتیں سبزیوں میں تبدیل ہو گئیں اس مندر میں جو چشمہ ہے اس کا پانی رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی پریشانی ہوگی تو اس کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ اگر ملک خوشحال رہے گا تو چشمہ کے پانی کا رنگ نیلا یا سبز ہوتا ہے۔

مندر سنگتراشی کے انتہائی جاذب نظر نمونوں کا مجموعہ رہا ہے اس کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھر استعمال ہوئے ہیں جو ۹ فٹ لمبے اور ۳ فٹ چوڑے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سے بہت سی مورتیاں بھی حاصل ہوئی ہیں۔ جو نہایت حسین اور دل آویز ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے یہاں ایک چھوٹا سنگ مرمر کا مندر بنوایا۔ اس مندر میں پتھر کی پرانی مورتی موجود ہے۔ اس کے متعلق ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ ۶۰۰ سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ یہ خوبصورت مندر پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ یہ مندر ایک چشمہ یا تالاب

کے بیچ میں کھڑا ہے۔اس کے اردگرد چنار اور Willow کے درخت قطار میں کھڑے ہیں۔یہ تالاب تقریباً ۱۲۰ فٹ مربع کی شکل میں ہے۔اور تقریباً ۳ فٹ گہرا ہے۔اس کا پانی دو نالیوں سے دریائے جہلم میں خارج ہوتا ہے۔ پانی دو چشموں سے آتا ہے۔جو کہ چشمہ کے مشرق میں واقع ہے۔مندر ۱۸ فٹ مربع ہے۔مندر کے تین دروازے ہیں جو کہ مشرق مغرب اور شمال کی طرف کھلتے ہیں۔مندر کے شمال کی طرف کچھ سال پہلے جب کھدائی کی گئی تو پرانے زمانے کے بوسیدہ مکانوں کے آثار ملے۔

للھ ایشوری (روپہ بھوانی)

سترھویں صدی کے اوائل میں سرینگر دیدہ مر میں مادھو جودر پیدا ہوا۔ وہ بڑا نیک تھا اور اپنے ایشور کی عبادت باقاعدگی کے ساتھ کرتا تھا۔ آپ روزانہ ہاری پربت جا کر جگت ماتا کی عبادت کیا کرتا تھا کہا جاتا ہے ایک دن جگت ماتا نے مادھو جودر کو اپنے درشنوں سے نوازا۔ اور ساتھ ہی کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے میں تمہاری خواہش پوری کرونگی۔ مادھو پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ماتا میری تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ آپ میرے گھر میں جنم لیں ماتا نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ اس واقعہ کے پورے نو مہینے بعد مادھو جو کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوگئی آپ کا نام روپ (چاندی) رکھا گیا۔ بھوانی کا خطاب اس وجہ سے آپ کے نام سے جوڑ دیا گیا۔ کہ آپ ماتا کا دوسرا روپ تھیں۔ روپ بھوانی بچپن سے ہی عام بچوں سے کچھ مختلف تھی وہ ہر کام دلچسپی سے کرتی تھی اس کے چہرے سے ہمیشہ نور برستا نظر آتا تھا۔ اور انسان زیادہ دیر تک اس کے چہرے پر نظر جما نہیں سکتا تھا۔

لل دید کی طرح روپ بھوانی کی شادی بھی بچپن میں ہوئی۔ آپ کی شادی سہیہ یار حبہ کدل کے سپرو خاندان کے لڑکے ہیر انند سے ہوئی۔ مگر آپ کی ازداوجی زندگی کامیاب نہیں رہی کیونکہ آپ کا جنم دینا داری کے

لئے نہیں بلکہ دنیا کے کلیان کے لئے ہوا تھا۔ آپ کو ساس اور سُسر کے طعنے سننے پڑتے تھے۔ ساس اور سسُر کے ظلم کے علاوہ روپہ بھوانی کا شوہر ہیر انند بھی ایک عجیب و غریب طبیعت کا مالک تھا۔ وہ معمولی بات پر بھڑک اُٹھتا تھا۔ وہ بیوی کو ستانے اور تنگ کرنے میں اپنی ماں سے بھی دو قدم آگے تھا۔ مگر روپہ یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔

روپہ بھوانی پریشانیوں اور مصیبتوں کے باوجود روزانہ ہاری پربت جا کر طواف کر کے آتی تھی۔ اس کے شوہر کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی کہ وہ کب گھر سے چل دی اور کب لوٹ کر آئی۔ ایک رات ساس نے روپہ کو کہیں جاتے دیکھا پھر کیا ہوا۔ اس نے ہیر انند کے کان بھرنا شروع کئے اس نے روپہ کو ڈائن اور بھوتنی کا نام دیا۔ ساتھ ہی ہیر انند سے کہہ دیا کہ رات کو کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ ایک رات ہیر انند تاک میں بیٹھا رہا۔ آخر جب روپہ گھر سے نکلی ہیر انند بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا جب وہ ہاری پربت پہنچ گئی۔ تو اسے ہر طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سا نظر آنے لگا مگر وہ آگے بڑھنے سے کترایا اس نے روپہ کو پانی پر سے چلتے ہوئے دیکھا جب روپہ گھر پہنچی اس نے اپنے خاوند سے کہا آپ نے جو کچھ دیکھا اس کا اظہار نہ کرنا مگر ہیر انند نے سارا ماجرا ماں سے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بھی بُجھ گیا۔ اور اس کو گھر سے نکالا گیا۔

آپ نے دنیا کو چھوڑ کر، تنہائی اختیار کی، جنگلوں کی راہ لی اور سرینگر کے شمال مشرق میں زبرون پہاڑی کے دامن میں چشمہ شاہی کے نزدیک

گوشہ نشین ہوگئی۔ اور رات دن عبادت کرنے میں لگی رہی۔ بہت عرصہ تک سرینگر کے لوگوں کو اس کا کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔ آخر خوشبو ہے کہ پردوں کو چیر کر نکلتی ہے۔ لوگ روپ بھوانی کا پتہ معلوم کر کے جوق در جوق اس کی خدمت میں حاضر ہونے لگے مگر اسے شور وغل، شہرت سے نفرت تھی۔ آپ نے ساڑھے بارہ سال کے بعد چشمہ شاہی کو چھوڑ دیا۔ اور منیگام شمالی کشمیر کے جنگل میں ایک غار کے اندر بھگوان کی عبادت کرنے لگی۔ آپ کی ملاقات ایک مسلم قلندر شاہ صادقؒ سے ہوئی۔ اس کے ملنے سے آپ کو روحانی تسکین ملی۔ منیگام میں رہنے کے بعد آپ نے اپنا مسکن تبدیل کیا اور واسکورہ کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ یہاں پر آپ نے بارہ سال بسر کئے۔ پھر اپنے میکے تشریف لے گئی اور آخر ۱۷۲۱ء میں آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ آپ کے ہم عصروں میں شاہ صادق قلندر کرشن کار اور ریشہ پیر تھے۔ روپ بھوانی کو الکھ ایشوری کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کشمیر میں آپ ہر جگہ گھومی آپ کی شاعری اور واکھ آج بھی ہر کشمیری کے زبان پر ہیں ان واکھوں کو پڑنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے بیٹھی ہے۔

بھوانی جی سنسکرت، فارسی اور کشمیری میں بھی شعر کہا کرتی تھی۔ لسانی اعتبار سے ان کی شاعری کشمیری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لل دید اور شیخ العالمؒ کے بعد روپہ بھوانی کا کلام بھی خاصا قدیم ہے اور اس لحاظ سے اسے کشمیری میں کلاسیکل ادب کا درجہ حاصل ہے۔

☆☆☆

شنکر آچاریہ یا تخت سلیمان

سرینگر شہر میں سب سے زیادہ پُرکشش اور خوبصورت شنکر آچاریہ کی پہاڑی ہے۔ جو سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی کے جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔ اس پہاڑی کے مشرق میں زبرون پہاڑ، مغرب میں جھیل ڈل، جنوب میں دریائے جہلم۔ اس پہاڑی کا نام شنکر آچاریہ پہاڑی ہے۔ شنکر آچاریہ ایک بڑا اسادھو تھا جو جنوبی ہندوستان سے کشمیر غالباً دسویں صدی عیسوی (۱۰۱۵ء) میں تشریف لایا اور یہاں پر ہندو دھرم کی اشاعت کے لئے کام کیا۔ کیونکہ اس وقت کشمیر میں بدھ دھرم عروج پر تھا اور ہندو دھرم زوال پذیر ہونے لگا تھا۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک خوبصورت مندر جو دیوری پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے موجود تھا۔ کہا جاتا ہے یہ مندر سب سے پہلے سندیمان بادشاہ نے بنوایا۔ اُس وقت اس مندر میں تقریباً دوسو سے تین سو کے قریب سونے اور چاندی کی مورتیاں تھیں۔ (تاریخ کشمیر فوق صفحہ ۵۲)

سندیمان نے کشمیر میں عالی شان عمارتیں اور شہر بنوائے۔ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر ایک عالی شان شہر آباد کیا۔ جس کا نام سندمت نگر رکھا گیا۔ بعد میں یہ شہر بھونچال سے ویران ہوگیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آج

کل جھیل ولہر لہریں مار رہا ہے۔ یہ اسی راجہ کی عالی ہمتی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت شنکر آچاریہ کی پہاڑی کی چوٹی پر مندر تعمیر کیا۔ کلہن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس مندر کو از سر نو گوپادیتہؔ جو کشمیر کا بادشاہ (۳۰۸-۳۷۱) قبل مسیح تھا نے تعمیر کیا اس راجہ کو بھی تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ کئی قصبہ جات آباد کر کے اس نے یادگار چھوڑے اس کے علاوہ آپ نے شنکر آچاریہ پہاڑی کے نزدیک ایک شہر آباد کیا اور وہاں پر باہر سے برہمنوں کو لا کر بسایا اور اس شہر کا نام اپنے نام پر گوپہ کار رکھا۔ اور اس وقت بھی اس علاقہ کا نام یہی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں راجہ للتادیتہؔ نے اس مندر کی مرمت کروائی۔ آپ (۷۲۴-۷۶۱) تک کشمیر کے حکمران تھے اسکے علاوہ آپ نے کشمیر کے پرانے مندروں کی مرمت کروائی جن میں خاص طور پر مارتنڈ مندر قابل ذکر ہے۔ اور اس کے ارد گرد ایک مضبوط دیوار تعمیر کرا کے اسے بالکل محفوظ بنایا۔ سری ور کے مطابق (۱۴۲۰-۱۴۷۰) زین العابدین بڈشاہ نے اس مندر کی مرمت کروائی۔ اس کا کلہن اور چھت دونوں نئے سرے سے بنوائے۔ جو کبھی بھونچال کی وجہ سے گر گئے تھے۔ شیخ غلام محی الدین جو سکھ دور میں کشمیر کے گورنر ۱۸۴۲-۴۶ء کے دوران نے تیسری مرتبہ مندر کی مرمت کی۔ اور مندر کے اندرونی حصے میں اینٹیں لگائی گئیں۔ اور اس کے حکم سے ایک نیا شولنگم لگایا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے یہاں درگاناگ کی جانب سے پتھروں سے ایک سیڑھی بنوائی۔ ۱۹۲۵ء میں جب والی میسور کشمیر آیا تو اس نے یہاں بجلی لگوائی۔ ۱۹۶۱ء میں شنکر آچاریہ دوار کا پیٹ نے یہاں پر سفید سنگ مرمر کی ایک مورتی بنائی۔

مندر کے دیواروں پر فارسی کے دو کتبے لگے تھے۔ یہاں پر دوخستہ حال کوٹھریاں تھیں کہا جاتا ہے کہ ان کو مسجد یا اعتکاف کی کوٹھری کے طور پر استعمال کیا گیا ہوگا۔ مسلمان دور حکومت میں اس کو تخت سلیمان کا نام دیا گیا کہا جاتا ہے کہ جب یہاں حضرت سلیمان وارد ہوا تو اس پہاڑی پر اس نے تشریف رکھا بدھ مذہب کے پیروکار بھی اس مندر کو متبرک مانتے ہیں حال ہی میں سوری شورتن آنند سرسوتی نے اس مندر کی مرمت کی اور اس کی خوبصورتی بڑھائی۔ ۱۹۷۴ء میں اس پہاڑی پر ٹیلی ویژن سنٹر لگایا گیا تو پہاڑی کی چوٹی تک موٹر گاڑیاں چلانے کے لئے ایک پختہ سڑک تعمیر کرائی گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷-۸۵) کے عہد میں شنکر آچاریہ پہاڑی کے مغرب میں عیسائی پادریوں نے پہلی دفعہ غالباً ۱۸۷۴ء میں ایک شفاخانہ بنوایا۔ جہاں پر برطانیہ سے ڈاکٹر کشمیریوں کا علاج کرتے تھے جن میں مشہور ڈاکٹر نیو تھے۔ کشمیر کے لوگ آج تک ان ڈاکٹروں کو یاد کرتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں اس اسپتال کو حکومت نے اپنے قبضے میں لیا ہے۔ اب اس کو ٹی بی (T.B) ہسپتال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کا پہلا گرجا گھر ۱۸۸۰ء میں تعمیر کیا گیا جسے سنٹ لیوک چرچ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے شنکر آچاریہ پہاڑی کے شمال میں اپنا محل ۱۹۲۵ء میں تعمیر کیا۔ اس محل سے شنکر آچاریہ اور ڈل جھیل کا خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ محل زبرون کی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اب یہ محل ایک خوبصورت ہوٹل میں تبدیل ہوگیا ہے۔

۱۹۳۰ء میں شنکر آچاریہ کی پہاڑی پر مختلف اقسام کے درخت لگوائے گئے۔ جیسے دیودار، کائیر وغیرہ یہ مندر دھرمرتھ ٹرسٹ کی نگرانی میں ہے۔ یہاں پر دو چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں پر سادھو رہتے ہیں۔ مندر سے تقریباً ۶۰ فٹ دور باہر ایک تالاب پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ جو گیارہ فٹ مربع شکل کا ہے۔ اور نو فٹ گہرا ہے جو کہ برف اور بارش کے پانی سے بھر جاتا ہے۔ یہ پانی مندر میں عبادت کے وقت استعمال کیا جاتا ہے پرانے وقتوں میں یہاں کشمیری پنڈتوں کا میلہ لگتا تھا۔ جو کہ ماہ بیساکھ کے دسویں دن منایا جاتا۔ کشمیری پنڈت ڈونگوں اور کشتیوں میں ڈل گیٹ تک آتے اور وہاں اشنان کر کے مندر میں جاتے اس میلہ کا نام ''منڈہ دم'' تھا۔ یہ اس دن کی یاد دہانی کرتا تھا۔ جب دیوی شارکہ نے ژانڈ اور مانڈ دو راکھشسوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ لیکن اب یہ میلہ نہیں منایا جاتا۔

کیا شنکر آچاریہ مندر بالکل ویسا ہی ہے جیسا راجا گوپادیتہؔ نے بنوایا تھا یا نہیں اس بارے میں شک ہے۔ البتہ اس کی سہ طبقہ اور آٹھ کونوں والی نیو حقیقتاً نہایت قدیم ہے مندر کی نیو کی چنائی میں کسی قسم کا مصالحہ استعمال نہیں کیا گیا ہے نیو سطح زمین سے ۲۰ فٹ اونچی اس کے اوپر تقریباً ۱۰۰ فٹ مربع چکور بنا ہوا ہے۔ چکور کے آٹھوں اطراف ساڑھے تین فٹ اونچی دیوار ہے جس پر نقش دار محراب بنے ہیں اور عین وسط میں ۲۴ فٹ مربع مندر ہے۔ مندر کے چاروں جانب تین ہتوں والی دیواریں اس طرح تعمیر کی گئی ہیں کہ اندر سے چاروں طرف محراب دار طاق بن گئے ہیں۔ دیواروں کے اوپر گنبد

کی شکل کی چھت ہے اور دروازہ کے اوپر ہتوں کے بدلے نیرس ڈالے گئے۔ تراشیدہ پتھروں کی تین ہتیں ہیں۔ یہ ہتیں اس طرح ڈالی گئی ہیں کہ باہر سے چاروں طرف ۲۱ ستون دکھائی دیتے ہیں۔ سطح زمین سے مندر کے اوپری دروازے تک دیوری پتھروں کی بنی سیڑھی ہے۔ جو ۲۱ زینوں پر مشتمل ہے اور کل چار چاند بیچ کے اٹھارہ زینوں کے دونوں جانب قد آدم دیواریں اور تیرہویں زینے کے بعد جس جگہ چکور تعمیر کا پہلا حصّہ شروع ہوتا ہے وہاں پتھروں کی بنی ڈیوڑھی ہے۔ ڈیوڑھی کا دروازہ محرابی طرز کا ہے۔ مندر کے اندر ۱۴ فٹ چوڑی کوٹھری ہے جس کے بیچ میں نالی میں شیولنگم ہے۔ جس کے گردواسک (ناگ) لپٹا ہوا ہے۔ لنگم کے پاس سنگ مرمر کی بنی آدشنکر کی مورتی ہے۔ یہ مورتی ۱۹۶۱ء میں دوار کا پیٹھ کے شنکر آچاریہ نے کشمیر کے دھرمت کے تعاون سے مندر میں لگوادی۔

☆☆☆

درگاناگ مندر

کشمیر پہلے ایک بڑی جھیل تھی ۔اور ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ جسے چاروں طرف سے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔اس جھیل کوستی سر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا جھیل کے اندر جل بھودیو ایک آدم خور دیو تھا۔ جو جھیل سے نکل کر کناروں پر آباد بستیوں میں لوگوں کو تنگ کرتا تھا۔لوگوں نے کشپ ریشی سے فریاد کی تو کشپ ریشی نے برہما۔ وشنو اور شیو جیسے دیوتاؤں سے مدد مانگی۔ جل بھودیو جھیل کے پانی کے اندر چھپ گیا۔تو کشپ ریشی نے بارہمولہ کے مقام پر ایک پہاڑی درہ کاٹ کر جھیل کا پانی باہر نکالا۔ جس سے موجودہ وادی کشمیر ظہور میں آگئی ۔اور دیوتاؤں نے جل بھودیو کو مار ڈالا۔اور یہاں آبادی شروع ہوگئی۔نیل مت پران میں لکھا ہے کہ پہاڑی درہ کاٹنے سے جھیل کا پانی اتنی تیزی اور اتنی طاقت سے باہر نکلا کہ میدانی علاقوں میں زبردست سیلاب آگیا۔

جل بھودیو کے مرنے کے بعد چھوٹے دیو اور جن لوگوں کو تنگ کرتے تھے پھر لوگوں نے ہندو عقیدہ کے مطابق پاروتی کو مدد کے لئے گذارش کی۔ پھر وہ مینا (ایک پرندہ) بن کر آئی۔ اور اپنی چونچ میں ایک پتھر رکھ کر ان دیوؤں کو مارا ان کا نام ژانڈ اور مانڈ تھا۔اور یہ اس پتھر کے نیچے

دب کر ہلاک ہو گئے ۔ جسے ہم ہاری پربت کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔
چونکہ کشپ ریشی کی کوشش سے وادی وجود میں آگئی تھی ۔ اس لئے اس کا نام
کشپ مر یعنی کشپ کی جگہ ۔ جو بعد میں بدلتے بدلتے کشمیر ہو گیا ۔

درگا ناگ مندر شنکر آچاریہ پہاڑی کے دامن جنوب مغرب کی جانب
ہے ۔ روایت میں ہے کہ ان دیوؤں کے ہلاک ہونے کے باوجود کچھ
راکھشس کشمیری برہمنوں ریشیوں کو تنگ کیا کرتے تھے ۔ تو ان لوگوں نے
ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے درگا ماتا سے رجوع کیا ۔ درگا ماتا نے
مختلف دیوی ، دیوتاؤں سے شکتی حاصل کر کے اس جگہ قرار کیا جو درگا ناگ
مندر کے نام سے مشہور ہے ۔ روایت کے مطابق درگا ماتا نے بذات خود " دو
راکھشس " کو مٹی کے نیچے دفن کر کے ختم کیا ۔ وہاں آج کے مندر کے
سامنے شمال مغرب میں اس جگہ ایک چشمہ اُبلتا ہے ۔ جہاں درگا ماتا نے قیام
کیا تھا ۔ یہاں امرناتھ جانے والے یاتری پوجا پاٹھ کرتے ہیں ۔ اور اس
جگہ کو امرناتھ یاترا کے اولین پڑاؤ ہونے کا امتیاز حاصل ہے ۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے وقت میں یہاں پر آٹھ بازوں والی درگا ماتا
کی مورتی لگائی گئی ہے ۔ جو اب بھی موجود ہے ۔ اور ایک مندر تعمیر ہوا ۔ یہ
مندر پہلے لکڑی کا تھا ۔ اور چھت پر ٹین کی چادریں لگائی گئی تھیں ۔ ۱۹۴۵ء
میں شری سوامی شیورتن گیری نے سات افراد پر مشتمل ایک ٹرسٹ قائم کیا
جس کا نام درگا ناتھ ٹرسٹ رکھا گیا ۔ اس ٹرسٹ نے حال ہی میں قدیم مندر
منہدم کر کے اس جگہ ایک نیا مندر تعمیر کیا ۔ اس مندر میں خالص سیمنٹ اور لوہا

استعمال کیا گیا ہے۔مندر کے باہر سیمنٹ اور لوہے کا ۳۴ فٹ چورس پرکرم چکر بنایا گیا۔اس کے چاروں سروں پر کل آٹھ سیمنٹ کے ستون ہیں۔جن میں محرابی طرز کے آٹھ چھوٹے طاق بنائے گئے ہیں۔مندر میں داخل ہونے کے لئے شمال کی جانب ایک دروازہ ہے جس کے اندر اور باہر دو (۲) گھنٹیاں آویزاں ہیں۔مندر کے شمال میں سوامی شورتا نند کی سمادھی ہے اس کے اوپر ٹین کا کلشن ہے۔جس پر پتیل کا جھنڈا ہے۔شمال میں درگا ناگ مندر کے عقب میں ۱۰ فٹ چورس سیمنٹ کا ایک شومندر ہے جس میں ایک شولنگ ہے۔شری سرسوتی کی سمادھی کے آگے رام ستھمب ہے۔جس پر رامائین لکھی ہوئی ہے۔مزید درگا ناگ مندر کے ساتھ اس کے جنوب مغرب میں مہاتما منی بابا کی سمادھی ہے جو ۱۹۶۸ء میں اس جگہ دفن کیا گیا ہے۔اس سمادھی کے اردگرد جنگلہ لگا ہے۔اس مندر کی اہمیت اس بات سے عیاں ہے کہ جب چھڑی مبارک امرناتھ یاترا کو روانہ ہوتی ہے۔تو اکھاڑے کے بعد پہلی پوجا درگا ناگ مندر میں ہی کی جاتی ہے اور اس کے بعد چھڑی امرناتھ روانہ ہوتی ہے۔

وچارناگ اونتہ بھون

جب مغلوں نے کشمیر پر قبضہ کیا۔ اور اپنا دارالخلافہ ہاری پربت کے
اردگرد بنایا اور اس علاقہ کا نام ناگرنگر رکھا تو اونتہ بھون کی اہمیت ختم ہوگئی۔
لیکن اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت باقی
ہے۔ مہاتما بدھ کی وفات کے دو سو سال بعد کشمیر میں بدھ مت ایک ہر دل
عزیز مذہب تھا اونتہ بھون بدھ مذہب کا مرکز رہا ہے۔ حال ہی میں یہاں
اس زمانے کے مٹی کے برتن جن میں مٹی کے چراغ، چھوٹے چھوٹے مٹی
کے برتن، جن میں اوپر ڈھکنے بھی موجود تھے دریافت ہوئے کہا جاتا ہے کہ
ایک عالم کشمیری پنڈت کو کا پنڈت نے ایک مشہور کتاب ''راتد اسایہ''
(محبت کا راز) یہاں لکھی اونتہ بھون کا پُرانا نام امرتا بھون تھا۔ یہ جگہ جھیں
آنچار کے کناروں پر واقع ہے۔ اونتہ بھون میں بہت بڑا بدھ وہار (مندر)
تھا جس کو پانچویں صدی میں رانی امریتا پربھا نے تعمیر کیا تھا۔ باہر کے ملکوں
سے جو بدھ بھکشو کشمیر آتے تھے وہ اسی وہار میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ اس
وہار کے کھنڈرات آج بھی اونتہ بھون میں موجود ہیں۔ یہ جگہ بدھ مذہب
کے ماننے والوں کے لئے بڑی متبرک تھی۔ ۱۸۹۵ء میں یہاں کھدائی کے
دوران ایک بڑا استوپا ۲۰ فٹ لمبا دریافت ہوا۔ اس کے نزدیک ایک پانی کا

چشمہ بھی دریافت ہوا۔ جس میں پتھر لگے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یہاں سے یہ پتھر اکھاڑے اور دوسرے مندروں میں لگوائے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان وہاروں کو کشمیر کے بادشاہ جیسما نے تعمیر کیا۔ اس کے نزدیک ایک اور مشہور مندر ہے جس کو وچارناگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہاں پر سات چشمے تھے ہندو عقیدہ کے مطابق یہ کشمیر کا پرانا استھا پن ہے اور یہاں پر شیو اور پاروتی نے کچھ دیر آرام کیا۔ ان سات چشموں سے اس وقت بھی چار چشمے صاف وشفاف پانی سے بھرے ہیں۔ یہاں پر دو مندر ہیں۔ ایک مندر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تعمیر کروایا یاتری لوگ مارچ کے مہینے میں اس مندر کا درشن کرتے ہیں۔ اور یہاں پر اشنان اور پوجا کرتے ہیں۔

گنپت یار مندر

گنپت یار مندر حبہ کدل اور گاؤ کدل مائسمہ کے درمیان دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس مندر کی وابستگی گنیش دیوتا سے ہے یہ سرینگر کا ایک قدیم مندر ہے کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ یہ مندر پہلے ایک بدھ وہار تھا۔ اس مندر میں خوبصورت پتھر لگے ہوئے ہیں۔ ۱۸۵۴ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس مندر کو از سر نو تعمیر کیا۔ یہ مندر کشمیری پنڈتوں کے لئے کافی متبرک ہے۔ کیونکہ یہ سرینگر کے وسط میں واقع ہے یہاں پر کشمیری پنڈت اپنی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیاں پچھلی صدی سے سرانجام دیتے تھے اس علاقہ میں زیادہ تر کشمیری پنڈت سکونت پذیر تھے گنپت یار کے نزدیک ملہ یار کرالہ کھڈ اور کھریار میں بھی چھوٹے مندر موجود ہیں اور نیچے دریائے جہلم کے کنارے خوبصورت گھاٹ بنائے گئے ہیں جہاں کشمیری پنڈت پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ گنپت یار کے نزدیک لل دید میموریل اسکول تھا۔ جواب ثقافتی مرکز بن گیا ہے۔ یہ ایک پرانی بلڈنگ ہے جس کو مہاراجہ ہری سنگھ کے ایک رشتہ دار نے غالباً انیسویں صدی میں تعمیر کیا۔ اور یہاں پر پہلی بار سرینگر میونسپلٹی کا دفتر کھولا گیا۔ اور اس کے بعد یہاں ایک مشہور شاعر دینا ناتھ نادم نے ایک اسکول قائم کیا جس کا نام لل دید سکول تھا۔

پری ہاس پورہ

فاتح بنگال و گجرات، معمار، رعایا پرور

کشمیر کے راجہ للتا دیتہؔ کا پایۂ تخت!

کشمیر اپنے پہاڑوں، ندی، نالوں، جھیلوں اور چشموں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے، پرانے وقتوں سے کشمیر علم کا گہوارر ہا ہے جس کا ثبوت آج تک یہاں کے آثار قدیمہ میں ملتے ہیں جن میں خاص طور پر پاندرٹھن، وانگت کنگن، ہاروں، مارتنڈ اننت ناگ، پری ہاس پورہ قابل ذکر ہیں۔ قدیم زمانے میں کشمیر ایک بڑی جھیل تھی اس کے بعد یہاں بارہمولہ (کھادن یار) کے قریب پہاڑ کٹ گیا اور وادی کا سارا پانی نیچے میدانی علاقوں میں آ گیا۔ اس کے بعد کشمیر دلدل میں تبدیل ہو گیا اور کچھ بڑے بڑے ٹیلے وجود میں آئے۔ کشمیر میں جو پہلے لوگ سکونت پذیر ہوئے وہ انہی ٹیلوں پر رہنے لگے جو کہ پہاڑوں کے نزدیک تھے۔ جن میں برزہامہ، گوپھ کرال، سمتھن، ویری ناگ، نلِ ناگ، بڈگام اور بانڈی پورہ قابل ذکر ہیں۔ جب کشمیر مہاراجہ اشوک کی سلطنت میں شامل ہو گیا تو اس نے اپنا دار الخلافہ

پاندر یٹھن میں قائم کیا یہ راجدھانی ۲۰۰ قبل مسیح میں بنائی گئی مگر اس کے نچلے علاقے سیلاب کی زد میں آ گئے لہٰذا چھٹی صدی عیسوی میں پروسین بادشاہ نے اپنا دارالخلافہ ہاری پربت کے ارد گرد قائم کیا۔ اُس میں اس نے خوبصورت باغ، بازار اور بڑے بڑے مکانات تعمیر کیے اور اس شہر کا نام پرور پور رکھا لیکن یہ نام زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور اس نے شہر کو پھر اپنے پرانے نام سرینگر سے یاد کیا۔ اگر چہ پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے کشمیر کے حکمرانوں نے اپنی پسند کی راجدھانیاں یہاں قائم کیں جیسے کہ اونتی ورمن نے اونتی پورہ، جیاپیڈ نے اندرکوٹ، شنکر ورمن نے پٹن، پرورسین نے سرینگر، للتا دتیہ نے پری ہاس پورہ اور بڈشاہ نے نوشہرہ سرینگر بسایا۔

للتا دتیہ کا زمانہ کشمیر میں سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ آپ نے تقریباً ۳۵ سال کشمیر پر حکومت کی۔ سکندر اعظم کی طرح آپ نے بہت سارے ممالک فتح کیے جن میں خاص طور پر پنجاب، کنوج، تبت، بدخشاں قابل ذکر ہیں جس سے آپ کو عظمت، شان اور خوشحالی ملی۔ آپ مختلف مذاہب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ آپ نے کشمیر میں بہت سارے خیراتی ادارے قائم کیے جہاں پر یتیم اور غریب لوگوں کو مالی امداد ملتی تھی۔ کشمیر اپنے عروج پر اس وقت پہنچا جب آٹھویں صدی عیسوی میں کشمیر کا حکمران راجا للتا دتیہ تھا۔ آپ نے ۷۲۴ء سے لے کر ۷۶۱ تک کشمیر میں حکومت کی۔ اور بہت سارے ممالک فتح کر کے سرکشوں کو مغلوب کیا۔ ان کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں ہی گذرا، وہ عموماً سیاحت میں رہتے تھے۔

آپ نے مشرق میں بنگال سے لے کر مغرب میں گجرات تک کا سارا علاقہ فتح کیا۔ مزید آپ نے لوگوں کی بھلائی کے لئے سرائے اور شفا خانے تعمیر کئے۔ راجہ نے پرانے مندروں کی مرمت بھی کی۔ اور اس کے علاوہ شنکر آچار یہ مندر اور رنار اناگ مندر (وانگت کنگن) کی بھی مرمت کرائی۔ آبپاشی کی طرف آپ نے خوب توجہ دی اور پرانی نہروں کی مرمت کی۔ بادشاہ کو عمارات، مندر، ویہار بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے مشہور مارتنڈ مندر اور پری ہاس پورہ قائم کیا۔ ان دو شاندار عمارتوں کی وجہ سے کشمیر کی تاریخ میں للتادتیہ کا نام ہمیشہ روشن رہا۔ بادشاہ نے اپنے نئے دار الخلافہ کے لئے بہترین جگہ کا انتخاب کیا اس نے پری ہاس پورہ ٹیلے پر اپنا نیا شہر آباد کیا۔ پری ہاس پورہ ٹیلا دلدل زمین سے تقریباً سو فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ اس لئے اس میں سیلاب وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پری ہاس پورہ شمال سے جنوب تک دو میل کے فاصلہ پر لمبا ہے اور چوڑائی میں تقریباً ایک میل ہے۔ اس کے نیچے اس وقت دو دریا بہتے تھے جہلم (ویتھ) اور دریائے سندھ۔ اس وقت ان دونوں دریاؤں نے اپنا رخ شادی پورہ کی طرف موڑ دیا ہے۔ پری ہاس پورہ پہاڑوں سے بالکل الگ تھلگ ہے یہاں سے برف سے لپٹی ہوئی برف کی چوٹیاں بڑی دلکش اور خوشنما نظر آتی ہیں۔ مغرب سے پیر پنچال اور ترٹہ کوٹی کی چوٹیاں اور شمال مشرق کی طرف ہرموکھ اور مہادیو کی چوٹیاں واقع ہیں۔ پری ہاس پورہ سرینگر سے تقریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر، سرینگر بارہمولہ شاہراہ سے کچھ دور پر واقع ہے۔ للتادتیہ نے ۷۵۰ء میں

نئے دارالخلافہ کی سنگ بنیاد ڈالی۔ بادشاہ نے اپنے شہر میں نہ صرف شاہی محلات بنوائے بلکہ بہت سارے ویہار اور بدھ خانقاہیں بھی تعمیر کرائیں۔ اُس زمانے میں کشمیر میں دو مذاہب رائج تھے۔ ایک بدھ مت اور دوسرا ہندو مذہب تھا۔ آپ نے اپنے محل میں اگرچہ ان دونوں مذہبوں کی مورتیاں اور مندر تعمیر کروائے۔ تاہم خود ہندو دھرم کا پیروکار تھا اور ویشنو مت کی طرف جھکاؤ تھا۔ آپ کی رانی چکر مایکا نے اپنے لئے محل میں شیو مندر بنوایا۔ بادشاہ نے اپنے بدھ وزیر کے لئے بدھ ویہار اور بدھ مندر تعمیر کئے۔ کشمیر کے دو تاریخ دانوں دید مری اور نارائن کول کے مطابق پری ہاس پورہ میں مہاتما بدھ کی ۵۰ فٹ مورتی تعمیر کروائی۔ پری ہاس پورہ کے کھنڈرات پہلی دفعہ ۱۸۹۲ء میں سٹین نے دریافت کئے اور آپ نے بدھ مت کے تین ڈھانچے دریافت کئے۔ سٹوپا (Stupa)، مونسٹری (Monastery) اور چیتیا (Chaitya)۔ ان سب عمارتوں میں چونے کے پتھر استعمال کئے گئے۔

سٹوپا:-

اس عمارت کو للتادتیہ کے ایک وزیر چنکیا نے تعمیر کیا تھا۔ اس کا اوپر والا طبقہ خستہ ہو گیا ہے۔ یہاں پر ایک بڑا پتھر ہے جس کے وسط میں پانچ فٹ گہرا سراخ ہے جس کی بنیاد تقریباً ۱۲۸ فٹ ہے اس میں سیڑھیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اور مہاتما بدھ کی تصویر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مونسٹری:- راج ویہار یا شاہی بدھ خانقاہ۔ اس خانقاہ میں چھوٹے چھوٹے ۲۶ کمرے ہیں۔ شاید یہاں بودھ بکشو عبادت کیا کرتے تھے۔ اس

کے ساتھ ہی اس میں ایک برآمدہ بھی ہے۔ یہاں پر پانی ذخیرہ کرنے کے لئے پتھر کا بنایا ہوا ایک بڑا ٹب تھا۔ شاید اس پانی کو نہانے دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کمرہ نمبر ۲۵ میں ایک مٹی کا گڈا بھی ملا جس میں ۴۰ چاندی کے سکے ملے جو کہ ونیا دتہ کے عہد کے ہیں۔ خانقاہ کی مرمت اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے۔

چیتیا:-

یہ خستہ عمارت بدھ خانقاہ کے جنوب میں واقع ہے، اس میں بڑے بڑے پتھر لگے ہیں۔ اس کے مشرقی حصے میں چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں لگی ہیں اس میں جو پتھر لگے ہیں اسی قسم کے پتھر زمانہ قدیم میں مصر کے مندروں میں استعمال ہوا کرتے تھے۔ اس کے فرش میں ایک بڑا پتھر لگا ہے جس کی لمبائی تقریباً ۱۴ فٹ ہے۔ اگر چہ ۱۸۸۶ء تک پری ہاس پورہ میں یہی تین بوسیدہ ڈھانچے نظر آتے تھے لیکن ۱۸۸۶ء میں پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ نے کھدائی کے دوران دو اور بوسیدہ ڈھانچے دریافت کیئے جو آج تک نظروں سے اوجھل تھے۔ اس وقت پری ہاس پورہ کی حالت خراب اور خستہ ہے۔ مزید للتا دتیہ کے انتقال کے بعد شنکر ورمن نے یہاں کی عمارتوں کو مسمار کر کے اس سے حاصل کیا گیا میٹریل اپنے دارالخلافہ شنکر پورہ پٹن لے کر مندروں میں استعمال کیا۔ ۱۸۹۰ء میں جب جہلم ویلی روڑ وجود میں آئی تو پری ہاس پورہ سے پتھر نکالے گئے اور ان کو سڑک بنانے میں استعمال کیا گیا۔ اس وقت پر ی ہاس پورہ کے ارد گرد بڑی عمارتوں اور ناجائز تجاوزات سے اس کی

خوبصورتی متاثر ہوئی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس تاریخی عمارت کے ارد گرد کوئی دیوار بندی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے اس کا ماحولیاتی توازن بگڑ چکا ہے۔ کشمیر کے حکمرانوں نے وقتاً فوقتاً پری ہاس پورہ کی پرانی شان کو بحال کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک یہ وعدے وفا نہ ہوئے اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

اشبر گپت گنگا

جھیل ڈل کا مشرقی حصہ چشموں سے بھرا پڑا ہے۔ ہندو مذہب کے لوگ ان چشموں کو متبرک مانتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں ان چشموں کے ارد گرد خوبصورت مندر اور دلکش باغات ہوا کرتے تھے۔ جن کو بادشاہ اور رانیاں تعمیر کراتے تھے۔ گپت گنگا کا استھاپن سرینگر سے ۱۲ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ تیرتھ کشمیر کے ایسے تیرتھوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس کی شہرت کشمیر سے باہر بھی پھیلی ہوئی ہے۔ گپت گنگا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں پر ایک مندر کے کھنڈرات ہیں جس کو راجہ سندیمان نے تعمیر کرایا۔ جو ایک سو سال قبل مسیح کشمیر کا حکمران تھا اس نے ۴۷ برس تک کشمیر پر حکومت کی۔ اور بلا ناغہ کئی مندروں میں جا کر پرستش کرتا تھا۔ راجہ سندیمان نے جا بجا تعمیرات بنائے۔ ایک مندر اپنے گرو یشان دیو کی عقیدت کی بنا پر اشبر میں تعمیر کیا۔ بادشاہ کا مذہبی تجسس عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ بالآخر امیروں اور وزیروں کو ایک جلسہ میں بلا کر کہا کہ آپ مجھے حکومت کی ذمہ داریوں سے فارغ کریں اور جس کو چاہیں راجہ بنائیں۔ چنانچہ وہ خود دستبردار ہوئے۔ اور اپنا تاج اپنے ہاتھوں سے اتار دیا۔ اور ۱۳ء میں موضع نمبرو کے متصل کسی غار میں داخل ہو گیا۔ اس دن کے بعد اس کو دیکھا ہی نہ گیا۔ یہ غار تب سے آدی

رائی کے نام سے مشہور ہے۔ اشبر مندر کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔
اور اس کے کچھ پتھر گاؤں کے گردونواح میں نظر آتے ہیں۔ کھنڈرات کے
نزدیک ہی ایک ٹیلہ ہے جو ۳۰ فٹ مربع شکل کا ہے جب کہ اونچائی ۳ فٹ
ہے۔ یہاں ایک چشمہ ہے ہندو مذہب کے لوگ اس پر درشن کے لئے آتے
رہتے ہیں۔ ان کے لیے گپت گنگا نام کا یہ چشمہ متبرک ہے۔ چشمہ کا پانی
ایک بڑے حوض میں جا گرتا ہے۔ ہندو مذہب کے لوگ بیساکھی نئے سال
اور کرشن جی کی ولادت پر اس چشمہ پر آ کر اشنان کرتے ہیں۔ اس چشمہ کے
اوپر ایک پہاڑی کی چوٹی ہے۔ جس کو سورش وادی کہتے ہیں اس چوٹی پر کبھی
کبھی یاتری چڑھ جاتے ہیں اور شانتی حاصل کرتے ہیں۔

گردوارہ چھٹی پادشاہی۔رعناواری

سکھ مذہب کی بنیاد کشمیر میں اس وقت پڑگئی جب گرونانک دیو.جی یہاں تشریف لائے ۔ (۱۴۶۹-۱۵۳۹) آپ سنکیانگ سے لداخ پہنچ گئے۔غالباً یہ ۱۵۱۷ءکا واقع ہے۔اس کے بعد آپ نے وادی کشمیر کی سیر کی۔ آپ کے ساتھ آپ کے دوشاگرد تھے ۔آپ نے کشمیر میں مٹن (اننت ناگ) اسلام آباد اور بجبہاڑہ کی بھی سیر کی ۔ایک مسلمان فقیر کمال سے ملاقات کی ۔اور پھر امرناتھ کی یاترا کے لئے گئے ۔اس کے بعد آپ نے بارہمولہ ، بانڈی پورہ ، بیروہ ، آلہ پتھر (گلمرگ) اور ہر موکھ کے علاقوں کا دورہ بھی کیا پھر پیر پنچال پہاڑیوں کو عبور کر کے پنجاب تشریف لے گئے۔ سرینگر میں آپ نے مسلمان اور پنڈت عالموں سے ملاقات کی۔اس کے بعد آپ کے بڑے فرزند بابا سری چند (۱۵۵۱-۱۶۴۰) نے بھی کشمیر کی سیر کی۔اور آپ ریگل چوک سرینگر کے بمقابل قیام پذیر ہوئے۔جہاں آپ کی یاد میں اس وقت بھی ایک مندر ہے۔اس کے بعد جو گروصاحب کشمیر تشریف لائے وہ چھٹے گرو ہرگوبند سنگھ تھے ۔گردوارہ چھٹی پادشاہی جو نزدیک کاٹھی دروازہ رعناواری میں ہاری پربت کے دامن میں واقع ہے میں قیام پذیر ہوئے۔چھٹے گرو گرو ہرگوبند سنگھ کی یاد میں یہ گردوارہ تعمیر کیا گیا ہے۔جب

کہ گرو جی ستارویں صدی میں مغل بادشاہ جہانگیر کے ساتھ ۱۶۲۰ء میں وارِدِ کشمیر ہوئے (۱۶۲۷-۱۶۰۵) ان کی یاد میں گردوارہ مخدوم صاحب کے متصل تعمیر ہوا ہے۔ اور بابا گرونانک کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ خدا تعالیٰ ایک ہے اوران کا فرمان ہے کہ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ہرایک کو آپس میں پیار اور محبت سے رہنا چاہئے۔ گردوارہ کے نزدیک کشمیری پنڈتوں کی مقدس جگہ شارکہ دیوی کا استھاپن بھی واقع ہے۔ اوراوپر مخدوم صاحب کی زیارت ہے کشمیر میں مسجدیں، مندر، گردوارے، اور چرچ اکٹھے واقع ہیں جو مذہبی رواداری کی نمایاں مثال ہے۔ اور لوگ بڑے پیار ومحبت سے رہتے ہیں۔

گرو ہرگوبند سنگھ چھٹے گرو تھے آپ کی ماتا جی کا نام گنگا جی تھا اور والد کا نام گرو ارجن دیو تھا آپ ۱۹ جون ۱۵۹۵ء میں امرتسر کے ایک گاؤں ذالی میں پیدا ہوئے۔ گرو جی کی تربیت اچھے قابل سکھ عالموں نے کی۔ جن میں خاص طور پر بھائی گرداس اور بھائی بوڑھا جی تھے۔ آپ کی شادی بی بی نانک جی سے ہوئی۔ آپ کے پانچ بیٹے اور ایک لڑکی تھی۔ کچھ لوگ جو آپ سے حسد کرتے تھے انہوں نے آپ کو گوالیار جیل میں بند کرایا اور بادشاہ جہانگیر کو ان کے خلاف بھڑکایا۔ مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے اس پر زبردست احتجاج کیا۔ جس کی سرپرستی ایک بہت بڑے بزرگ میاں میر کر رہے تھے اور آخر کار حکومت وقت نے آپ کو رہا کیا۔ اور بادشاہ جہانگیر آپ کے دوست ہو گئے آپ کے والد گرو ارجن دیو کے قتل کرنے میں جو لوگ ملوث

تھے ان کو سزا ہوئی جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ گرو جی نے ہاری پربت دیوی آنگن میں قیام کیا۔ اس وقت اس علاقہ میں پنجابی ہندو اور سکھ قیام پذیر تھے۔ جو کپڑے کا کاروبار کرتے تھے یہ علاقہ ناگرنگر کے بیرونی حصہ میں واقع تھا۔ انہوں نے آپ کی بڑی آو بھگت کی اور آپ بھائی سیوا داس کے گھر میں رہے۔ وہ بھی کپڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ آخر یہی مکان گردوارہ چھٹی پادشاہی بنا۔ اس گھر میں آپ نے ایک کنواں کھودا اس وقت بھی یہ کنواں یہاں موجود ہے اور سکھ زائرین اپنی پیاس اس سے بجھاتے ہیں۔ سیوا داس کی والدہ ماتا جی بھاگ بیری جو کہ مذہبی اور بزرگ عورت تھی گرو جی کے دیدار کے لئے بڑی بے چین تھی ان کو اپنے گھر میں جگہ دی اور ایک شال پیش کیا گرو جی نے یہ تحفہ قبول کیا۔ کشمیر میں گرو جی زیادہ تر ناگرنگر میں ہی قیام پذیر ہوئے۔ آپ کے مذہبی جلسوں میں سب فرقے کے لوگ ہوتے تھے۔ آپ نے یہاں مفت لنگر قائم کیا۔ کشمیریوں نے آپ کے لنگر خانہ کے لئے مفت راشن اور گھوڑوں کے لئے مفت گھاس پیش کیا۔ لوگ آپ کو سچا پادشاہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بارہمولہ میں ایک مسلمان نے آپ کو پتھر کا تخت پیش کیا۔ موجودہ گردوارہ وہی ہے جہاں کاٹھی دروازہ کے قریب گرو جی نے قیام کیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس گردوارہ میں بھی تبدیلیاں آگئیں۔ کشمیر میں جس وقت سکھ حکومت تھی (۱۸۴۶-۱۸۱۹) تو کشمیر کے گورنر ہری سنگھ نولہ نے گردوارہ چھٹی پادشاہی کو از سر نو تعمیر کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے گردوارہ اسلام آباد گردوارہ چھٹی پادشاہی بارہمولہ بھی تعمیر کئے۔ موجودہ گردوارہ کی تعمیر نو بابا ہربنس سنگھ دلی والے کی کوششوں سے ہوئی

ہے۔ درشن ڈیڈی (Gate) اور نشان صاحب حال ہی میں تعمیر ہوئے۔
گردوارہ کے باہر زمین کا بڑا احاطہ ہے اندرونی حال میں گیلری ہے اور اوپر
چڑھنے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ اندر جانے کے لئے تین دروازے ہیں۔
چھت کے اوپر چار گلشن (Clomes) مینار ہیں اور بیچ (Clomes) کے
مینار میں تلوار ہے۔ گردوارہ کی بناوٹ اسلامی اور ہندوستانی طرز پر ہوئی
ہے۔ گردوارہ میں پتھر، سیمنٹ، اور لوہا استعمال ہوا ہے۔ گردوارہ کی دیکھ
بال گردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد ہے گردوارہ کی تعمیر اب بھی جاری ہے۔
اور ایک مہمان خانہ (گرو کا باغ) (Guest House) عنقریب بن
رہا ہے۔ اس گردوارہ کو سب کشمیری عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں خواہ ان میں
مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی ہوں۔ اس گردوارہ میں گرو ہر گوبند سنگھ اور گرو
نانک کے یوم ولادت بڑے دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ اور
بیساکھی کا تہوار بھی بڑی شان وشوکت سے منایا جاتا ہے۔

گرو جی کی ملاقات شہنشاہ جہانگیر سے دہلی میں ہوئی۔ اور شہنشاہ ان
سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو اپنے ساتھ کشمیر کی سیر کو لے گئے۔ ایک دفعہ
گرو جی اور شہنشاہ جہانگیر شیر کا شکار کھیلنے گئے۔ اور وہاں پر آپ نے بادشاہ کی
جان بچائی اس پر بادشاہ ان پر خوش ہو گئے۔ گرو جی اسلام سے بڑے متاثر
تھے۔ انہوں نے ہر گوبندھ پور کرتار پور اور امرتسر میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔
آپ کے دوستوں میں شیخ جان محمد، محمد اسماعیل، جہاں میر، قابل ذکر ہیں۔
گرو جی کشمیر میں ایک نیلے گھوڑے پر سوار ہو کر مغل روڈ کے راستے میر پور،
نوشہرہ، راجوری اور شاجی مرگ (پلوامہ) جہاں پر اس وقت بھی ایک گردوارہ

آپ کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے سے ہوتے ہوئے بذریعہ کشتی شالیمار باغ تشریف لے گئے اور جھیل ڈل کی سیر کی۔ سرینگر سے آپ سنگھ پورہ بارہمولہ پرم پیلا (اُوڑی) تشریف لے گئے۔ پھر اوڑی سے آپ مظفر آباد تشریف لے گئے کہا جاتا ہے ملکہ نور جہاں بھی آپ سے ملاقات کرنے کے لئے شالیمار تشریف لے گئی۔ آپ نے سکھ مذہب کو بھگتی سے شکتی کی طرف تبدیل کیا۔ آپ کو کشمیر میں سکھ سچا بادشاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کشمیر میں سکھ اتنے پرانے ہیں جتنا کہ سکھ مذہب۔ گورو ہر گوبند سنگھ کے وقت میں کشمیر میں پنجابی بولنے والے جو ہندو تھے انہوں نے سکھ مذہب اختیار کیا۔

۱۶۰۶ء میں جب گروجی کے والد گروارجن دیو کو شہید کیا گیا اس وقت آپ کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اس وقت سکھ مذہب میں بہت سارے مشکلات پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی قابلیت اور ہمت سے ان مشکلات کا جوان مردی سے مقابلہ کیا۔ اور آپ نے سکھوں میں ہمت اور ولولہ پیدا کیا۔

آپ نے اپنے مُریدوں کو حکم دیا کہ میرے لئے ہتھیار اور گھوڑے نذرانہ کے طور پر پیش کرو۔ ان کا مقولہ تھا۔ زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دو۔ میں ایک سادھو ہوں۔ اور میں گرونانک کا جانشین ہوں۔ ہم بادشاہ نہیں ہیں اور نہ ہماری خواہش ہے کہ ہم کسی علاقہ کو اپنی تحویل میں رکھیں۔ ہمارا یقین خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر ہے۔ میری تلوار کمزوروں کو بچانے کے لئے اور ظالموں کو ختم کرنے کے لئے ہیں۔

☆☆☆

سینٹ لیوک اور آل سینٹ چرچ

۱۸۴۶ء میں بینامہ امرتسر کے تحت انگریزوں نے کشمیر کو ۷۵ لاکھ روپے کے عوض مہاراجہ پرتاب سنگھ کو فروخت کیا۔ اس وقت کشمیری اقتصادی طور پر کمزور تھے۔ تنگدستی، غریبی اور وبائی بیماریاں ہر وقت ان پر حملہ کرتیں، طاعون اور وباء ہر دوسرے تیسرے سال کشمیر میں آتے تھے۔ ہر دن سینکڑوں کی تعداد میں لوگ موت کے مُنہ میں چلے جاتے۔ کشمیری انگریزی دوائیاں لینے سے انکار کرتے تھے ان کے بدلے اپنا علاج کروانے کے لئے درویشوں اور فقیروں کے پاس جاتے تھے۔ کچھ برطانوی سیاح جب کشمیر وارد ہوئے۔ انہوں نے کشمیریوں کی زبوں حالی دیکھی۔ اس پر ۱۸۵۴ء میں پہلا برطانوی ڈاکٹر رابرٹ کلرک کشمیر آیا۔ واپسی پر اس نے برطانوی حکام کو کشمیریوں کی حالت زار بیان کی۔ کلرک دوبارہ کشمیر آیا اور ۱۸۶۵ء میں ایک ڈسپنسری قائم کی۔ اس سے پہلے کشمیر میں کوئی انگریزی دواخانہ نہیں تھا۔ ڈسپنسری میں سینکڑوں کی تعداد میں کشمیری بیمار علاج کے لئے آتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور برطانوی ڈاکٹر اسیلم سلی ۱۸۶۵ء میں کشمیر تشریف لائے ۱۸۷۴ء میں ڈاکٹر میکس یہاں آئے اور اسی سال ۱۸۷۴ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے شنکر آچاریہ پہاڑی کے دامن میں درگجن علاقہ کے پاس انگریزوں

کو ایک شفاخانہ تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ جس کا نام درگجن مشن اسپتال رکھا گیا یہاں پر مہاراجہ رنبیر سنگھ بھی معائینہ کرنے کے لئے آتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ڈاکٹر آرتھر نیو انچارج درگجن اسپتال مقرر ہوئے۔ آپ نے سائنسی اصولوں پر اسپتال کا انتظام قائم کیا۔ آپ کی مدد کے لئے آپ کے برادر اصغر ڈاکٹر ارنسٹ نیو ۱۸۸۶ء میں سرینگر تشریف لائے دونوں بھائیوں نے اپنی لگن اور محنت سے اسپتال کو ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن کیا۔ اس اسپتال میں برطانوی ملازموں اور نرسوں نے بھی کام کیا۔ ۱۸۸۰ء میں نولز نے مشن اسکول کی بنیاد ڈالی بعد میں ۱۸۹۰ء میں مرحوم بسکو اسکول کے سربراہ مقرر ہوئے یہ سب درگجن اسپتال کے اردگرد کوارٹروں میں رہتے تھے۔ اس طرح سرینگر میں بہت سارے برطانوی باشندے قیام پذیر ہوئے اب ان کو اپنی عبادت گاہ گرجا گھر بنانے کی ضرورت پڑی ۔ آخر ۱۸۹۶ء میں اسپتال کے نزدیک شنکرآچاریہ کے دامن میں نیو برادران نے ایک گرجا گھر تعمیر کیا اور اس کا نام سینٹ لیوک چرچ رکھا گیا۔ اس چرچ کا افتتاح ۱۸۹۶ء میں بشب آف لاہور نے کیا عیسائی لوگ ہراتوار کو یہاں عبادت کرنے کے لئے آتے رہے ہیں یہ گرجا گھر مشن اسپتال درگجن سے وابستہ ہوگیا۔ ڈاکٹر آرتھر نیو نے ۳۴ سال کشمیریوں کی خدمت کی بالآخر اگست ۱۹۱۹ء میں سرینگر میں وفات پائی اور شیخ باغ عیسائی قبرستان میں ان کو سپرد خاک کیا گیا ارنسٹ نیو نے ۱۹۴۶ء تک مشن اسپتال میں کام کیا۔ آپ نے کانگڑی کینسر کیلئے تحقیقاتی کام کیا۔ اس کے بعد رام منشی باغ میں ایک اور گر

جاگر تعمیر ہوا جہاں پر برطانوی لوگ رہائش پذیر تھے۔ یہ سرینگر کا خوبصورت علاقہ ہے یہاں پر بھی ہر اتور کو عیسائی لوگ عبادت کرنے آتے ہیں اس چرچ کا نام آل سینٹ چرچ ہے اور اس کے نزدیک ہی ریذیڈنسی کا قیام تھا۔ جہاں پر برطانوی آفیسر اور ملازم کام کرتے تھے۔

خواجہ غلام احمد عشائی

خواجہ غلام احمد عشائی کو کشمیر میں بحیثیت ایک رہبر، فلاسفر، سیاسی مفکر اور ایک بڑا عالم تصور کیا جاتا رہا۔ آپ بحیثیت ایک اُستاد، ایک پروفیسر، پرنسپل ایس پی کالج اور ایک قانون دان کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ عشائی صاحب ۴/اپریل ۱۸۹۵ء میں فتح کدل عشائی کوچہ میں تولد ہوئے۔ آپ کے خاندان کا شجرۂ نسب مشہور فارسی شاعر غنی کشمیری سے ملتا ہے۔ آپ کے والد صاحب خواجہ قادر شاہ عشائی ایک بڑے تاجر تھے اور راجہ پونچھ کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ پونچھ کی سیر وسیاحت کے لئے جاتے تھے اور وہاں کے ذی عزت لوگوں سے ان کے مراسم تھے خواجہ غلام احمد عشائی وادی کشمیر کے پہلے مسلمان گریجویٹ تھے جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے کی ڈگری فسٹ ڈویژن اور ریاست جموں کشمیر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

آپ نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے فارسی میں امتیازی پوزیشن حاصل کی اور وہاں سے سونے کے تغمہ دوسو روپے نقد انعام حاصل کئے۔ آپ نے سنٹرل ٹرینگ کالج لاہور سے بی ٹی پاس کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے منشی فاضل بھی اسی ادارہ سے پاس کیا اور ایم -او-ایل بن گئے۔ اپنی

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے وطن سرینگر میں بحثیت ایک اُستاد مقرر ہوئے۔اس کے بعد آپ ایس۔پی کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے پھر آپ اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر تعینات ہوئے۔اس عہدے پر آپ سات سال تک رہے اسی دوران آپ کو متعلقہ آفیسروں کے ساتھ کچھ اختلاف ہوا جس کی وجہ سے آپ کو ۱۹۳۰ء میں نوکری سے برطرف کیا گیا۔اور ۳۰ روپے پنشن مقرر کیا گیا۔اس کے بعد آپ نے وکالت کا اجازت نامہ حاصل کیا۔اسی دوران کچھ مسلم کشمیری نوجوان جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے اعلیٰ اسناد حاصل کر چکے تھے۔یہاں بیکار پڑے تھے۔عشائی صاحب نے ان کو متحد کیا۔اور ان کی سربراہی کی اور ایک ریڈنگ روم قائم کیا۔جہاں وہ اپنی شکایتیں بیان کرتے تھے ان میں شیخ محمد عبداللہ، مولوی عبدالرحیم، محمد رجب، غلام احمد فاضلی اور مفتی جلال الدین۔ عام لوگوں نے پہلے پہلے ان پر کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔آخر میر واعظ یوسف شاہ صاحب نے ان کو لوگوں سے متعارف کرایا۔اور اس کے بعد سات نمائندوں کی کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ اس تحریک کی سربراہی کریں۔ممبران میں مولوی یوسف شاہ، میر واعظ احمد اللہ، آغا سید حسین جلالی، خواجہ شہاب الدین، خواجہ غلام احمد عشائی۔اور خواجہ سعید الدین شال۔عشائی صاحب کے ذریعہ شیخ عبداللہ سرینگر کے معزز شہریوں سے متعارف ہوگئے اور دونوں آپس میں نزدیک ہوگئے۔شیخ صاحب ہر دن عشائی صاحب کے گھر فتح کدل سائیکل پر تشریف لاتے اور کشمیری قوم کی حالت زار پر صلح مشورہ

کرتے۔ اسی اثناء میں شیخ صاحب لوگوں میں ہر دل عزیز ہو گئے۔ آپ اپنی تقریر قرآن شریف کی آیتوں سے شروع کرتے اور اپنی سُریلی آواز میں علامہ اقبال کے شعر گنگناتے کمیٹی نے باقاعدہ طور پر ایک سیاسی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس رکھا گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ پارٹی ہر دل عزیز ہو گئی۔ اسی موقعہ پر عشائی صاحب شیخ صاحب کے رہبر بن گئے۔ مولوی عبداللہ جو کہ بڑے عالم تھے نے اس تحریک کی رہبری کی یہ عشائی صاحب ہی تھے جنہوں نے اس کانفرنس کی خط وکتابت اور ڈرافٹنگ مرتب کی۔ آخر مسلم کانفرنس ۱۹۳۸ء میں نیشنل کانفرنس بن گئی۔ جب یہ تحریک زوروں پر تھی تو مہاراجہ ہری سنگھ نے مسلمانوں کی شکایتیں دور کرنے کے لئے گلنسی کمیشن مقرر کیا۔ سر گلنسی صدر اور کشمیری مسلمانوں کی نمائندگی عشائی صاحب اور کشمیری پنڈتوں کی نمائندگی پریم ناتھ بزاز اور لوک ناتھ شرما جموں کے لوگوں کے لئے مقرر کئے گئے۔ مہاراجہ نے کمیشن کی سفارشات قبول کیں اور مسلمانوں کو کچھ رعایات سرکاری نوکریوں میں دیں۔ اور اسکول کھولے۔ جن کو جبری اسکول کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ کچھ خانقاہیں اور مسجدیں جو کہ حکومت کی تحویل میں تھیں مسلمانوں کو واپس کر دیں گئیں۔ مثلاً پتھر مسجد، مسجد ملا آخون شاہ۔ گلنسی کمیشن کے ذریعہ عشائی صاحب کو حکومت کے آفیسروں اور منسٹروں سے تعلقات پیدا ہوئے اور آپ کو مالیات کا اسسٹنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد آپ اطلاعات کے ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ

آپ پرجا سبھا کے ممبر بھی مقرر ہوئے یہ کام آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔اس کے بعد وزیر اعظم جموں کشمیر رائے بہادر رام چند کاک نے آپ کو سپیشل مسلم انسپکٹر ایجوکیشن مقرر کیا۔ جب ۱۹۴۷ء میں شیخ صاحب ریاست کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔آپ کو ایس پی کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہوا۔تو پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان کو منتقل ہوگئی۔جموں کشمیر میں ایک الگ یونیورسٹی کی ضرورت پڑگئی۔مجبوراً یہاں کی حکومت نے کوئی امتحان وغیرہ نہیں لیا۔آخر کار عشائی صاحب کو منتخب کیا گیا کہ وہ جموں وکشمیر کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کریں۔ چنانچہ آپ کو ۱۹۴۸ء میں نئی یونیورسٹی بنانے کے لئے سپیشل آفیسر مقرر کیا گیا۔ مزید یونیورسٹی کے لئے قوانین سینٹ اور سنڈیکیٹ بنائے گئے آپ نے یہ کام بڑی محنت اور لگن سے سرانجام دیا اور یونیورسٹی کی سنگ بنیاد ۲ نومبر ۱۹۴۸ء میں پڑی۔آپ کو جموں کشمیر یونیورسٹی کا پہلا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔اور امتحانات مارچ ۱۹۶۹ء میں اسی یونیورسٹی سے لئے گئے۔۱۹۵۳ء میں جب شیخ صاحب کی حکومت گرگئی آپ کو بھی قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔اور یونیورسٹی سے آپ کو بے دخل کیا گیا اس لئے کہ آپ شیخ صاحب کے رہبر اور سیاست میں آپ ان کے ساتھی تھے جیل سے رہائی کے بعد آپ نے آزاد زندگی گذاری۔اور لوگ آپ کے زرّیں مشوروں سے مستفید ہوتے تھے۔

آپ نے ۱۳ر نومبر ۱۹۶۴ء میں اس دنیا فانی سے رحلت فرمائی اور اپنے آبائی قبرستان عشائی کوچہ فتح کدل میں سپرد خاک کئے گئے۔آپ کے تعزیتی جلوس میں شیخ صاحب برابر مقبرہ تک شریک رہے۔

عبدالسلام رفیقی (مجاہد آزادی)

(۱۸۷۹ء-۱۹۴۱ء)

آپ سرینگر میں رفیقی کوچہ میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ مذہبی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ ۹ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ اور حافظ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں آپ نے امامت کا پیشہ اختیار کیا اور آپ کو مولوی عبدالسلام رفیقی کے نام سے یاد کیا گیا آپ جب ۱۶ مہینہ کے تھے تو آپ کی والدہ انتقال کرگئی۔ آپ کی شادی آپ کی چچیری بہن سے ہوگئی۔ جو حافظ مولوی محمد یحیٰ کی دختر تھی اس کے بعد آپ ڈلہوزی تشریف لے گئے اور وہاں کی جامع مسجد کے امام مقرر ہوئے ڈلہوزی میں سیر وتفریح کے لئے ایک پارک تھی۔ جو صرف بیرونی سیاحوں کے لئے مقرر تھی۔ اس کے دروازے کے باہر بورڈ پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"ہندوستانیوں اور کتوں کو باغ میں آنے کی اجازت نہیں؟"

اس عبارت سے رفیقی بڑا مشتعل ہوا اور بورڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جس وجہ سے حکومت برطانیہ نے رفیقی کو گرفتار کیا اور اس کو سزا دی گئی۔ آپ سرسید احمد خان کی آل انڈیا محمڈن تعلیمی کانفرنس کے ممبر بنے۔

آپ ۱۸۹۶ء میں اپنے مادر وطن کشمیر آئے۔ اپنی بیگم اور دو ساتھیوں کے ساتھ اس کے بعد آپ کے تعلقات کشمیر کی مشہور شخصیتوں سے ہوئے۔ خاص طور پر عبدالصمد ککرو، رئیس امرتسر شیخ غلام صادق، خواجہ ثناء اللہ شال، مفتی قوام الدین، مولوی رسول شاہ صاحب کے ساتھ۔ آپ نے اپنے آبائی گھر فتح کدل رفیقی کوچہ کے نزدیک اپنا گھر تعمیر کیا۔ اگر چہ آپ یہاں ہاوس بوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ آپ نے ۱۸۹۶ء میں سرینگر میں اپنا ایک اخبار نکالا جس کا نام الرفیق تھا۔ اس اخبار کے دو ہی شمارے نکلے تھے کہ اس کو ڈوگرہ حکومت نے بند کیا۔ کیونکہ اخبار میں ان کے خلاف لکھا گیا تھا۔ اور رفیقی کا یہ مطالبہ تھا کہ جموں کشمیر میں ایک مسلمان وزیر اعظم ہونا چاہیے کیونکہ ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس وقت کشمیر میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حکومت تھی۔ ڈوگرہ حکومت نے آپ کی سب جائیداد ضبط کی اور یہاں تک کہ پرنٹنگ پریس کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور کشمیر سے جلا وطن کر دیا۔ بلکہ نہ صرف مہاراجہ پرتاب سنگھ نے انگریز حکومت سے درخواست کی۔ کہ وہ عبدالسلام رفیقی کو گرفتار کریں۔ اس کے بعد آپ کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ۱۹۰۳ء میں آپ کو رنگون میں رہا کر دیا گیا آپ نے رنگون برما میں پھر الرفیق اخبار نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر اور رنگون سے شائع کیا۔

آپ نے ۱۹۰۹ء میں اپنا ایک پرنٹنگ پریس خریدا۔ اور اس اخبار کے ذریعہ آپ نے انگریزوں کیخلاف محاذ کھڑا کر کے ان کو ہندوستان سے نکلنے

کے لئے مضامین تحریر کئے آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور اس کی ملکہ زینت محل کی قبریں دریافت کیں۔ جان بوجھ کر انگریزوں نے خستہ حالت میں رکھیں تھیں۔ آپ نے حکومت وقت کے خلاف آخری شہنشاہ ہندوستان کی قبر کی مرمت کے لئے ایک مہم جاری رکھی۔ پہلے حکومت برطانیہ نے اقرار کیا پھر انکار۔ پھر آپ نے ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مالی امداد دے تا کہ بہادر شاہ ظفر، اور بیگم زینت محل کی قبروں کو از سر نو تعمیر کیا جا سکے عبدالسلام رفیقی نے انگریز حکمرانوں سے خط و کتابت کی کہ وہ ہندوستان کو آسٹریلیا کے طرز پر آزادی دے۔ اسکے حرکات و سکنات کو انگریز حکومت نے پسند نہیں کیا اور اس کو دوبارہ رنگون میں گرفتار کیا۔ جس وقت مقدمہ کی کاروائی چل رہی تھی تو آپ کے وکیل نے آپ کو کہا کہ آپ پر غداری کا مقدمہ چل سکتا ہے اور آپ کو سزائے موت بھی ہو سکتی ہے اس سے آپ خوفزدہ ہو گئے اور رنگون سے بھاگ کر انڈونیشیا پہنچ گئے۔ انڈونیشیا کی حکومت سے برطانیہ نے رجوع کیا اور رفیقی کو گرفتار کرنے کی گذارش کی چنانچہ حکومت نے ان کو گرفتار کیا لیکن آپ کے وکیل نے حکومت سے استدعا کی کہ رفیقی نے انڈونیشیا میں کوئی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہے لہٰذا اس کو رہا کیا جائے۔ ڈچ حکومت نے رفیقی صاحب کو رہا کیا اور ان کو انڈونیشیا کے بجائے تیمور روانہ کیا۔ اتنی دیر میں حکومت برطانیہ نے آپ کے پیچھے جاسوس روانہ کیا۔ اگر چہ رفیقی صاحب نے کشمیر آنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن وہ پوری نہیں ہو سکی اور آخر آپ ۲ جولائی ۱۹۴۱ء میں جکارتا انڈونیشیا میں وفات پا گئے اور آپ کو وہاں پر سپرد خاک کیا گیا۔

رابرٹ تھورپ

کرنیل آر تھورپ ایک انگریز سیاح ۱۸۳۳ء میں توسہ میدان کے راستے کشمیر پہنچا۔ یہاں اس کی ملاقات محترمہ جانہ سے ہوئی۔ جو کہ سوگن گاؤں کی رہنے والی دوشیزہ تھی جو کہ توسہ میدان کے جنگلوں کے دامن میں ایک خوبصورت گاؤں ہے۔ دونوں میں محبت ہوئی اور انہوں نے شادی کر لی اس کے بعد دونوں انگلستان چلے گئے۔ جہاں ان کے تین بچے پیدا ہوئے سب سے چھوٹے لڑکے کا نام رابرٹ تھورپ تھا جو ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا۔ رابرٹ تھورپ کو اپنی والدہ نے اپنے وطن کشمیر کے بارے میں اس کی خوبصورتی اور شخصی راج کے مظالم کے بارے میں جانکاری دی تھی۔ تھورپ پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ اس کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ وہ اپنی والدہ کا وطن دیکھ سکے۔ اس غرض سے وہ ۱۸۶۶ء میں کشمیر پہنچا۔ اس نے اپنے ننھال کی تلاش کی۔ اس نے دیکھا کہ کشمیری نہایت مفلسی کی زندگی گزار رہے ہیں اور وہ فاقہ کشی پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہ لوگ غربت، افلاس، جہالت اور غلامی کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ انگریزوں نے بینامہ امرتسر کے ذریعے ۷۵ لاکھ روپے کے عوض کشمیریوں کو ان کی مرضی کے خلاف ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ

فروخت کیا ہے جو اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتا اور عایا کی خون پسینہ کی کمائی کو ہڑپ کر جاتا ہے۔اس نے دیکھا کہ لاکھوں کشمیری اپنی ساری زندگی ننگے ، بھوکے حیوانوں کی طرح گزار رہے ہیں۔اور غلامانہ زندگی بسر کرر ہے ہیں۔لڑکیوں کو فروخت کیا جارہا ہے تاکہ حکومت کی آمدنی بڑھ جائے۔یہاں کے کاریگر، شالباف اور دیگرفن کار مفلسی اور غریبی کی زندگی گزار رہے ہیں۔یہ دیکھ کر رابرٹ تھورپ کا دل تڑپ اُٹھا اس کی رگوں میں اس کی کشمیری ماں کا دودھ پکار پکار کر کہنے لگا کہ مادر کشمیر پر ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کرو۔

ان دنوں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا یہ حکم تھا کہ چند ماہ گذارنے کے بعد تمام سیاح ریاست کی حدود سے باہر نکل جایا کریں۔مگر رابرٹ تھورپ نے فیصلہ کیا کہ وہ ریاست سے باہر نہیں جائے گا اس نے جگہ جگہ معلومات حاصل کیں اور حکومت انگلستان کو ظلم وستم کی روداد سے آشنا کیا۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے کشمیر میں شالبافی کے قریب سو کارخانے ہیں ہر کارخانہ میں ۳۰ سے لے کر ۳۰۰ شالباف مزدور ہوا کرتے ہیں۔سرکاری محکمہ جو اس صنعت پر ٹیکس عائد کرتا ہے۔کارخانے کے ہر مزدور پر قریباً ۴۸ روپے سالانہ ٹیکس لگتا ہے۔ہر شال بنانے کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے ۱۹ روپے فی شال کے حساب سے ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔خواہ شالباف معزور یا اندھا بھی ہو جائے وہ چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔وہ بیمار ہو جائے تب بھی اس مصیبت سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔اس لئے شروع سے ہی وہ اپنے بچوں

کو اپنے ساتھ کام پر لے جاتا ہے۔ کارخانہ کی تنگ تاریک کوٹھریاں اس کے لئے اور اس کے بچوں کے لئے ایک جیل خانہ ہیں اور اس سے کبھی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر ایک طرف رابرٹ تھورپ کشمیریوں کی لاچاری، مفلسی اور بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔ تو دوسری طرف ان کی بلند ہمتی ان کے عزم ان کے صبر اور ان کی اعلیٰ پایہ قومی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

یہاں کشمیر میں رہ کر اس نے دیکھا جو کچھ زمین پر اُگتا ہے اور جو کچھ بھی کسان اُگاتا ہے اس کا بیشتر حصہ حکومت اور اس کے سرکاری اہلکار ہڑپ کر جاتے ہیں۔ تحصیلدار، پٹواری، تھانیدار اور دوسرے سرکاری اہلکار غریب اور مظلوم کسانوں کا خون چوس لیتے ہیں۔ کشمیر کی تمام دولت پر مہاراجہ کے چند ایک سرمایہ دار اور جاگیردار قابض ہیں۔ عوام کو تنگ کر کے تڑپا تڑپا اور بار بار بھیک مانگنے، رونے اور چلانے کے بعد کہیں سیر بھر اناج نصیب ہوتا ہے اور کپڑا کفن کے لئے بھی دستیاب ہونا مشکل ہے۔ بیعنامہ امرتسر کے خلاف سب سے پہلے رابرٹ تھورپ اپنی آواز بلند کر کے لکھتا ہے۔

حکومت برطانیہ جواب دے کہ کن اخلاقی اصولوں کے تحت اس نے ۱۸۴۶ء میں کشمیریوں کو غلامی میں فروخت کر دیا۔ تاریخ کا یہ ایک سیاہ کارنامہ ہے کہ انگریز نے ایک گھناونی سازش کے تحت دغابازی کے سلسلے میں معصوم زندگیوں کو چاندی کے چند سکوں کے عوض فروخت کر لیا۔ ۱۸۶۷ء میں رابرٹ تھورپ شمالی کشمیر میں گریز سے وادی استور پہنچا وہاں برف گر رہی تھی۔ راستے کے دونوں جانب انسانوں اور جانوروں کی لاشیں تھیں اس

سلسلے میں اس نے لکھا۔ کہ سال موسم خزاں میں کشمیریوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ گلگت میں فوجیوں کے لئے راشن لے جائے۔ کسانوں کو پکڑنے کا کام کاردار انجام دیتے ہیں۔ اور کشمیر کے کسان بیگار کے لئے پکڑے جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی گلگت کی سڑکوں پر مرتے ہیں نہ ان کے لئے خوراک کا انتظام ہوتا ہے نہ پانی کا۔ ان کے کندھوں پر چاول کی بوریاں ہوتی ہیں۔ یہ بوجھ کشمیری دشوار گزار گھاٹیوں فلک بوس چوٹیوں اور پہاڑی راستوں کو سر کرنے کے واسطے اُٹھاتے ہیں بڑے طوفانوں میں وہ آگے بڑھتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ وسلم کے اسم مبارک لیتے ہوئے ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے ہیں رابرٹ تھورپ نے اپنی مشہور تصنیف ''مس گورنمنٹ ان کشمیر'' میں لکھا ہے اگر چہ میری راہ میں کئی مشکلات ہیں تاہم میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ظلم وستم کی داستان کو مکمل کردوں کشمیر جو ماضی میں ایک اعلیٰ قوم تھی ذلت اور غریبی میں مبتلا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے کیا یہ انگریز کی ذمہ داری نہیں جس نے کشمیریوں کو فروخت کر کے گلاب سنگھ کی غلامی میں دیا جب آپ نے ''مس گورنمنٹ ان کشمیر'' کی کتاب تحریر کی اور ظلم کے خلاف مضامین اور آرٹیکلز بیرونی اخباروں میں چھپوائے۔ جس سے کشمیر کے اصلی حالات دنیا پر ظاہر ہوئے۔ اس سے حکومت گھبرا گئی اور اس پر بہت ساری پابندیاں عائد کی گئیں۔ لیکن اس سے تھورپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

آخر تھورپ کو کشمیر سے نکل جانے کا حکم ہوا لیکن اس کے باوجود آپ

۲۱ نومبر ۱۸۶۸ء کو دوبارہ کشمیر آئے۔ دوسرے دن آپ کو شنکر آچاریہ کے دامن میں نزدیک آستانہ یعقوب صاحب کے نزدیک مردہ پایا گیا تھا۔ جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ غالباً ان کو زہر دے کر مارا گیا آپ کو عیسائی قبرستان شیخ باغ میں سپرد خاک کیا گیا آپ کی قبر پر لکھا ہے۔ رابرٹ تھورپ۔ عمر ۳۰ سال ۲۲ نومبر ۱۸۶۸ء۔ آپ نے اپنی زندگی کشمیر پر قربان کی۔ رابرٹ تھورپ کے انتقال کے بعد انگریزوں نے یہ ذہن نشین کیا۔ کہ کشمیریوں پر کتنا ظلم وستم ہو رہا ہے انہوں نے کشمیریوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے بہت سارے اقدام کئے انہوں نے بہت سارے انگریز افسروں کو کشمیر روانہ کیا اپنے قانون بنائے جس سے لوگوں کی جان ومال کی حفاظت ہو۔ رابرٹ تھورپ پہلا انسان تھا جو کشمیر کی آزادی کے لئے شہید ہوا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنا ایک نمائندہ جس کو رزیڈنٹ کہا جاتا تھا۔ کشمیر روانہ کیا جو کشمیر کے حالات پر نظر رکھتا تھا تاکہ کشمیریوں پر ناانصافی نہ ہو۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ

حضرت علامہ انور شاہؒ ۲۷ شوال المکرّم ۱۲۹۲ھ (مطابق ۱۷/۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء) اپنے ننھیال دودھ ون علاقہ لولاب میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی پیر محمد معظم شاہؒ اور والدہ بی بی مال دیدی تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ حضرت شیخ مسعود نرویؒ کے اولادوں میں سے تھے۔ حضرت شیخ مسعودؒ کا شجرہ نسب اوپر جا کر امام اعظم ابو حنیفہؒ سے جا ملتا ہے۔ حضرت شیخ مسعودؒ دسویں صدی ہجری کے اولیائے کشمیر میں سے تھے آپ شہر کے شریفوں اور بڑے امیروں میں سے تھے۔ ملک التجار لقب تھا۔ آپ خدا پرستی سے سرشار تھے۔ آپ کے مرشد حضرت میر سید احمد کرمانیؒ تھے۔ سلطان العارفینؒ ان کے بلند مرتبہ کا ذکر فرماتے تھے۔ کچھ تبرکات جو حضرت میر سید احمد کرمانی کو اپنے بزرگوں سے ملے تھے اور انہوں نے اپنے ساتھ کشمیر لائے تھے۔ آپ کے فرزند میر سید مسافرؒ نے وہ تبرکات بھی خواجہ مسعودؒ کو عطا فرمائے۔ جو اس وقت نروہ کے مسجد تشریف میں موجود ہیں۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ حضرت بابا مسعودؒ کی آٹھویں پشت میں تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ اور ان آباد اجداد کا ایک ہی متعین وطن نہیں رہا۔ اس خاندان کے لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک مقام سے

دوسرے مقام پر منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس خاندان کے بزرگ ۱۱۰۰ء
تک علاقہ نرورہ سرینگر میں سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد
بارویں صدی ہجری کے دوران اولاد شیخ مسعودؒ کی وہ شاخ جس کے گل سرسبز
مولانا انور شاہ صاحبؒ ہیں وادی کشمیر کے شمالی حصہ یعنی علاقہ کامراج
لولاب کے خوبصورت علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔ اور موضع ورنو میں ایک تیز
رفتار اور شور مچاتی ہوئی چھوٹی سی ندی کے کنارے دامن کوہ میں قیام پذیر
ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب کے دیندار والدین نے ایام رضاعت سے ہی
آپ کی ذہنی تربیت کا خیال رکھا۔

خاندانی رواج کے مطابق ٹھیک چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر میں
آپ کے والد گرامی نے آپ کو قرآن شریف پڑھانا شروع کیا۔ چھ برس کی
عمر میں فارسی زبان کی مشہور کتابیں کریما نام حق، گلستان اور بوستان پڑھنے
لگے۔ آپ کی تعلیم کے ابتدائی مراحل نہایت تیز رفتاری کے ساتھ طے
ہونے لگے بارہ سال کی عمر تک آپ نے اپنے شفیق اور فاضل والد ماجد کے
علاوہ جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ان میں مولوی جبار صاحب اور مولوی
غلام محمد صاحب قابل ذکر ہیں۔ ۱۳۰۵ء کا زمانہ تھا وادی کشمیر اس غلامی کے
دور میں اپنی باقاعدہ دینی درس گاہوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔
تیرہویں صدی ہجری کے سیاسی انقلابات اور آئے دن کی لوٹ کھسوٹ کی
وجہ سے سرینگر کی قدیم دانش گاہوں کے چشمے خشک ہو گئے تھے۔

اب کشمیر کے مشتاقان علم و عرفان کے لئے خطہ کشمیر سے باہر پگھلی اور

ہزارہ میں علم ودانش کے چشمے تھے جن کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ کشمیر کا مغربی کنارہ ضلع ہزارہ کے ساتھ ملحق ہے۔ موجودہ صوبہ سرحد کے اس ضلع کی علمی درس گاہیں اس زمانے میں اہل کشمیر کے لئے کشش کا موجب تھی۔ چنانچہ اپنے حصول تعلیم کے وقت مولانا معظم شاہ صاحب نے بھی وادی نیلم (ضلع مظفر آباد) سے نکل کر علاقہ ہزارہ کی درس گاہوں سے ہی علم حاصل کیا تھا۔ آپ نے اپنے فرزند انور شاہ صاحبؒ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں آپ کو ہزارہ روانہ کیا۔ چنانچہ ۱۳۰۵ھ میں بہ عمر ۱۳ سال انور شاہ حصول تعلیم کے لئے ہزارہ روانہ ہوئے ہزارہ میں تین سال کے عرصہ میں آپ صرف ونحو، فلسفہ اور فقہ کے علاوہ درس گاہوں میں مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۰۹ھ میں کشمیر آ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں زمینوں کا پہلا بندوبست ہو رہا تھا اور علاقہ لولاب میں بھی زمینوں کی پیمائش ہو رہی تھی۔ اس لئے آپ کو بھی علم ہندسہ وحساب اور پیمائش سے کچھ ایسی رغبت ہوگئی کہ آپ نے سال بھر کے لئے سب کام ملتوی کر کے اپنی تمام دلچسپی اس پر مرکوز کر دیں لیکن اس کام سے آپ کے بزرگ خوش نہیں تھے۔ وہ آپ کو مزید مذہبی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ آخر شاہ صاحبؒ بندوبستی کے مشغل کو خیر باد کہہ کر دیو بند روانہ ہو گئے۔ ۱۳۱۱ھ میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوئے اور ۱۳۱۴ھ میں فراغت حاصل کی۔ دار العلوم میں جن اساتذہ کرام سے شاہ صاحبؒ کو شرف تلمذ رہا۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا الحاج حافظ خلیل احمد صاحب، حضرت مولانا اسحٰق صاحب،

حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی دار العلوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گنگوہ سے واپس آ کر شاہ صاحبؒ کچھ عرصہ تک بجنور میں رہے اسی دوران آپ کے ایک دوست مولانا امین الدین نے ارادہ کیا کہ دہلی میں ایک عربی درسگاہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ سب سے پہلے اس کام میں رفاقت کے لے مولانا موصوف کی نظر حضرت شاہ صاحبؒ پر پڑی۔ اور آپ نے طے کیا کہ شاہ صاحبؒ کو بھی اس مہم میں اپنے ساتھ شامل کر کے تدریس کی ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے۔ چنانچہ مولانا امین الدین شاہ صاحب کو اپنے ارادہ کے ساتھ متفق کر کے دہلی لے گئے اس طرح ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ امینیہ کا قیام عمل میں آ گیا۔

شاہ صاحبؒ ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۲۰ھ تک مدرسہ آمینیہ میں بحیثیت صدر مدرس اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران مدرسہ نے نمایاں ترقی کی۔ ۱۳۲۰ھ میں ان کے بڑے بھائی مولوی یاسین صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ کی خبر سے شاہ صاحبؒ دہلی چھوڑ کر کشمیر تشریف لے آئے۔ پھر عرصہ دراز تک کشمیر میں ہی رہے اور اس مدت میں اکثر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔

۱۳۲۳ھ میں اپنے چند رفقاء بالخصوص بارہمولہ کے خواجہ عبد الصمد ککرو کے ہمراہ زیارت بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ سفر حج میں طرابلس، بصرہ، مصر، شام اور دوسرے ممالک کی سیاحت کی۔ مکہ معظمہ میں کافی دن تک قیام فرمانے کے دوران وہاں کے کتب خانوں کا بھی معائینہ کیا۔ سفر حج

سے واپسی پر خواجگان بارہمولہ بالخصوص خواجہ عبدالصمد ککرو و خواجہ امیر الدین ککرو اور خواجہ امیر شاہ کے اصرار پر قصبہ بارہمولہ کشمیر میں ایک دینی مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا۔ جسے قریباً تین سال تک چلاتے رہے لیکن اہل کشمیر نے اس وقت آپ کو بھر پور تعاون نہ دیا جس کی وجہ سے آپ ۱۳۲۸ھ میں بارہمولہ چھوڑ کر دیوبند کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں اپنے اساتذہ کرام بالخصوص آپ کے استاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا قاری محمد طیب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے آپ کو دیوبند میں روک لیا اور آپ نے بھی اپنے اساتذہ کی بات سنی اور قیام دیوبند کا ارادہ فرمالیا۔

۴۴ سال کی عمر تک آپ نے شادی نہیں کی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ ایک ایک لمحہ پڑھنے اور پڑھانے میں ہی صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ کے دل و دماغ میں حرمین (مکہ معظّمہ) کی طرف ہجرت کرنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا۔ اس عرصہ میں آپ نے دیوبند، دہلی اور بارہمولہ وغیرہ میں اپنا قیام عارضی شکل میں رکھا اور کہیں بھی مستقل طور سکونت اختیار نہ کی۔ آپ کے دوستوں کو فکر تھی کہ کہیں کسی وقت اچانک شاہ صاحبؒ ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز مقدس ہی نہ چلے جائیں لہٰذا طے پایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو آمادہ نکاح کیا جائے۔ چنانچہ ۱۳۳۶ھ میں آپ کا نکاح قصبہ گنگوہ (ضلع سہارنپور) کے ایک سادات خاندان میں ہوا۔

۱۳۴۶ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر دیوبند میں آپ کو کچھ اختلافات

ہوئے اور کچھ معاملات پیش آئے ناخوشگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ شاہ صاحب اپنے بہت سے ساتھیوں اور طلباء سمیت دارالعلوم دیو بند سے علیحدہ ہو گئے اور دیو بند کے بجائے آپ نے سرزمین ڈابھیل (ضلع سورت گجرات) کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔ شاہ صاحبؒ نے اس ایک معمولی مدرسہ کو ہندوستان کا دوسرا دارالعلوم دیو بند یا جامعہ اسلامیہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے آپ ریاست بہاولپور اور شہر لاہور کے سفر پر تھے اپنے دولت خانہ پر دیو بند پہنچے تو آپ کی علالت نے شدت اختیار کی لیکن جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں جو درس و تدریس کا کام آپ کے ذمہ تھا اسے آپ حاصل حیات کا درجہ دے رہے تھے۔ اس لئے اپنی علالت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مزید کچھ وقت کے لئے آپ نے ڈابھیل کا سفر اختیار کیا اور درس حدیث کا مشغل جاری رکھا۔ لیکن جسمانی کمزوری نے نازک صورت اختیار کرلی تو آپ اپنے رفقاء سے رخصت ہو کر واپس دیو بند تشریف لے آئے اور گھر پہنچ کر صاحب فراش ہو گئے مرض کا یہ آخری حملہ اس قدر شدید تھا کہ کوئی علاج کارگر نہ ہوسکا۔ اور بالآخر آپ ۳ ماہ صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء دیو بند میں انتقال کر گئے۔ آپ کے انتقال پر جن اصحاب نے آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ان میں حکیم الامت مفکر اسلام علامہ سر محمد اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی اعظم ہند، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید حسین ندوی وغیرہ شامل ہیں۔

بابا مسعود نروری الم صاحبؒ

بابا مسعود نروری الم صاحبؒ شہر کے شرفاء، اور بڑے امراء میں سے تھے۔ ملک التجار لقب تھا۔ ساتھ ہی خدا پرستی کی بھی تڑپ تھی آپ روحانی تسکین حاصل کرنے کے لئے حضرت میر سید احمد کرمانیؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ان کی نظر کیمیا اثر سے بابا کے دل کو کچھ اطمینان سا حاصل ہوا اور آنجناب کے فرمانے کے موجب رات کو نماز استخارہ پڑھ کر سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کشتی میں تشریف فرماہیں اور سارے سہروری حضرات گردنوں میں رسیاں ڈال کر کشتی کو کھینچ رہے ہیں۔ بابا مسعودؒ کو بھی گردن میں رسی ڈال کر کشتی کو کھینچے کی اجازت ملی۔ دوسرے دن حضرت میر سید کرمانی کی خدمت میں جا کر خواب بیان کیا۔ انہوں نے مبارک باددی اور سہروری طریقہ کی تعلیم اور تلقین فرمائی۔ اسی دن مال و دولت، جاہ و حشم، امیری کا خیال دل سے مٹ گیا اور معبود حقیقی کی یاد نے دل میں جگہ لی۔ آنجناب کی تربیت اور توجہ ذاتی ریاضت اور مجاہدہ سے دنوں میں سلوک کے منزل اور طریقت مدارج طے کرتے گئے اور نیک بختی، خوش قسمتی اور سعادت ابدی کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ مرشد بزرگوار کی خدمت جیسی چاہیئے تھی۔ ویسی بجا لا کر ان کی

خوشنودی حاصل کی۔ مرشد بزرگوار کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند میر سید مسافر سے حضرت بابا کو خطِ ارشاد ملا۔ حضرت میر کے خلیفہ سید جلال الدین کی صحبت سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ حضرت سلطان العارفینؒ اور حضرت حاجی احمد قاریؒ کے پاس زیادہ آنا جانا تھا۔ حضرت محبوب العالمؒ کے بلند استعداد اور مرتبہ کا اکثر ذکر فرماتے تھے۔ کچھ گران بہا تبرکات جو حضرت میر احمد سید کرمانیؒ کو اپنے بزرگوں سے ملے تھے وہ انہوں نے اپنے ساتھ کشمیر لائے تھے۔ میر سید مسافر نے خط ارشاد عطا کرتے وقت وہ تبرکات بھی خواجہ مسعودؒ کو عطا فرمائے۔ جو اس وقت نرورہ میں موجود ہیں۔ ایک مقفل سر بستہ ڈبہ ہے۔ جس کے کھولنے کی کسی نے جرأت نہیں کی ہے۔ روایت ہے کہ اس میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ڈوپٹہ، شہداء کربلا کے خون آلودہ جامے ہیں۔ دوسرا تبرک سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ کا نعلین مبارک ہے۔ تیسرا تبرک جھنڈے کا پنجہ ہے۔ جو سرور کائناتؐ جنگوں میں ساتھ رکھتے تھے۔ خواجہ مسعودؒ کا مقبرہ نرورہ میں ہے۔

محمد سبحان حجام

کشمیر کی تاریخ ماضی سے اب تک زمانے کے اتار چڑھاؤ، مالی بدحالی، ظلم وستم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ۱۵۸۵ء سے جب سے مغلوں نے کشمیر کو فتح کیا تب سے ۱۹۴۷ء تک یہ غیر ملکی حکمرانوں کے قبضے میں رہا ہے یہ حکمران یہاں پر عیش وعشرت کی محفلیں سجاتے تھے۔ ہندو راجاؤں کے وقت میں بھی کشمیری عورتوں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ عورت کو ایک دایہ کی حیثیت حاصل تھی۔ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ کو سوسو بیویاں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ حکمران کبھی اپنے وزیروں کے خاندان کی خوبصورت لڑکیوں کو بھی ہوس کا شکار بناتے رہے۔ مغل صوبیداروں نے بھی اس قسم کی محفلوں کو قانونی تحفظ دیا۔

پٹھان جنہوں نے کشمیر پر ۱۷۵۳ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک حکومت کی۔ کا دور کشمیریوں کے لئے پریشانی اور ظلم کا دور تھا پٹھانوں نے کشمیری عورتوں کے ساتھ جنسی روابط بنالئے۔ اغلام بازی، بچہ نغمہ اور حافظ نغمہ کو رائج کیا پٹھان صوبیداروں میں خان جوان شیر جو کہ کشمیر کا گورنر تھا نے سرکاری اخراجات پر باضابطہ ناچنے والیوں کی ایک ٹولی ترتیب دی تھی۔ اور خود اس نے ایک ہانجی لڑکی سے شادی کی سکھ حکمران جنہوں نے کشمیر پر ۱۸۱۹ء سے

لے کر ۱۸۴۶ء تک قبضہ کیا۔ کا دور بھی کشمیریوں کے لئے مصیبت اور پریشانی کا دور رہا۔ انہوں نے بھی اپنے دربار میں حافظاؤں کی محفلیں سجائیں۔ پھر وہ مکروہ دن بھی کشمیر کو دیکھنا پڑا۔ جب مارچ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے کشمیری عوام کا سودا کر کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ کشمیری مسلمانوں کو زر خرید غلام سمجھا اور ٹیکسوں کی بھرمار کر کے کسانوں، شالبافوں کو مفلوک الحال بنا دیا۔ ان پر سرکاری اہلکاروں کی ایک بڑی فوج مسلط کر رکھی تھی جوان کا خون چوستی تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ نے بھی ناچنے والی لڑکیوں اور حافظوں کو اپنے محل میں رکھا یہ لڑکیاں خوبصورت زیورات پہنتی تھیں تا کہ لوگوں کا دل لبھا سکیں ۔ یہ فارسی اور کشمیری گانے گاتی تھیں۔

ڈوگرہ حکمرانوں نے لڑکیوں کی خرید وفروخت سے وصول شدہ آمدنی سرکاری خزانے میں داخل کرنے اور سرکاری کاغذات میں باضابطہ اندراج کرنے کا طریقہ بھی رائج کیا تھا۔ انہوں نے جسم فروشی کو فروغ دیا۔ جسم فروشی کے لئے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑاتھا۔ اور اس میں باقاعدہ فیس دینی پڑتی تھی۔ جب کوئی ناچنے والی لڑکی مرجاتی تو اس کی جائیداد حکومت اپنی تحویل میں لیتی۔

ہر ایک طوائف کو سال میں ۱۰۰ روپے سرکار کو ٹیکس دینا پڑتا۔ ۱۸۹۰ء میں سرینگر میں طوائفوں کی تعداد ۲۰۰۰۰ تک پہنچی تھی اور اسی سال ۱۰۰۰ طوائفوں کو مشن ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ جو مختلف جنسی بیماریوں میں مبتلا

تھیں اور جسمانی طور پر ناکارہ بن چکی تھیں۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر سرینگر میں بے حیائی اور بدکرداری عام تھی۔

سرینگر اور وادی کے ہر علاقے میں یہ بدعت پھیل چکی تھی لیکن شہر سرینگر کے دو بڑے علاقے اس بدعت کے اہم مرکز بن چکے تھے ایک مائسمہ اور دوسرا تاشوان جہاں پر یہ بدکاری کا کام انجام دیا جاتا تھا۔غریب لڑکیوں کو چھوٹی سی عمروں میں عمارتوں کی کھڑیوں پر سنوار کر بٹھا دیا جاتا۔ کچھ لڑکیوں کو فرمائش پر پنجاب، دہلی اور کلکتہ روانہ کیا جاتا تھا۔حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ اس کاروبار پر روک لگانے کے لئے نہ تو مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے روک تھام کی۔نہ کشمیری پنڈتوں نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔

ان شرمناک حالات اور بے حیائی کے ماحول میں پوری وادی میں ایک انسان تھا جس نے اس بدکرداری اور قوم کی بیٹیوں کی عصمت ریزی کے خلاف سب سے پہلے آواز اُٹھائی وہ تھا مائسمہ کا محمد سبحان حجام جو مائسمہ کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا۔سبحان نے اپنا بچپن ان چکلوں کے ارد گرد گلی کوچوں میں گزارا۔سرکاری کارندوں کے خوف سے ڈر جاتا اور جب بارہ سال کی عمر کو پہنچا تو اپنے ہم عمر لڑکوں کی ٹولیاں بنا بنا کر علاقے کی دور دور گلیوں تک آوازیں لگاتا ہے

ہر بھلائی حق بنی

نکلو کنجرو شہروں پار

محمد سبحان حجام طبیعتاً ظریف تھا اس لئے لوگوں کو اکھٹا کر کے کنجروں، دلالوں اور طوائفوں کے خلاف اپنے فقرے کستا اور لطیفے سناتا کہ لوگ سن سن کر بے حال ہو جاتے اور کنجروں کو تھوکتے تھے ۱۹۲۴ء میں محمد سبحان حجام کی طرف سے اس کاروبار کے خلاف پہلا کتابچہ شائع ہوا۔

جس میں اس نے مہاراجہ کے کارندوں کی زیادتیوں اور چکلہ چلانے والوں، دلالوں کی ان سے ملی بھگت کی تفصیل شائع کی۔ اس وقت محمد سبحان حجام کی عمر ۱۶ سال تھی۔ وہ نہ صرف حکام وقت سے لڑتا بلکہ گھر گھر جا کر اپنے ہمسائیوں کے ساتھ بھی اس وبا کا انسداد کرنے کی ترغیب دلاتا رہا۔ آہستہ آہستہ علاقے کے لوگ محمد سبحان حجام کے دائرہ اثر میں آتے رہے وہ مائسمہ کے ہر چکلہ پر پہرہ دیتے اور عیش کرنے والوں کو سمجھاتے رہے اور علاقے میں نہ آنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ماسٹر محمد صدیق جو بسکو اسکول کا طالب علم تھا بسکو صاحب سے متاثر تھا اور انہی کے زیر اثر لوگوں کو سمجھایا کرتا تھا۔ دوسری طرف محمد سبحان حجام لڑکوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر شہر بھر میں گھومتا تھا اور کنجروں کے خلاف لوگوں کو اُکساتا تھا جس کا اثر شہر کے دور دراز علاقوں میں بھی ظاہر ہونے لگا۔ حکومت کے ساتھ پولیس بھی پریشان ہونے لگی۔ حالات نے تبدیلی اختیار کی نوجوان، بزرگ اور عورتیں بھی محمد سبحان حجام کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئیں۔ صورت حال پر قابو پانے کے لئے سرکار نے جھوٹے مقدمے تیار کر کے محمد سبحان حجام کو پھسانا شروع کیا اور الزامات لگائے۔ کہ سبحان حجام نقص امن کا ذمہ وار ہے اور وہ باغی

ہے۔ وہ شہر کے ذی عزت لوگوں کو ناحق بدنام کرتا ہے۔ حکومت اور مہاراجہ
کے خلاف عام لوگوں میں بدظنی پھیلا رہا ہے۔ حکومت کو مالی نقصان پہنچا رہا
ہے۔ محمد سبحان حجام نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے
دیواروں، کھمبوں اور مکانوں پر اشتہار لگائے۔ اور اس میں چکلہ چلانے
والوں کے خلاف وارننگ دی گئی اور ان افسروں اور مذہبی عالموں کو وارننگ
دے دی گئی جو اس بدعت کو ختم کرنے کے لئے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کرتے
تھے۔ شاید وہ سرکاری عتاب کے خوف سے اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ جبکہ
سیاسی لیڈر اسے فضولیات سمجھ کر منہ پھیرتے تھے۔ محمد سبحان حجام ریاست
خاص کروادی سے اس بدعت اور بدکاری کو ختم کرنے کے لئے نہ صرف
مسلمانوں سے مدد طلب کرتا تھا۔ بلکہ ان کشمیری پنڈتوں جو اونچے سرکاری
عہدوں پر فائز تھے کے علاوہ جموں کے رہنے والوں اور پنجاب سے آئے
ہوئے مسلمانوں کے نام بھی اپیلیں جاری کرتا تھا۔ اور کنجروں اور دلالوں
کے نام کے ساتھ ساتھ چکلوں پر آنے والوں کے نام رجسٹر میں لکھوانے کی
عرضداشت کرتا تھا۔ تاکہ سرکاری گزٹ میں شائع ہو۔ اس کے علاوہ محمد سبحان
حجام نے سرینگر شہر میں گندگی پھیلانے، قماربازوں، نقب زنوں، نانوائیوں کو کم
وزن کی روٹیاں بنانے اور سبزی فروشوں کو گلی سڑی سبزیاں بیچنے پر تنبیہ کی۔

محمد سبحان حجام کے اس جرأت مندانہ اقدام سے کشمیری قوم کے
خلاف انگریزوں کی سازشوں اور ڈوگرہ حکمرانوں کی بدنیتی اور بداخلاقی کی
قلعی کھل جاتی ہے۔ جس نے کشمیریوں کو گناہوں اور بدنامی کے دلدل میں

پوری طرح پھنسا دیا تھا۔ محمد سبحان حجام جو مہاراجہ کے بینڈ میں نوکری کرتا تھا کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ اور وہ اقتصادی طور پر کمزور ہو گیا۔ لیکن مرحوم بسکو نے اس کو اپنے اسکول میں بحیثیت نائی مقرر کیا۔ وہاں پر وہ طالب علموں اور استادوں کے بال کاٹتا تھا۔ اس سے مرحوم بسکو اور محمد سبحان حجام کے تعلقات (مراسم) بڑھ گئے۔ اور دونوں نے مل کر ڈاکٹر کھتلین جو کہ کشمیر دومن ایسوسی ایشن کی صدر تھی کو کشمیر کی عورتوں کے بارے میں دردناک حالات کی جانکاری دی۔ کھتلین نے لیگ آف نیشنز کو اس بارے میں اطلاع دی۔ کہ بدقسمت کشمیری لڑکیوں کی حالت کیا ہے انہوں نے اس بارے میں حکومت برطانیہ کو مطلع کیا۔ برطانیہ کی حکومت نے وائسرائے ہند کو کشمیری عورتوں کی دردناک حالت سے روشناس کیا۔ انہوں نے مہاراجہ کشمیر کو مجبور کیا کہ وہ چکلہ چلانے کا کام بند کریں اس کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے سرینگر کے باعزت لوگوں کی میٹنگ بلائی جن میں خاص طور پر میر واعظ احمد اللہ، سید حسین جلالی، خواجہ محی الدین کاوسہ اور سعد الدین شال شامل تھے ۱۹۳۴ء میں مہاراجہ نے چکلہ چلانے کا کام بند کر کے باضابطہ اسمبلی میں اس کو منظوری دے دی گئی یوں یہ ناسور کشمیر میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ محمد سبحان حجام نے اپنے دکان اور بازار میں چراغاں کیا۔ آخر ہمارے سماج کا یہ اہم کردار محمد سبحان حجام کارہائے نمایاں انجام دے کر ۲۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو انتقال کر گیا۔

☆☆☆

ملا جوہر نانت

آپ سرینگر کے شرفا میں سے تھے ۱۵۴۰ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ علم حاصل کرنے میں صرف کیا۔ آپ حضرت مخدوم صاحب محبوب العالمؒ کی خدمت میں آتے تھے اور حضرت مخدومؒ ان کو اُلفت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جناب کے فرمانے پر حضرت شیخ بابا داوٗد خاکیؒ کے شاگرد بنے۔ ظاہری علم سے فراغت پانے پر علوم باطنی کی طرف رجوع کیا۔ اور حضرت خاکیؒ سے تربیت پا کر سلوک کے منزلوں اور مقاموں کو طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ کر مرشد کے انتقال کے بعد مخدوم حاجی موسیٰ سے ارادت کا رابطہ باندھا۔ اس کے بعد حج پر جا کر مکہ معظّمہ اور مدینہ منورکی زیارت سے مشرف ہوئے سفر میں جہاں کہیں کسی بزرگ کا نام سنتے۔ اس سے ملاقات کر کے فیض حاصل کرتے۔ آپ مولانا علی قاری کی صحبت میں بھی رہے۔ حضرت شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں بھی پہنچ کر احادیث کی سند حاصل کی۔ جب آپ لوٹ آئے تو تنہائی اختیار کر کے عبادت میں مشغول ہوگئے۔ بہت ہی قناعت سے زندگی بسر کی۔ آپ سلطان قطب الدین کے مدرسہ میں شاگرد، مدرس اور سربراہ رہے۔ یہ مدرسہ صراف کدل کی مسجد اور نالہ مار کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ حضرت امیرؒ اور سلطان قطب الدین

کے مشورہ سے قائم ہوا۔ اس کے پہلے سربراہ حضرت امیرؒ کے رفیق پیر حاجی محمدؒ تھے۔ یہ کشمیر کی پہلی اسلامی درسگاہ تھی تا کہ سرزمین کشمیر میں لوگوں کو اسلامی تعلیم وتربیت حاصل ہو جائے۔ اور قرآن وسنت کی تعلیم عام ہو۔ یہ عالی شان دانش گاہ ۱۸۱۹ء تک قائم تھی۔ اور سکھوں کے دور حکومت میں اس کو بند کیا گیا۔ اس ادارہ کے خاص اساتذہ ملا محسن فانی جو ایک مشہور عالم اور فلاسفر تھے۔ شیخ رحمت اللہ تارہ بلی، ملا طاہر غنی، محمد زماں اور ملا محمد اس ادارہ کے درخشندہ ستارے رہے ہیں۔ سلطان قطب الدین کے فرزند سلطان سکندر نے بھی اس ادارہ کو خوب ترقی دی۔ ملا جوہر نانت نے اس دانش گاہ کیلئے ناقابل فراموش کارہائے نمایاں انجام دے۔ اور اس ادارہ کے سربراہ بھی رہے آپ نے عمر کا بیشتر حصہ اسی ادارہ میں صرف کیا۔ آپ ۱۶۱۶ء میں انتقال کر گئے۔ اور حول میں آخون ملا حسین خبازؒ کے مقبرہ کے مشرق میں کمال سادگی کے ساتھ سپرد خاک ہوئے۔

غنی کشمیری

کشمیر کے فارسی شاعر غنی کا اصلی نام طاہر اور تخلص غنی تھا۔ کشمیر کے ایک معروف خاندان عشائی سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی زندگی کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔ باپ کا نام اور سنہ ولادت معلوم نہیں۔ ملا محسن فانی کے شاگرد تھے۔ آپ پیدائشی شاعر تھے۔ ہندوستان اور ایران میں اس وقت ان کے مقابلے میں کوئی شاعر نہیں تھا زبان کی صفائی، الفاظ کی شیرینی اس کے کلام میں موجود ہیں۔ ایران کا مشہور شاعر صائب آپ کی ملاقات کے لئے کشمیر آیا۔ آپ کی فارسی شاعری اور اس کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور پھر نہ صرف صائب بلکہ اس دور کے دوسرے ایرانی شعرا مثلاً قدسی، سلیم، ابو طالب، کلیم اور میر الٰہی کے ساتھ بھی ملاقات کی ہے اور مشاعروں اور ادبی محفلوں میں حصہ لیا۔ بلکہ بقول مولانا شبلی یہ تینوں شاعر کلیم صائیب اور غنی کشمیر میں کافی مدت تک ہمدم اور ہم قلم رہے۔ خاص طور پر غنی اور ماتب کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔ صائب جو ۱۰۴۱ھ میں کشمیر میں ظفر خان احسن جو گورنر کشمیر تھا کے ساتھ یہاں آیا۔ اور غنی کی شہرت سن چکا تھا۔ اور اس کا یہ شعر سنا۔

موی میان تو شدہ کرالہ پن
کرد جدا کاسۂ سرہا زتن

کرالہ پن کے معنی پوچھنے کے لئے غنی سے ملنے آیا۔ پھر غنی نے اپنا کلام صائب کو دکھایا جس سے یہ بڑا متاثر ہوا غنی نے شادی نہیں کی تھی۔ سرینگر کے محلّہ قطب الدین پورہ میں پیر حاجی محمد کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسہ میں ملا محسن فانی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ یہاں ہی سے آپ نے شعر و شاعری کی ابتدا کی اگرچہ غنی کو محسن فانی کا شاگرد مانا جاتا ہے مگر بعض تذکرہ نویسوں نے غنی کو علم و فضل میں اپنے اُستاد سے برتر مانا ہے۔ خواجہ اعظم دیدہ مری واقعات کشمیر میں لکھتے ہیں کہ نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان میں غنی جیسا خوش خیال اور نازک ترکیب شاعر پیدا نہیں ہوا۔ غنی کو علم و فضل کا ذوق شوق زہد و تقویٰ کی دولت خدا نے عطا کی تھی۔ غنی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے وطن کشمیر میں گذار۔ اور وطن سے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ اور یہ زمانہ آپ نے فاقہ اور تنگدستی میں گذارا۔ وہ ایک تنگ و تاریک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتے تھے۔ جس میں سامان خانہ کی کوئی چیز موجود نہیں تھا۔ کاغذ اور قلمدان کے سوا کچھ بھی نہ تھا غریبی کے باوجود وہ بادشاہوں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ کسی کا احسان اٹھاتے تھے۔ اپنی غریبی اور تنگدستی کے باوجود بلند ہمتی اور خودداری سے زندگی بسر کی۔ وہ عرصہ کے لئے درد اعضا میں مبتلا تھے۔ اس لئے اُٹھنا بیٹھا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ غنی کو معلوم تھا کہ اس کا مرض لاعلاج ہے وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیحی دیتا تھا۔ چنانچہ ۱۰۷۹ھ میں انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان محلّہ سید صاحب راجوری کدل سرینگر میں سپرد خاک ہوئے۔

اس طرح کشمیر کا یہ عظیم الشان فارسی شاعر دنیا سے رخصت ہوگیا۔غنی ہمیشہ خلوت گزیں رہتا تھا اور لوگوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا غنی پرہیز گار، متقی اور احکام شریعت کا پابند تھا۔ دنیا اور آخرت کی سعادت کا طلبگار تھا۔اسے نماز میں اطمینان قلب اور سکون حاصل ہوتا تھا۔وہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فیضیاب تھے۔غنی کا دیوان اس کی وفات کے ایک سال بعد ۱۰۸۰ھ میں اس کے شاگرد مسلم نے غنی کے ایک دوسرے شاگرد ملک شہید کی مدد سے ترتیب دیا غنی برصغیر کے ان شعرا میں سے ہیں جن کی ایران کے بڑے بڑے شاعروں اور نقادوں نے تعریف کی ہے۔

مہجورؔ

پیرزادہ غلام احمد مہجور کے آباد اجداد شمالی کشمیر سے تعلق رکھتے تھے پھر سوپور سے سرینگر آئے۔ سرینگر سے اس خاندان کا ایک شخص غلام محی الدین نو بوگ بڈگام میں سکونت پذیر ہوا۔ جس کے تیسرے فرزند پیر عبداللہ شاہ صاحب کی شادی مترگام پلوامہ کی ایک خاتون سعیدہ بیگم سے ہوئی۔ اس سعیدہ بیگم کے بطن سے غلام احمد بہ روز ویروار ۱۲ شوال ۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بھی پڑھے لکھے تھے والدہ بھی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خوش نویسی میں ممتاز تھی۔ غلام احمد ابھی دو برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والدہ داغ مفارقت دے گئی۔ ذرا بڑا ہونے پر زمانہ کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے گھر پر حاصل کرنے لگے تھوڑے عرصے میں قرآن شریف کا تہائی حصہ حفظ کرلیا۔ اس کے بعد ترال کے ایک عالم عاشق ترالی کے مکتب میں تعلیم پانے لگے اور فارسی کی کئی کتابیں پڑھ لیں۔ آخون صاحب کشمیری زبان کے ایک اچھے شاعر گذرے ہیں۔ شعر و شاعری کی طرف مہجورؔ کی طبیعت مائل کرنے میں اس استاد کا کافی حصہ ہے۔ تین برس اس مکتب میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو فارسی زبان میں بھی مہارت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد غلام احمد کو اُردو کی تعلیم دیوانے کے لئے

سرینگر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں وہ اُردو کے ساتھ
ساتھ دینیات اور تفسیر قرآن شریف کا درس پانے لگے۔ ان ہی دنوں پنجاب
سے سید غلام محی الدین کشمیر آئے جن کا مہجورؔ کے خاندان سے قدیمی تعلق تھا۔
ان کو مہجورؔ کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا ہوئے اور انہوں نے مہجور کو پنجاب
آنے کی دعوت دی۔ حصول تعلیم کے شوق نے مہجور کو بے تاب کر دیا اور وہ
امرتسر چلے گئے۔ وہاں مروجہ تعلیم پانے میں مشکلات پیدا ہوئے تو پرائیویٹ
طور پر علم حاصل کرنے کے ساتھ ایک مشہور خوش نویس غلام علی سے یہ فن
سیکھا۔ اسی دوران ان کی ملاقات مولوی عبداللہ صاحب بسملؔ سے ہوئی۔ جو
اُردو اور فارسی کے مشہور ناظم و ناشر تھے ان کی کوششوں سے قادیان۔ کے ایک
اخبار سے بحیثیت کاتب وابستہ ہوئے۔ یہاں بھی مطالعہ کا خوب موقع ملا۔
ان ہی دنوں منشی محمد دین فوق نے لاہور سے ایک ماہوار رسالہ ''کشمیری
میگزین'' جاری کیا۔ غلام احمد یہ میگزین دیکھتے ہی فوق صاحب سے ملنے
لاہور چلے گئے اور وہاں قیام کیا۔ ۱۹۰۸ء میں غلام احمد کشمیر آئے اور روزگار
کی تلاش میں لگ گئے۔ ان کے والد انہیں اپنے موروثی پیشہ پیری مُریدی کا
پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ لیکن اس پیشہ سے مہجورؔ کی
طبیعت مائل نہ ہوسکی۔ انہوں نے ذاتی محنت و مشقت سے گذر اوقات
کرنے کی ٹھان لی۔ اس مسئلے پر ایک مشہور قلندر عبدالرحیم صفاپوری نے آپ
کو حوصلہ دیا۔ اس زمانے میں بلتستان کے افسر بندوبست مشہور شاعر چودھری
خوشی محمد ناظم لداخ سے سرینگر آئے۔ انہوں نے لداخ میں شجرہ کش

(ملازم) اسامیاں پُر کرنے کا اشتہار دیا اور مہجور نے بھی درخواست دے دی اور شجرہ کش (پٹواری) کی حیثیت سے تقرری کا حکم ملا۔ تنخواہ معمولی تھی لیکن مہجور خوشی خوشی لداخ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں بندوبست کا کام اچھی طرح سیکھا۔ دو برس پورے نہ ہوئے تھے۔ کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مہجور رخصت پر کشمیر آئے۔ اب گھر کی تمام ذمہ داریاں آپ پر پڑیں اس لئے ڈیوٹی پر نہ جا سکے۔ رخصت بڑھاتے رہے لیکن آخر محکمہ نے نوکری سے نکال دیا۔ آبائی پیشہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مالی مشکلات کا شکار ہونا پڑا لگے۔ کافی جدوجہد کے بعد محکمہ مال میں پھر ملازم ہو گئے اور سرینگر کے محلّہ ٹنکی پورہ میں ایک چھوٹا سا مکان بنا کر اس میں رہنے لگے۔ پٹواری کی حیثیت سے مہجور کو کشمیر کے مختلف مقامات پر رہنے کا اتفاق ہوا اور کاشتکاروں، کسانوں اور عام لوگوں کی زندگی اور طریقہ کے مشاہدہ کا خوب موقع ملا۔ بارہمولہ، ہندوارہ، اسلام آباد، بیروہ، بڈگام غرض کہ مختلف جگہوں کے قدرتی حسن لوگوں کے رہن سہن اور زندگی گذارنے کا مشاہدے کا خوب موقع ملا۔ ۱۹۴۵ء میں مہجور پٹواری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور معمولی پنشن ملنے لگی۔ پنشن پانے کے بعد آپ اپنے آبائی گاؤں متری گام تشریف لے گئے جو شہر کے ہنگاموں سے دور تھا کبھی کبھار سرینگر آتے تھے سات آٹھ سال تک گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی۔ آخر ۱۸ اپریل ۱۹۵۲ء کو موت نے آپ کو اپنی آغوش میں لیا۔ گاؤں والوں نے آپ کو اپنے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کیا۔ یہ خبر سرینگر دیر سے پہنچی۔ اس وقت نائب وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام

محمد متری گام گئے مشکل سے اس بات پر لوگوں کو آمادہ کیا کہ ان کے جسد خاکی کو یہاں سے نکال پر سرینگر لے جایا جائے جہاں سرکاری اعزاز کے ساتھ میت کی ازسرنو جنازہ پڑھ کر حبہ خاتون کے مزار (اتھواجن) سرینگر میں سپرد خاک کیا جائے اور اس کا نام مزار شعراء رکھا جائے۔ ۱۱راپریل صبح کو جنازہ خانقاہ معلیٰ کے صحن میں رکھا گیا ہزاروں لوگوں نے اپنے محبوب شاعر کا آخری دیدار کیا۔ جنازہ ادا کرنے کے بعد جنازہ کو جلوس کی صورت میں امیرا کدل پہنچایا گیا وہاں سے جنازہ پھولوں سے آراستہ ایک گاڑی میں اتھواجن پہنچایا گیا۔ جہاں بخشی غلام محمد نے اپنے ہاتھوں سے میت کو سپرد خاک کیا۔ اور ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ اس طرح یہ کشمیر کا مقبول شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا۔ مہجور کو حسن اتفاق سے بچپن سے ہی علم و فضل کا ماحول ملا۔ ترال کے عاشق ترالی کی صحبت اور اس کے بعد امرتسر میں بسمل امرتسری، مولانا شبلی، منشی محمد الدین فوق اور دوسرے شعراء کی ہم نشینی نے ان کی شاعرانہ طبیعت کو مزید تقویت دی۔ سات برس تک فارسی میں آپ نے شعر گوئی کی۔ نمونہ کے طور پر کچھ اشعار ہیں۔

یار گل دِہ بُلبل دیوانہ را
لذت سوزش دل پروانہ را
گرچہ مہجورم ز مہجوری
بلبلے از بوستان شاہدم

ان اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہجور کو فارسی زبان میں شعر

کہنے پر کس درجہ قدرت تھی امرتسر میں مولانا شبلی سے ملاقات ہونے پر جب انہوں نے مہجور تخلص اختیار کرنے کی وجہ پوچھی تو مہجور نے عرض کی اپنے وطن سے دور ہوں۔ جب انہوں نے پوچھا وطن لوٹ کر کیا بدل دو گے جواب دیا نہیں وہاں آپ سے دور رہوں گا۔ فارسی کے بعد اب ان کی طبیعت اُردو میں شعر کہنے پر مائل ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ اب فارسی کا رواج برصغیر میں کم ہوتا جارہا تھا۔ اُردو غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھپ کے
دل مضطر ہی میں دلبر کا قیام اچھا ہے

اُردو زبان میں شعر کہنے کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ بقول عبدالاحد آزاد ۱۹۲۰ء تک اس کے بعد وہ کشمیری میں شعر کہنے پر مائل ہوئے۔ اس تبدیلی کی وجہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ پٹواری کی حیثیت سے دیہاتی عوام کے ساتھ آپ کو واسطہ پڑتا تھا۔ جو ان کی شاعری سمجھ نہ سکتے تھے۔ اس لئے شاعر کی حیثیت سے ان کے دلوں میں مہجور کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی لیکن مہجور خود کہتے ہیں کہ میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنی مادری زبان کو بے بسی کی حالت میں پایا۔ میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی میں اپنی مادری زبان کو ترک کر کے دوسری زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ عہد ماضی کے تاریخی واقعات نے میری آنکھیں کھول دیں۔ کشمیری زبان نے صدیوں پہلے بڑے بڑے اہل کمال پیدا کئے۔ مگر آج نہ صرف اس زبان سے غیروں کو بلکہ خود اہل کشمیر کو نفرت ہے۔ اس کے بعد میں نے عہد کیا کہ

اب میں اپنی مادری زبان کی خدمت کروں گا۔ اور پھر اسے دوبارہ زندہ جاوید بنا کر چھوڑوں گا۔ میں نے رفتہ رفتہ عوامی شاعر رسول میر اور حبہ خاتون کی طرز پر غزلیں کہنی شروع کیں۔ ۱۹۲۶ء تک مہجور نے صرف دو تین غزلیں کشمیری زبان میں کہی تھیں۔ مہجور نے کشمیری شاعری میں غزل، گیت، تصوف، عشق محبت، منظر کشی، حب وطن، سیاست وغیرہ مضامین بیان کئے۔ پروفیسر دیویندر ۱۹۲۷ء میں اور بلراج ساہنی ۱۹۳۴ء میں سرینگر تشریف لائے۔ آپ کے کلام سے اس قدر متاثر ہوئے انہوں نے آپ کے کلام کو انگریزی میں ترجمہ کیا اور برصغیر کے لوگ آپ کے کلام سے متعارف ہو گئے۔ ۱۹۳۴ء میں سرینگر کی نمائش گاہ میں ایک ملا جلا مشاعرہ ہوا۔ جس میں مہجور کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن وہ اس شرط پر شریک ہوئے کہ انہیں کشمیری نظم پڑھنے کی اجازت دی جائیگی۔ یہ مشاعرہ چودھری خوشی محمد ناظر کی زیر صدارت ہوا اور مہجور نے ''باغ نشاط کے گلو نازکران کران ولو'' یہ پہلا موقع تھا کہ کشمیری نظم نے مشاعرہ میں جگہ پائی۔ دوسرے روز یہ نظم بچے بچے کی زبان پر تھی۔ مقامی اخبارات نے اس کی مقبولیت کی داد دی اس سے کشمیری اور غیر کشمیری فنکاروں نے سنیما ہالوں میں گایا۔ ۱۹۳۶ء میں مہجور نے ابتدا میں اپنے پیشرو کشمیری شاعرہ جیسے حبہ خاتون، محمود گامی، رسول میر، ارن مال وغیرہ کے طریقہ پر کشمیری زبان میں شعر کہنے لگے۔ مہجور کا زیادہ کلام عشق محبت پر ہے۔ مہجور کے دل میں کشمیر کے چپے چپے سے محبت ہونے کا ثبوت ان کی مشہور نظم ترانہ وطن ہے۔ اس نظم میں انہوں نے کشمیر کے

مختلف مقامات کی منظر کشی کی ہے۔ مہجور پہلے کشمیری شاعر ہیں جو کشمیری لوگوں کی بدنصیبی پر نہ صرف روئے بلکہ انہیں ایک خوش آئند مستقبل کی بشارت دیتے رہے اور انہیں ہمت اور حوصلہ دیتے رہے۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ اپنی تقریر کے آغاز میں مہجور کی ایک نظم سریلی آواز میں پڑھا کرتے تھے۔

ولو ہا باغوانو نو بہارک شان پیدا کر
پھولن گل گتھ کرن بُلبل ژھِتھی سامان پیدا کر

مہجور کی آخری دور کی نظمیں زیادہ تر سیاسی نوعیت کی ہیں شخصی حکومت کے بعد وہ صرف دو چار سال زندہ رہے۔ اس دوران مہجور کے دل کو کئی بار ٹھیس لگی۔ مہجور کو کشمیر، اس کی زندگی، اس کے کلچر اس کی روایات اس کے تقدس اور اس کی خوشبو سے پیار تھا۔ صدیوں کی غلامی نے اس سرزمین کے چپہ چپہ میں غم اور ملال کا جوزہر گھول دیا تھا۔ اس سے مہجور کافی دکھی تھا۔

☆☆☆

عبدالقدوس گوجواری

کشمیر میں افغانوں کی حکومت ۱۷۵۳ء سے لیکر ۱۸۱۹ء تک قائم تھی۔
۱۸۱۳ء سے ۱۸۱۹ء تک کشمیر میں سردار محمد عظیم بحیثیت گورنر تعینات تھا۔ ان
افغان حکمرانوں نے نہ صرف ٹیکسوں کی بھرمار کے ذریعہ کشمیری، کسانوں،
شالبافوں کو مفلوک الحال بنا دیا۔ بلکہ ان پر سرکاری ملازموں کی ایک بڑی
فوج بھی مسلط کر رکھی تھی۔ جو ہر گھڑی اور ہر پل عام رعایا پر نظر رکھتی تھی۔
افغان حکمران غریب لوگوں کا خون چوس کر عیش آرام کی زندگی بسر کرتے
تھے۔ ایک وہ وقت تھا کشمیر کو دودھ اور میوؤں کی سرزمین سے جانا جاتا تھا۔
عظیم خان کے دور حکومت میں ہر سال شالی کی فصل کچی رہ کر قحط پڑتا تھا۔
پانچ چھ سال تک قحط کی سختی تھی۔ بے شمار غریب، مسکین لوگ تباہ و برباد ہوگئے
اور روٹی کی خاطر ہزاروں جانیں ضائع ہوگئیں۔ عظیم خان کے عہد حکومت
کے آخری دنوں میں پنڈت بیربل در مالیہ اکٹھا کرنے کیلئے ایک اعلیٰ آفیسر
تھے۔ آپ نے سست رفتاری سے مالیہ جمع کیا۔ کیونکہ فصل بھی اچھی طرح تیار
نہیں ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے خام فصل کے باعث ایک لاکھ روپے کا مالیہ
پنڈت بیربل دھر کے ذمہ باقی رہ گیا۔ اس پر عظیم خان نے حکم دیا کہ باقی رقم
جلد از جلد سرکاری خزانہ میں بھر دی جائے۔ سردار نے اس بات کا خیال نہ

کرتے ہوئے پنڈت موصوف سے بقیہ وصولی میں نہایت سختی کی۔اس پر بیر
بل دھر نے برسر دربار کہہ دیا کہ خام فصل کے لئے تیرا خدا ذمہ دار ہے عظیم
خان نے پنڈت پراور سختی کی۔ بیر بل در نے سوچا کہ باقی رقم میں ادا کروں یا
نہ کروں لیکن گورنر مجھ سے ضرور انتقام لے گا۔ کیونکہ اس کو مجھ سے نفرت ہے
اور مجھ سے سختی سے پیش آئیگا۔ اسی اثناء میں اس نے اپنے دوستوں اور
مشیروں سے مشورہ کیا اور یہ عہد کر لیا کہ کس طرح افغان حکومت کو کشمیر سے
باہر نکالے۔ سردار عظیم خان رنجیت سنگھ سے ساز باز رکھنے کے باعث پنڈت
بیر بل در سے پہلے ہی ناراض تو تھا ہی اس نے موقع ملتے ہی ایک سوسپاہی
اس کے گھر بھیج دئے تا کہ وہ بھاگ نہ جائے دو تین روز کے بعد سردار عظیم
خان نے مرزا پنڈت جو کہ بیر بل در کا چچازاد بھائی تھا اور حکومت میں ایک
اعلیٰ عہدے پر فائز تھا کے سامنے بیر بل کے بھاگنے کا خدشہ ظاہر کیا۔جس
پر مرزا پنڈت نے اسے نہایت سختی کے ساتھ اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ بیر
بل در کبھی نہیں بھاگے گا اور اس کے لئے میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔اس
کے بعد مرزا پنڈت اپنے چچازاد بھائی بیر بل کے پاس آیا اور کہا کہ سردار کے
پاس میں نے تیری ضمانت دے دی ہے اگر بھاگنے کا ارادہ ہے تو ابھی بھاگ
جاؤ نہیں تو کل کو پھر موقعہ نہ ملے گا۔اس کے بعد بیر بل دھر سفر کے لئے تیار
ہو گیا لیکن اس کی بیوی جو منشی بھوانی داس کی بیٹی تھی خاندانی روایات کے پیش
نظر اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوئی بیر بل دھر اپنے بیٹے راج کاک دھر کو
ساتھ لیکر پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔تا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دعوت دیں کہ

وہ کشمیر پر حملہ کرے اور افغانوں کے ظلم وستم سے ان کو نجات دلائیں واسہ
کاک ہرکارہ کی معرفت اپنی بیوی اور بہو کو ایک مسلمان قدوس گوجواری کے
گھر میں چھپا دیا اور خود بلا زین کے گھوڑوں پر سوار ہو کر دیوہ سر پہنچ گیئے۔
اپنے ساتھ کا متگار اور ذوالفقار کی مدد سے بانہال درہ پار کیا اور جموں پہنچ
گیئے۔اس وقت جموں کا راجہ گلاب سنگھ تھا اس نے پنڈت بیر بل کی قدر دانی
کرتے ہوئے اس کی سفارش راجہ دھیان سنگھ سے کر دی۔ جو کہ گلاب سنگھ کا
بھائی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خاص آدمی تھا۔ عظیم خان کو جب بیر بل در کے
بھاگنے کا پتہ چلا تو اس کے تعاقب میں سپاہی روانہ کیئے اور اس کے ساتھ ہی
گھوڑوں کے مالکوں کے گھر غارت کروا کر آگ لگا دی۔ اس کے بعد سردار
نے بیر بل دھر کے متعلق مرزا پنڈت سے پوچھا مرزا پنڈت نے جواب دیا
اگر اس سے دنیا سے نفرت ہوگئی تو میرے خیال میں گنگا گیا ہوگا نہیں تو
رنجیت سنگھ سے فوجیں لے کر یہاں آتا ہوگا۔ یہ سن کر عظیم خان نے اس کی
حاضر جوابی سے خوش ہو کر مرزا پنڈت کو کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد عظیم خان نے
واسہ کاک ہرکارہ کو اس بات کے لئے کہ وہ اسے بیر بل دھر کی بیوی اور بہو کا
پتہِ دے بڑا ڈرایا، دھمکایا اور بلا آخر اس سے نو دن تک نو ہزار روپے جرمانہ
لیکر چھوڑ دیا۔ اسی دوران بیر بل دھر کے داماد منشی تلوک چند نے اپنی بیوی
سے بیر بل در کی بیوی اور بہو کا سراغ نکال کر سردار کو خبر کر دی۔ عظیم خان کے
سپاہی اس وقت قدوس گوجواری کے گھر گیئے۔ آپ نے ان دو عورتوں کی
اچھی طرح حفاظت کی تھی پہلے قدوس نے انکار کیا لیکن افغان فوجیوں نے

اس کے گھر کا محاصرہ کیا اور گھر کا ہر کونہ چھانٹ مارا اور ان عورتوں کو آخر کار گرفتار کیا لیکن قدوس گوجواری نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ان عورتوں کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود آخر عظیم خان کے سپاہیوں نے اس پر اور اس کے گھر والوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کی اور یہ سب موت کے آغوش میں چلے گئے۔ یہ تھی ایک عظیم قربانی جو کہ قدوس گوجواری نے ان کشمیری پنڈت عورتوں کے لئے دیں۔ اس پر کشمیر کے ایک مشہور شاعر مہجور نے اس بھائی چارہ کے متعلق یہ شعر کہے ہیں۔

کر بٹن پٹھ زو فدا قدوس گوجوری

از تمیہ کتھ یاد پاوؤ پانہ وین

ایک کشمیری پنڈت کے لئے ہی قدوس گوجواری نے جان دی، اے ہندو اور مسلمان آج وہی واقعات یاد کرو آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہو۔

افغان گورنر کے حکم کے مطابق بیربل دھر کی بیوی کدہ مال اور اس کی بہو کو گرفتار کر کے کشتی میں بیٹھ کر شیر گڈھی لے جایا گیا۔ جہاں پر گورنر عظیم خان کا محل تھا کدہ مال ایک تجربہ کار اور سیاسی سوجھ بوجھ والی عورت تھی اس کو آنے والے حالات کا بخوبی علم تھا۔ اس کو یا قید میں رکھا جاتا۔ یا ذلت کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ اگر اس کو زندگی بخشی جاتی۔ اس نے اس زندگی سے موت کو ترجیح دی۔ چنانچہ اُس نے کشتی پر بیٹھ کر اپنی انگوٹھی سے قیمتی پتھر الماس کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا اس الماس زہر نے اس کے جسم پر

آہستہ آہستہ اثر کیا۔ جب اس کو گورنر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے گورنر کے سوالات کا جواب جرأت مندانہ طریقہ سے دیا۔ اس نے کشمیر اور کشمیر یوں کا سرا ونچا رکھا اور گورنر کو وارننگ دی کہ تمہاری حکومت جلد ختم ہونے والی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمہارا ظلم وستم یہ سن کر عظیم خان حیرت میں پڑ گیا کشمیری عورت کے جرأت مندانہ اور بے باک کلام پر اس کے بعد وہ زمین پر گر پڑی اور موت نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی بہو کو قید کر کے کابل روانہ کیا گیا جہاں اس کو غلامانہ زندگی بسر کرنی پڑی۔ اس کے بعد کدہ مال کی پیشینگوئی سچ ثابت ہوئی۔ عظیم خان پٹھانوں کا آخری گورنر تھا اور ان کی حکومت بھی ۱۸۱۹ء میں ختم ہوگئی۔

کلہن پنڈت

راج ترنگنی کشمیر کی پچھلی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ ہے جس میں کشمیر کے سیاسی ، سماجی ، اقتصادی اور معاشی حالات درج ہیں یہ برصغیر میں پہلی تاریخی کتاب ہے۔ کشمیر کے جن سپوتوں نے وطن کی آن بان اور شان کو چار چاند لگائے ہیں ان میں کلہن کا ایک خاص مقام ہے کیونکہ کلہن نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ایشاء بھر میں تاریخی موضوعات پر شاعری کی ایک نئی راہ نکالی ۔ ہندوستانی ادب کو کشمیر کی انمول دین میں کلہن کی راج ترنگنی بالکل نرالی اور لاثانی ہے اس سے پہلے کسی بھی زبان میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ جس میں شاعری بھی ہو اور تاریخ بھی۔ اس سے پہلے بھی ساتویں صدی عیسوی میں بان بھٹ نے مہاراجہ ہرش کی سوانح حیات لکھی تھی ۔لیکن راج ترنگنی کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس سے پہلے بھی ویاس نے مہابھارت کے رزم نامے میں کسی حد تک ایسا کیا اور بعد میں فردوسی نے بھی شاہنامہ میں اسی طرح کا تجربہ کیا۔ مہابھارت کے عہد سے لیکر اپنے عہد تک جس وقت کشمیر میں مہاراجہ ہرش حکومت کرتا تھا ۔ ۱۱۵۰-۱۱۴۸ء تک پانچ ہزار سال کے تواریخ کے کئی اتار چڑاؤ راج ترنگنی کی آٹھ حصوں میں موجزن کردیئے۔ چنانچہ دنیا کے شعری ادب میں اس صنف کے شاہناز بہت کم

ملتے ہیں۔

کلہن کی دیانتداری دیکھئے کہ کھلے بندوں اپنے پیش رو کے تئیں احسان مندی کا اعتراف کرتا ہے آپ نے درباری شاعروں سے ہٹ کر ایک بالکل نیا ادبی تجربہ کرنے کی ٹھان لی۔ اپنے اندر کے شاعر اور مورخ دونوں کو ہم آہنگ کرنا کلہن کا ایک نہایت غیر معمولی کارنامہ ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنی شعر گوئی اور تاریخ نویسی کے سلسلے میں کیا ہے۔ ان میں سے ایک نظریہ ہے کہ حسین تخلیق کرنے والا شاعر ہی وہ ہے جو بیتے ہوئے زمانے کو ہمارے آنکھوں کے سامنے ہو بہو لے آتا ہے کلہن کو غیر جانبدارانہ انکشاف کرنے کی صلاحیت تھی آپ نے درباری ماحول سے بچ کر اپنے پیش رؤں کے قلم بند حالات کو بڑی بے باکی سے پرکھا اور پرکھ کر معیاری بنانے کے لئے آثار قدیمہ کی طرف بھی رجوع کیا۔ قدیم یادگاروں کتبوں، سکوں، فرمانوں اور اس طرح کی دیگر دستاویزوں کا اس نے بغور مطالعہ کیا اور کھوج کے دوران نامساعد صورت حال کے باوجود وطن کے طول و عرض کی خاک چھانی راج ترنگنی میں آئے ہوئے وہاروں، سٹوپوں، آشرموں، مٹھوں، مندروں، مورتیوں، مقدس مقامات، تیرتھوں کے ذکر سے اس بات کی تصدیق بخوبی ہوتی ہے۔ کہ اس طرح کھوج کے بغیر مقامی شناسی (Topography) اور Chronology پر کلہن کی پکڑ اتنی مضبوط نہیں ہو سکتی تھی۔ سماجی اور سیاسی حالات دیکھنے میں اسے بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ہم اس دور پر نظر ڈالتے ہیں۔ جس میں کلہن پیدا ہوا

اور پروان چڑھا تھا تو اس نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ نہایت پر آشوب دور کی پیداوار تھی اننت دیو (۱۰۲۸-۱۰۶۳ء) کلش (۱۰۶۳-۱۰۸۹ء) اور ہرش (۱۰۹۸-۱۱۰۱ء) کی انتہا پسندانہ من مانیوں سے معاشی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ستل اور اچل کی خون ریز خانہ جنگی نے سیاسی اور سماجی فضا کو اور بھی آلودہ کر رکھا تھا۔ کلہن کا جنم گیارویں صدی کے آخری برسوں میں پرہاس پور (موجودہ پرس پور) کے ایک ایسے برہمن گھرانے میں ہوا جن کا پیشہ سپاہ گری تھا کلہن کا باپ کاشمرک مہاراجہ ہرش کی حکومت میں سرحدی علاقہ کا ایک افسر تھا۔ کلہن کے گھر اور گھر کے آس پاس یوں تو ان دنوں شیومت کا بول بالا تھا۔ لیکن پرہاس پور میں للتادیتہؐ نے شیو اور بودھ متوں کے ساتھ ساتھ اتحاد و اتفاق قائم کیا تھا اس کی خوشگوار یاد ابھی تک تازہ تھی لہٰذا بودھ مت کا احترام بھی بھرپور تھا۔ کلہن نے اپنے ابتدائی شعروں میں شیو اور شکتی کو خراج عقیدت ادا کرنے کے باوجود جگہ جگہ بدھ کا نام بڑی عزت سے لیا ہے۔ مہاتما بدھ کی انسان دوستی کو وہ دل کی گہرائی سے سراہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بودھ دھرم نے جس ہمدردی اور انسان دوستی پر زور دیا۔ کلہن کی سیرت پر اس کا گہرا اثر ملتا ہے۔ زمانے کے دستور اور رواج کے مطابق کلہن نے جیسی بھی تعلیم حاصل کی ہو عملی طور پر اس نے جو تعلیم حاصل کی وہ گہری بھی تھی ہمہ گیر بھی سنسکرت زبان و ادب میں ہی نہیں علوم فنون میں بھی اس کا مطالعہ وسیع ہونے کے ساتھ گہرا بھی تھا۔ مذہبی کتابوں اور شاستروں کے علاوہ اس نے نہ صرف والمیکی، کالیداس اور بھان بٹ کی

تصانیف پڑی تھی بلکہ صرف نحو، نجوم جنیات، معاشیات جیسے مضامین پر بھی
اسے عبور حاصل تھا۔ مصوری، ناٹک، سنگیت کا بھی وہ دلدادہ تھا۔ اپنے پیش
روؤں کی لکھی ہوئی تواریخوں کی پرکھ کے لئے اس نے آثار قدیمہ کا مشاہدہ
کیا اپنے والد کے علاوہ اس کے ساتھیوں اور دیگر ہم عصروں سے بھی ان
کے چشم دید حالات سنے۔ مہاراجہ ہرش اور اس کے بعد کے حالات پڑھتے
وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم کسی سے چشم دید حالات سن رہے ہیں۔ جیسے کوئی
رواں تبصرہ کئے جا رہا ہے۔ کلہن کا جیسا تحقیق تجسس تو آج بھی کسی تواریخ
نویس کے لئے باعث فخر ہوسکتا ہے۔ وہ صرف سچ کے سامنے ہی سر جھکاتا
ہے اثر رسوخ کے تحت جھوٹ فریب لالچ اور دکھاوے سے مرعوب نہیں
ہوجاتا۔ تب ہی تو اس کا انداز بیان اتنا بے باک اور بے راگ ہے غرض کہ
ایک آدرش مورخ میں جو خوبیاں ہونی چاہیں۔ ان میں سے بہت ساری
خوبیاں کلہن میں موجود ہیں۔ آٹھویں صدی سے بارہویں صدی تک کے
واقعات اس نے پوری چھان بین کے بعد ہی درج کئے ہیں۔ کلہن کی
تحریروں میں بھی اس کے ہمدرد دل کی خلوص بھری دھڑکن ضرور سنائی دیتی
ہے۔ راج ترنگنی میں جن کرداروں کے حالات ملتے ہیں ان میں ڈوم سے
لیکر ڈامر تک، گاؤں کے پٹواری سے لیکر حاکم اعلیٰ تک رعایا سے لیکر راجہ تک،
بچے، بوڑھے، مرد، عورت بھی شامل ہیں۔ کہیں للتادیتہؔ کا جمال ٹپکتا ہے۔
کہیں راجہ اونتی ورمن کی پرخلوص رعیت پروری جھلک اُٹھتی ہے کہیں پر ڈامر
کی سرکشی ہے۔ اِدھر ایک ہی باپ کے بیٹے اچل اور سسل ایک دوسرے

کے خون کے پیاسے بن کر تخت پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ اِدھر رانی دیدا ہے کہ اپنے مالک کو نظر انداز کر کے ایک گڈریئے تنگا پر جی جان سے فدا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی کلہن نے کشمیر کی تہذیبی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا بھی بغور مشاہدہ کیا ہے۔ کلہن نے شعر و شاعری اور فلسفہ کے علاوہ عمارت گری، مجسمہ سازی، سنگ تراشی، مصوری، موسیقی رقص وغیرہ کی طرف معنی خیز اشارے کئے ہیں۔ علم دوستی، فتوحات، مہم سازی، پڑوسیوں سے سماجی، سیاسی کاروباری لین دین اور تمدنی تعلقات دشمن سے ٹکراؤ دوست سے تال میل وغیرہ موضوعات پر بھی کلہن نے قلم اُٹھایا ہے سماج دشمن عناصر کو ٹوکے بغیر بھی نہیں رہتا۔ آپ نے اپنی برہمن برادری کو بھی ہٹ دھرمی اور ناعاقبت اندیشی کے لئے آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ کلہن نے وزیروں اور حکمرانوں کو بھی عام لوگوں پر ظلم ڈھانے کے لئے بہت بُرا بھلا کہا ہے۔ للتادیتہ کے سیاسی وصیت نامہ کو قلم بند کر کے اس نے لوگوں کی خوشحالی کے لئے اس دستاویز کی جوازیت کو بہت حد تک تسلیم بھی کر لیا ہے کچھ بھی ہو اپنی تمام تر خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود کلہن کی راج ترنگنی ایک غیر معمولی تصنیف ہے۔ اس طرح کی کوئی چیز نہ تو اس سے پہلے لکھی جا چکی تھی نہ اس کے بعد لکھی گئی ہے۔ کلہن نرالا ہے اور کلہن کی راج ترنگنی انمول ہے۔

عبدالاحد زرگر

کشمیری شاعری کی تاریخ میں عبدالاحد زرگر کا ایک اہم دور رہا ہے۔
کشمیری صوفیانہ شاعری کو جس طریقہ سے احد زرگر نے ہمکنار کردیا وہ ایک
الگ اور باغیانہ طبیعت کا ہی نتیجہ ہے۔ احد زرگر کی شاعری روایات کی حد
میں ہی روایات کی بغاوت ہے۔ احد زرگر اگرچہ بیسویں صدی کے قدآور
کشمیری شاعروں میں اپنا ایک الگ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ احد زرگر کو
ہندوؤں کی مقدس کتاب شاستروں پر بھی مکمل دسترس تھی۔ احد زرگر کی
شاعری میں عشق بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ احد زرگر کی شاعری میں مختلف
رنگوں کو جس مناسبت سے صوفیانہ خیالات کو بیان کرنے کے لئے برتا گیا ہے
وہ بذات خود اپنی ایک مثال ہے۔ عبدالاحد زرگر ۲۱ نومبر ۱۹۸۳ء بروز سوموار
اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق اختلاف پایا
جاتا ہے تاہم ان کے مختلف بیانات کی روشنی میں ہم یہی اخذ کرسکتے ہیں کہ وہ
۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء کے درمیانی سالوں میں پیدا ہوئے۔ احد زرگر کے والد کا
نام غلام محی الدین زرگر تھا جو پشمینہ کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں
وفات پائی۔ ابتدائی تعلیم زرگر صاحب نے کادی کدل سرینگر کے غلام حسن
شاہ سے حاصل کی اور باقاعدہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ قریباً ۲۰ سال کی عمر

سے شاعری کی ابتدا کی۔ ۳۵ سال کی عمر میں ان کی شادی فتح پور گاندربل کے محمد اسماعیل گنائی کی دختر سے ہوئی بدقسمتی سے ۵ سال کے بعد ان کی بیوی وفات پا گئی۔ اس کے بعد آپ نے اسلام آباد کے پیر غلام رسول کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ آپ سماع کے شوقین تھے اور تقریباً ہر جمعرات کو ان کے گھر پر محفل سماع لگتی تھی۔ قادری اور کبروی سلسلے میں بیعت حاصل تھی۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں کاؤ ڈارہ سرینگر کے عبدالکبیر لون سے روحانی تربیت حاصل کی۔ عبدالکبیر لون کو ادب وشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ اس نے عبدالاحد زرگر کی اس میدان میں بھی رہبری کی۔ ۲۹ سال کی عمر میں میر واعظ احمد اللہ صاحب کے مرید ہوگئے۔ ترال کے ثناء اللہ بٹ، چرارشریف کے عبدالعزیز یتو، سرینگر کے غلام محمد گنائی اور وازہ پورہ سرینگر کے غلام رسول بٹ سے بھی روحانی فیض حاصل کیا۔ اس طرح احد زرگر سلوک کے مختلف منازل طے کرتے رہے اور انہی تجربات کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے ان کی شاعری ایک خاص فلسفے کی پیداوار ہے احد زرگر کا کلام سولہ سو صفحات پر مشتمل مختلف اُٹھارہ کتابچوں میں شائع ہوا ہے۔ احد زرگر کا زیادہ تر کلام غزل کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کی بہت سی غزلوں کا لب ولہجہ لوگ گیتوں خصوصاً روف طرز سے ملتا ہے اور یہ بھی ان کی عوامی مقبولیت کا ایک سبب ہوسکتا ہے۔ احد زرگر کا کچھ کلام نعت اور منقبت میں ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک مثنوی گل صنوبر بھی کشمیری میں کہی ہے۔ ''اکہ نندن'' قصے کو بھی شعری روپ بخشا ہے۔ حالانکہ یہ قصہ احد زرگر

سے پہلے بھی چند کشمیری تخلیق کاروں نے بیان کیا ہے۔ احد زرگر کی شاعری کو اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ کشمیری شاعری کی روایات سے واقف تھے اور ان کی شاعری کو کشمیری صوفیانہ شاعری کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی حاصل ہے۔ ان کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں مختلف عربی خصوصاً قرآن شریف سے ماخوذ الفاظ کی تراکیب استعمال کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاستروں کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں اس لئے ان کی شاستروں پر بھی کامل دسترس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام میں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ راہ حق کی تلاش ان کی شاعری کا وہ زیر و بم ہے جو ہر رنگ اور ہر صورت میں پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ عشق کی سربلندیوں کا والہانہ اور بے باکانہ اظہار احد زرگر کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے لیکن یہاں پر یہ بات دہرانا چاہتے ہیں کہ احد زرگر اگر چہ اپنی شاعری کے آئینے میں فطری فنکار نظر آتے ہیں تاہم ان کے ہاں فن مقصود نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اسے محض آرائش تصور کرتے ہوں یا اسے بالکل ثانوی اہمیت دیتے ہوں۔

اَرنِ مال

کشمیر میں افغان حکومت ۱۷۵۳ء سے لیکر ۱۸۱۹ء تک قائم تھی کشمیر کا یہ ایک تاریکی دور تھا 1788ء سے 1792 تک کشمیر میں افغان گورنر جمعہ خان تھا اگرچہ باقی افغان گورنروں کی طرح وہ بھی کشمیریوں پر ظلم کرتا تھا لیکن وہ شاعروں اور عالموں کا قدر دان تھا۔ آپ کے وقت میں ایک کشمیری پنڈت عالم بھوانی داس کا چرو تھا۔ آپ فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے اور آپ کا قلمی نام ''نکا'' تھا۔ فارسی شاعری میں آپ اتنے قابل تھے کہ افغان اُمرا اور سرکاری اہلکار حیران ہوتے تھے کہ ایک کشمیری کو اس زبان میں اتنی مہارت اور قابلیت کیسے ہے جب کبھی کشمیر میں افغان یا ایرانی حاکم آتے تو ان کے اعزاز میں آپ کو مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بُلایا جاتا۔ آپ اِن ادبی محفلوں میں شرکت کرتے اور اپنا کلام پیش کرتے جس سے وہ امرا بڑے متاثر ہوتے۔ منشی بھوانی داس نے فارسی میں ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا جس کو خطِ بحر تاویل کا نام دیا گیا۔ آپ کی خداداد قابلیت دیکھ کر پٹھان اُمرا آپ کی عزت کرتے تھے اَرِن مال منشی صاحب کی بیوی تھی۔ ان کی شادی بچپن میں ہوئی تھی لیکن بد قسمتی سے بھوانی داس نے نامعلوم وجوہات کی بناء پر ارن مال کو چھوڑ دیا ارن مال اپنے خاوند کی جدائی برداشت نہ کر پائی۔

ہمیشہ غمزدہ اور پریشان رہتی ۔اس دُکھ سے آپ شاعری کی طرف مائل ہوکر درد ناک شعر کہنے لگی اور دیوانگی کی حالت میں گھر سے نکل جاتی ۔دیہاتی آبادی ، ویرانوں ،میدانوں اور جنگلوں میں گاتی ہوئی چلاتی ہوئی پھرتی ۔ دُکھ،درداور معرفت سے بھرے شعروں میں لوگوں سے مخاطب ہوتی اور سننے والے ایک ایک لفظ کو زبانی یادرکھتے تھے اور لکھنے والے لکھ لیتے تھے ان کا کلام کچھ تو صحیح سالم اور کچھ بگڑا ہوا جمع کیا گیا ہے اس کلام کا ترجمہ موجودہ کشمیری اُردو اور انگریزی میں کیا گیا ۔ارن مال کے کلام میں بلند درجہ معرفت اور فلسفہ ہے آپ کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے۔

محبت کبھی غائب یا مر نہیں سکتی

عاشق کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کی معشوقہ جہاں بھی ہو خوش و خرم رہے ۔ایک نہ ایک دن وہ اکٹھے ہو جائیں گے ۔لیکن بدقسمتی سے ان کے لئے یہ کبھی ممکن نہیں ہوا۔دوسری جگہ جو اپنا غم ارن مال نے اپنے اشعار میں ظاہر کیا ہے وہ اس طرح ہے۔

کب آپ کے پاؤں ہمارے گھر میں پڑینگے

میں ان پاؤں کو اپنے سر پر رکھوں گی آؤ میرے پاس محبت کی خاطر میں نے اپنا گھر وبار چھوڑ دیا۔اپنے نقاب کو میں نے پھاڑ دیا۔ میں اپنے وقت میں خوبصورت عورت تھی لیکن اب ضائع ہوگئی آؤ میرے پاس ارنِ مال کی جوانی اکیلے پن میں گذر گئی اور آہستہ آہستہ اس کی جوانی بھی ڈھل گئی ۔پریشانیوں اور مصیبتوں میں یہ مبتلا ہوگئی ۔اتار اور چڑھاؤ اس کی زندگی

کا حصہ بن گیا۔آپ نے اپنے اشعار میں اپنا قلمی نام بھی ارن مال رکھا جس
کے معنی ہے گلاب کے پھولوں کی مالا اپنی زندگی کے آخری دنوں میں آپ
نے چرخہ کاتنا شروع کیا۔جس سے آپ کو تھوڑی بہت آمدنی ملتی تھیں۔جس
سے آپ کی ضروریات زندگی پوری ہوتی تھیں اور آپ کو روحانی تسکین ملتی
تھی۔آپ کی شاعری کو اب بھی کشمیری یاد کرتے ہیں اور اپنے گھرانوں میں
آپ کے اشعار گاتے ہیں۔

والٹر لارنس

کشمیر میں بندوبست اراضی کا کام مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں ایک انگریز آفیسر مسٹر ونگیٹ کی سربراہی میں ۱۸۸۶ء میں شروع ہو گیا تھا لیکن یہاں کے مفاد پرست افراد جو کشمیر کے سرمایہ دار اور جاگیر دار تھے نے اس کو یہاں سے نکال دیا۔ اس کے فور بعد یہ کام والٹر لارنس کے سپرد کیا گیا۔ والٹر لارنس ۱۸۵۷ء میں مورپٹن کورٹ برطانیہ میں پیدا ہوا۔ انہوں نے ۱۸۷۷ء میں انڈین سِول سروس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۷ء میں بندوبست اراضی کے کمشنر کی حیثیت سے کشمیر میں چارج سنبھالا۔ تقریباً سات سال کی لگاتار محنت اور چند تجربہ کار ساتھیوں کی مدد سے آپ نے ۱۸۹۳ء میں بندوبست کا کام مکمل کیا۔ لارنس ایک تجربہ کار، مخلص انسان دوست آفیسر تھا۔ جس کو کشمیر اور کشمیریوں کے ساتھ عشق تھا۔ کشمیریوں کے ساتھ اس کی ہمدردی نے اس کو غلام کشمیریوں کا محسن بنا دیا وہ لوگوں کے دل میں گھر کر گیا۔ عوام پر ظلم و جبر روا رکھنے والے سرکاری اہلکاروں کی مخالفت کے باوجود آپ نے بندوبست کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ وہ عوام کے بہت قریب جا کر ان کے آلام و مصائب کا مشاہدہ و مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے کشمیری زبان سیکھ لی تھی کسانوں کی بدحالی دور کرنے کے لئے بہت سارے

اقدامات نہ صرف تجویز کیئے بلکہ ان پر عمل بھی کرایا لارنس نے بدنام بیعہ نامہ امرتسر ۱۸۴۶ء پر ضرب لگاتے ہوئے کشمیر کے کھیتوں پر مہاراجہ گلاب سنگھ کی ذاتی ملکیت کا قبضہ کھول کر کشمیریوں کے نام اُن کے انتقال کرنے کا آغاز کیا۔ اس طرح سے کشمیری قوم کی عزت کو بحال کرنے کا پہلا قدم اُٹھایا اور زمین ان کے نام منتقل کی۔ والٹر لارنس کو کشمیر میں لارن صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لارنس کی مشہور کتاب دی ویلی آف کشمیر ہے اس کتاب میں کشمیر سے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات درج ہیں۔ اس میں کشمیر کی تہذیب، تمدن، تواریخ، لوک روایات، نباتات اور جمادات پیداوار زبان ادب جغرافیہ درج ہیں۔ یہ کتاب کشمیر شناسی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس کی پہلی اشاعت آج سے ڈیڑھ سو سال قبل عمل میں آئی تھی۔ سرینگر میں ایس پی کالج کے ساتھ محکمہ مال کے محافظ خانے میں اطالوی سنگ مرمر سے بنا ہوا اس کا مجسمہ (Bust) نصب کیا گیا ہے۔ اگرچہ اپنے وطن نے اس کو فراموش کیا ہے لیکن اگر سرینگر کے محافظ خانے میں اس کی مورتی نہ ہوتی تو ہم اس کی شکل وصورت کا اندازہ بھی نہ کر سکتے۔ ۱۸۹۳ء میں زمین کا بندوبست مکمل ہو گیا کشمیری کسان کی نجات کا پہلا پتھر نصب ہوا۔ لارنس ایک لائق آدمی تھے۔ جنہوں نے اپنی طویل اور ممتاز سرکاری زندگی میں بہت سے اہم عہدوں پر فائز رہ کر امتیاز کے ساتھ ذمہ داری سرانجام دی۔ انڈین سول سروس میں انہوں نے ریاست کشمیر کے سیٹلمنٹ کمشنر کی حیثیت سے بہ طور خاص اپنا لوہا منوایا۔ لارنس کو پہلی نظر میں کشمیر سے عشق ہو گیا۔ بہ قول

لارنس ۱۸۸۹ء میں کشمیر میں مالیہ وصول کرنے کے لئے آٹھ ہزار کے قریب چابک دار مامور تھے جو نہ صرف حکومت کا حصہ وصول کرتے تھے بلکہ اپنا حصہ بھی ساتھ وصول کرتے تھے کہ بیچارہ دہقان مشکل سے اپنی لنگوٹی اور بیوی بچا سکتا تھا۔ اس لئے کھیتوں کے کھیت بے کار پڑے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں ریاست کشمیر دیوالیہ ہوگئی تھی زرخیز زمین بے کار پڑی تھی فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ کسانوں کو ہل چلانے اور بیج بونے پر مجبور کریں اس سے بدتر یہ تھا کہ سرکاری ملازم فصل تیار ہونے کے وقت حکومت کا حصہ اور اپنا حصہ بٹورنے کے لئے آتے اور کشمیری یہ محاورہ دہراتے رہتے

بتہ بتہ تہ پیادہ پتہ

ہم کھانے کیلئے تڑپ رہے ہیں اور فوجدار ہماری پیٹھ پر چابک برسا رہا ہے۔ مہاراجہ بندوبست تو چاہتا لیکن سرکاری اہلکار اس کے خلاف تھے تاکہ ان کے وفا پر آنچ نہ آجائے۔ بندوبست مکمل ہوگیا۔ کشمیری کسان کی نجات کا پہلا پتھر نصب ہوا۔ مہاراجہ نے لارنس کی سفارش پر بندوبست رپورٹ مکمل ہونے کے تین برس بعد میں ۱۸۹۶ء میں اسے لاگو کر کے تین لاکھ روپے کا بقایا مالیہ معاف کردیا۔ لارنس نے کشمیر کا سب سے پہلا سیٹلمنٹ انجام دیا۔ لارنس نے چند سال کشمیر میں رہ کر جو کام کشمیریوں کو ذلت سے نکالنے کیلئے کیا وہ آج تک کوئی حکمران یا حاکم اور نہ ہی کوئی لیڈر کرسکا۔ اس نے مالکانہ حقوق لوگوں کو اپنی زمینوں کیلئے دلوائے۔ کشمیر سرکار کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد والٹر لارنس لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر

ہوئے۔اس حالت میں بھی ان کو کشمیر کی یاد ستاتی رہی ۔ لارنس جب اپنے وطن انگلستان گیا تو وہاں بوڑھاپے کے دن کشمیر کی یاد میں گذارنے لگا۔ وہ کشمیری زبان سیکھ چکا تھا کشمیر میں اس نے تاریخ حسن کے مصنف پیرزادہ حسن کھویہ ہامی سے دوستی کی اور اس کی حوصلہ افزائی کے بعد اسے اپنا کر پکارا۔

جب لارنس کشمیر میں کام کر رہا تھا تو اس وقت یہاں ہر چیز پر ٹیکس تھا میوہ دار درخت ، بدزہ ، بنفتہ ، کھاپس ، ریشم ، زعفران ، تماکو، سنگھاڑے ، کاغذ ، شادی ٹیکس ، مردہ دفنانے پر ٹیکس غرض ہوا اور پانی کے سوا ہر چیز پر ٹیکس لیا جاتا تھا۔ لارنس کے علاوہ آرل سٹاین جارج گریرسن وغیرہ نے بھی کشمیر پر علمی کام کیا لیکن لارنس صرف کتابی آدمی نہ تھا اس نے عمل کی دنیا میں کشمیریوں کی نجات کے سامان بہم کیئے۔اس لئے اس کا نام جہاں ایک طرف سٹاین اور گریرسن کے ساتھ شامل کرنا پڑتا ہے وہاں دوسری طرف ٹنڈل بسکو کے ساتھ بھی جبکہ دونوں نے کشمیریوں کی دل وجان سے خدمت کی۔

ابھنو گپت

کشمیر جو کہ ہندوستان کے شمال میں واقع ہے۔ تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے۔ اس ملک کی تاریخ سنہری ہے۔ کشمیر کی آب وہوا اور قدرتی دلکش مناظر دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس ملک کے خوبصورت قدرتی ماحول میں کئی ہزار عابدوں اور عالموں نے پرورش پائی۔ کشمیر کوہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلوں سے گھیرا ہوا ہے۔ جن کو عابدوں اور عالموں نے اپنا مسکن بنایا اور کئی عابدوں و عالموں نے روحانیت کے معراج تک رسائی حاصل کی۔ علم بلاغت میں یہ ملک جنم بھومی مانی جاتی ہے۔ علم بلاغت کے موجد کشمیر میں ہی پیدا ہوئے۔ اس ملک پر مہادیو کی چوٹی پر شیو فلسفہ کا ظہور ہوا جن کو آچاریہ واسو نے حاصل کر کے فلسفہ اور منطق کو قدر و منزلت کے معراج تک پہنچا دیا۔ شیو فلسفہ کے معرض وجود میں آنے کی ابتداء کشمیر میں میسئر ریشی نے کی اور شیو فلسفہ کی بنیاد یہاں ڈالی۔ ان کے بعد واسو گپت سوم آنند، ابھنو گپت کھمراج اور یوگ راج قابل ذکر ہیں ابھنو گپت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ ان کے آباو اجداد ساتویں صدی عیسوی میں راجہ پشکر کے عہد حکومت میں کشمیر تشریف لائے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کے جد امجد کو قنوج سے کشمیر کے عظیم بادشاہ (۷۶۱-۷۲۴) للتا دیتہؒ نے کشمیر آنے کی

دعوت دی اور بعد میں یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ کچھ وقت پر اس خاندان
سے وراہ گپت نام کے ایک پنڈت پیدا ہوئے اس عالم سے نرسنگھ پیدا
ہوئے یہی صاحب ابھنوگپت کے والد بزرگوار تھے۔ ابھنوگپت کی والدہ کا نام
ول کلا تھا۔ ابھنوگپت کا مطلب نئے تخلیق کا موجب ابھنوگپت کامل برم چاریہ
تھے ان کے روحانی بزرگ اتیل دیو تھے۔ آپ مشہور شاعر، فلاسفر، درویش
تھے۔ آپ کا زیادہ تر کلام جمالیات پر مبنی ہے اور آپ نے اس کو بلندیوں
تک پہنچادیا۔ جمالیات پر پورے برصغیر میں آپ کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ اس
وقت بھی آپ کا نام کشمیر کے دیہاتوں میں عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا
ہے۔ آپ ۹۶۰-۹۵۰ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اس دوران کشمیر میں راجہ کلشن
راجہ اننت حکومت کرتے تھے۔ اور ابھنوگپت نے اپنی والدہ ول کلا سے
روحانی تربیت پائی تھی لیکن آپ کی والدہ جوانی میں ہی اس دنیا سے رخصت
ہوئی جب آپ چھوٹے تھے۔ والدہ کی موت سے ابھنوگپت پر گہرا اثر ہوا۔
آپ کو خداداد قابلیت حاصل تھی خوش قسمتی سے آپ کو بہترین اساتذہ ملے
جن کو بدھ مذہب، شیوازم اور ہندو دھرم کی خاص واقفیت تھی۔ آپ نے
Meta Physics, Poetry اور یوگا پر تعلیم حاصل کی اور علم کی جتنی
شاخیں تھیں ان پر آپ نے پورا عبور حاصل کیا۔ آپ نے تانترک علم بھی
حاصل کیا آپ نے کشمیری شیو فلاسفی اپنے عروج پر پہنچادی۔ آپ کو کشمیر کی
آب وہوا قدرتی مناظر، حیوانات، نباتات، دریاؤں درختوں سے عشق تھا۔
ابھنوگپت کی تصانیف آج کل نایاب ہیں۔ آپ کی ایک کتاب جو

شائع شدہ ہے جس کا نام ابھنو بھارتی ہے۔ بہت ہی مشہور ہے۔ جس کی اشاعت پہلے مدراس اور وارانسی میں ہو چکی ہے۔ ابھنو گپت کی جائے پیدائش کے متعلق مختلف آرائیں ہیں کوئی نشاط کے عقب میں واقع گپت گنگا کو ان کی جائے پیدائش مانتا ہے کئی تاریخ دان لالبازار کے نزدیک نالہ امرخان پر غوط چور میں ان کی جائے پیدائش تصور کرتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر سوم آنند سے لیکر ابھنو گپت تک شیو آچاریوں کی جائے رہائش تھی۔ یہ علاقہ سرینگر اور ملحقہ علاقوں میں بہت ہی خوبصورت جگہ ہے اس سے قبل اس جگہ ایک بودھ وہار یعنی خانقاہ تھی اور اس وہار تک رسائی ایک پل سے گذر کر ہوتی۔ ابھنو گپت کے حلیہ اور رہن سہن کے بارے میں دکن سے آئے ہوئے ایک شخص کرشنا بیجوا ان کے بارے میں آنکھوں دیکھا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھنو گپت انگور کے ایک باغ میں رہتے تھے۔ اروگرد مختلف قسموں کے پھولوں کی کیاریاں خوشبو سے مہک رہی تھیں۔ اس اجگہ چند ن کی خوشبو ہر جگہ پھیل رہی تھی اس ماحول میں ساز و آہنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے سامنے ان کے مشہور شاگرد کھیم راج ادب سے بیٹھے رہتے تھے۔ ابھنو گپت اپنی زبان مبارک سے فرماتے جاتے اور شاگرد ان کے کلام کو قلم بند کرتے جاتے۔ ابھنو گپت کی آنکھیں خمار اور مستی سے سرشار تھیں ان کے ماتھے پر تلک اور کانوں میں دانے آویزاں ہوتے تھے۔ گلے میں پہنی ہوئی مالا ان کی لمبی داڑی پر لٹک رہی تھی ابھنو گپت کے شاگردوں میں کھیم اندر اور کھیم راج تھے۔ ابھنو گپت علم باطن کے عظیم ماہر تھے۔ اس لئے ان کو

جگت آچاریہ مانا جاتا تھا۔ ان کے کشف و کمالات کے کئی واقعات سینہ بہ سینہ کشمیر میں چلے آئے ہیں ان کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ابھنوگپت اپنے بارہ سو شاگردوں سمیت ذات عالی پرم شو کی صفات گاتے گاتے بیروہ کی غار نزدیک ماگام (گلمرگ) میں وارد ہوئے اور نظروں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہوکر ذات حق سے واصل ہوگئے۔ ابھنوگپت کا علمی دائرہ بہت وسیع تھا جس کو آپ نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ آپ نے اور بھی کتابیں تحریر کی ہیں اور ایک مشہور کتاب تنتر شاستر یعنی رموزات غیبی بھی تصنیف کی ہے۔ ابھنوگپت کو علم بلاغت ڈرامہ نگاری کا ماہر استاد مانا جاتا ہے۔ شیو شاستر کے پراسرار اصولوں کو آشکار کرنا ابھنوگپت کا کام تھا۔ ان کی کچھ تصانیف محکمہ ریسرچ کشمیر سے شائع ہوچکی ہیں۔ ابھنوگپت کے کئی اور تحریرات دستیاب ہوئے ہیں جن میں عشق الٰہی پر زور دیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے باطل خیالات اور توہمات سے ہی آزاد ہونا نجات کہلاتا ہے اور اپنی ذات کو بچانا ہی آزادی ہے شیو شاستر کے مطابق گوشہ نشینی، ترک دنیا، دنیاداری سے علیحدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے مفکروں منطقیوں اور فلسفیوں کی صفحوں میں شری ابھنوگپت کا اہم مقام ہے جس کا ہم پلہ کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔ دنیا کے اس عظیم مفکر پر تمام دنیا بالعموم اور کشمیریوں کو بالخصوص فخر حاصل ہے۔

☆☆☆

زینہ ڈب

نوشہرہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کا پایہ تخت

سلطان بڈشاہ نے کشمیر پر تقریباً ۵۰ سال یعنی ۱۴۲۰ء سے لے کر ۱۴۷۰ء تک حکومت کی۔ بڈشاہ کو تعمیرات بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے جگہ جگہ باغات، پل، سرائیں، مسافر خانے اور شفا خانے تعمیر کیئے۔ ان کی تفصیل تو بہت طویل ہے مگر چند ایک حسب ذیل ہیں۔ زینہ لانک (جھیل ولر میں جزیرہ) زینہ کدل، زینہ گیر، زینہ کوٹ، زینہ پور، مسجد گاڑہ ایر، مزار سلاطین، خانقاہ سید مدنی اور اپنا پایہ تخت زینہ ڈب یا نوشہرہ جو سرینگر سے تقریباً ۱۳ کلومیٹر کے فاصلے پر بنایا کیونکہ یہ علاقہ اونچائی پر تھا اور سیلاب کا خطرہ یہاں نہیں تھا۔ اس کے مشرق کی طرف صورہ واقع ہے جہاں ایک عظیم الشان شفا خانہ ہے صورہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی جائے پیدائش ہے۔ مزید بڈشاہ کے ایک وزیر شری بھٹ کے نام پر اب بھی ایک محلّہ نوشہرہ کے نزدیک ہے۔

نوشہرہ نئے شہر کو کہتے ہیں اور بڈشاہ نے بھی عالی شان عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر کے سرینگر کے شمالی پہلو میں ایک نیا شہر آباد کیا تھا جو کہ

سیلابوں سے بالکل محفوظ تھا۔ چونکہ بادشاہ خود یہاں رہتا تھا اور یہاں ہی سرکاری دفاتر وغیرہ تھے۔ اس لئے نوشہرہ کو کشمیر کی راجدھانی بھی کہتے تھے۔ ڈب کے معنی محل یا منزل ہے۔ اس لئے سرکاری کاغذات میں یہ محلات زینہ ڈب کے نام سے موسوم تھے۔ بادشاہ نے اس مقام کو کافی رونق دی۔ نالہ بل کے نزدیک ایک خوشنما باغ بنوایا۔ اس باغ کے کھنڈرات پر شاہجہاں کے زمانے میں علی مردان خان گورنر نے ایک خوب صورت باغ بنوایا۔ جس میں فوارے، بارہ دریاں، آبشار بنوائے۔ آج بھی اس علاقہ کو باغ علی مردان خان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بڈشاہ نے نوشہرہ میں بارہ منزلہ عمارت بنوائی، ہر منزل میں پانچ حجرے تھے اور ہر حجرے میں پانچ سو آدمی سما سکتے تھے۔ گویا اس مکان میں ۲۵ ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی اور پھر لطف یہ کہ اس عمارت میں اینٹ پتھر چونہ کا نام ونشان نہ تھا تمام عمارت لکڑی کی تھی جو کشمیری صنعت کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔

اگر چہ بڈشاہ شہزادگی کے دور میں کئی سال سمرقند میں رہا اس لئے جس قسم کے باغات وہاں دیکھے ہوں گے ان کا نمونہ اپنے ملک میں بھی تیار کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ مرزا حیدر کاشغری حاکم کشمیر (۱۵۵۰-۱۵۴۰ء) یہ تسلیم کرتا ہے کہ خوبصورتی کے لحاظ سے کشمیر کا زینہ ڈب سمرقند، ہرات وتبریز کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ تاہم زینہ ڈب دنیا کی شاندار عمارتوں میں سے ہے۔ بادشاہ نے نوشہرہ میں علماء، فضلاء اور مساکین کو آباد کیا۔ بادشاہ نے علاقہ لار سے نالہ سندھ کو کاٹ کر ایک نہر لائی جو محلات زینہ ڈب کے مختلف صحنوں اور

باغوں سے گزرتی حوضوں اور فواروں کی خوب صورتی سے محلات کی شان دوبالا کرتی تھی بادشاہ نے باغات وعمارات کے علاوہ ایک عالیشان جامع مسجد تعمیر کرائی جس کے کھنڈرات آج سے ڈیڑھ سوسال پہلے تک موجود تھے۔ اپنے محل کے نزدیک کاغذ بنانے والوں کے لئے ایک محلّہ قائم کیا۔ اوران کاغذسازوں نے کشمیری کاغذ کی شہرت پوری وسط ایشیا میں قائم کی۔ ملا کبیر (استاد بادشاہ) اور خواجہ حبیب اللہؒ اور ملا آخوند شمس الدینؒ کی زیارت گاہیں نوشہرہ کے عین وسط میں واقع ہیں۔

زینہ ڈب میں صرف عالی شان محلات و باغات ہی نہ تھے بلکہ ایک دارالعلوم (یونیورسٹی) بھی تھی یہاں پر طالب علم، علم حاصل کرتے تھے۔ ان کے اخراجات بادشاہ خودادا کرتا تھا۔ اوران کے رہنے کے لئے بھی ہوٹل کا انتظام تھا۔ مولانا کبیر جو بادشاہ کے استاد بھی تھے اس دارالعلوم کے پرنسپل تھے۔ اس مدرسہ میں مندرجہ ذیل اساتذہ شامل تھے۔ ملا پارسا، ملا محمد نادر۔ نوشہرہ میں زینہ ڈب کے ٹوٹے پھوٹے آثار ابھی تک چشم عبرت کو نظر آتے ہیں۔

آسماں سے بھی تھا پایہ جن کی رفعت کا بلند
ہائے کیوں کر کھا گئی ان آسمانوں کو زمین

☆☆☆

سیاسی و معاشی استحصال کیخلاف

کشمیری شال بافوں کی پہلی منظّم وجدوجہد

یوم مئی ۱۸۸۶ء سے ۲۱ سال پہلے کا خونین واقعہ!

یوم مئی دنیا بھر میں مزدوروں اور محنت کشوں کا دن مانا جاتا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں امریکہ کے ایک شہر بوسٹن میں اپنے اوقات میں کمی کرانے اور اپنی اجرتوں میں اضافہ کروانے کی مانگ کو لے کر مزدوروں نے جدوجہد اور ہڑتالیں کیں مگر وقت کے حاکموں نے مظاہرین پر فائرنگ کی اور بہت سارے مزدور مارے گئے جبکہ بہت سارے زخمی ہوئے لیکن مظاہرین نے خون میں لت پت کپڑوں کو جھنڈا بنا کر مظاہرے کو جاری رکھا۔ اسی روز سے مزدوروں اور محنت کشوں کے لال جھنڈے نے جنم لیا۔ یہی جھنڈا اب سے مزدوروں کی عزت و آبرو کی نشانی بن گیا۔ اس واقعہ کے بعد دنیا بھر کے مزدور اس دن یعنی یکم مئی کو اپنے مطالبات منوانے کے لئے ''یوم مئی کے طور'' مناتے ہیں۔ اگرچہ کشمیر میں یہ تحریک بہت پہلے رونما ہوئی تھی مگر کشمیری اپنے اسلاف کو کبھی یاد نہیں رکھتے جنہوں نے ۱۸۶۵ء میں ہی ظلم وستم اور جبر کے

خلاف آواز اُٹھائی اور جانی ومالی قربانیاں دیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان مزدوروں اور محنت کشوں کو بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل نہ ہوسکی ورنہ ان کشمیری شالبافوں اور مزدوروں کی جدوجہد عالمی سطح پر یوم مئی کی بنیاد بن گئی ہوتی۔ مارچ ۱۸۴۶ء کو تاریخ کا مکروہ ترین فعل وقوع پذیر ہوا جس کے تحت سلطنت انگلشیہ نے مسلمانان کشمیر کو گلاب سنگھ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ان ڈوگرہ حکمرانوں نے نہ صرف ٹیکسوں کی بھرمار کے ذریعہ کشمیری کسانوں، شالبافوں کو مفلوک الحال بنادیا تھا بلکہ ان پر سرکاری کارندوں اور مخبروں کی ایک بری فوج بھی مسلط کر رکھی تھی جو ہر گھڑی اور ہر پل عام رعایا پر نظر رکھتی تھی۔ ایک طرف سے تو پیداوار کا ۴/۵ حصہ حکومت کی طرف سے مختلف ٹیکسوں کی صورت میں لیا جاتا تھا تو دوسری طرف باقی حصے پر سرکاری اہلکار قبضہ جماتے تھے اور اس طرح جو بھی پیدوار ہوتی تھی، وہ سرکار اور اس کے کاندرے ہڑپ کر جاتے تھے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کشمیر پر حکومت کی جس کے بعد اس کا بیٹا مہاراجہ رنبیر سنگھ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۵ء تک کشمیر کا حکمران بنا۔ اس وقت کشمیر کے شال دوشالے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ کشمیر کے شال یورپ میں اس وقت مشہور ہوئے جب نپولین کے کچھ سپاہیوں نے کشمیری شال مصر سے خریدے تھے۔ نپولین نے ایک کشمیری شال اپنی بیوی جوزفین کو بطور تحفہ دیا۔ یہ ایک پرانی کہاوت ہے کہ امیر لوگ غریب لوگوں کا خون چوس کر عیش وآرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب

کشمیر کو دودھ، مکھن اور میووں کی سرزمین سے جانا جاتا تھا۔ لیکن جب سے شخصی حکومت کشمیر میں قائم ہوئی یہ ساری چیزیں ختم ہوگئیں۔ غریب کشمیریوں پر ڈوگرہ حکومت کے وقت ٹیکسوں کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ قدرتی طور پر شالوں پر ٹیکس عائد کرنے سے شال صنعت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ بہت سارے شالباف کام کرتے کرتے اندھے بھی ہوگئے۔ کشمیری ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی دنوں میں بھوک، قحط اور افلاس سے تنگ آگئے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں زبردست قحط پڑا اور ان کی اقتصادی حالت تباہ ہوگئی خاص طور پر شالبافوں نے ۱۸۴۷ء سے ہی پنجاب اور دوسرے میدانی علاقوں میں سکونت اختیار کی۔ ۱۸۴۷ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک انہوں نے کشمیر سے ہجرت کی۔ کشمیر کی تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا کہ کشمیری شالبافوں نے ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ۱۸۶۵ء میں کرپارام کشمیر کا گورنر مقرر رہوا۔ اس سے پہلے اس عہدے پر وزیر پنو تھا۔ ۲۹ اپریل ۱۸۶۵ء میں شالباف اپنے حقوق منوانے اور انتظامیہ کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کے لئے سرینگر شہر کے اطراف واکناف سے نکل کر ذالڈگر (سید منصور صاحبؒ) میں جمع ہوگئے اور ایک بڑا جلوس نکال کر مظاہرہ کیا۔ لیکن کشمیر کے گورنر دیوان کرپارام نے کرنل بیج سنگھ کی قیادت میں بھاری فوج بھیج کر غیر مسلح اور بھوکے مظاہرین پر حملے کرا کے ان کو تنگ علاقہ حاجی راتھر پل کی طرف دھکیل دیا جس وجہ سے ۲۸ افراد کوٹہ کول میں ڈوب کر مر گئے۔ بہت سارے زخمی ہوئے۔ اس کے بعد ۳۰ اپریل ۱۸۶۵ء کو مظلوم شالبافوں نے ایک جلوس نکالا تا کہ وہ مہاراجہ رنبیر

سنگھ کے پاس جا کر انصاف طلب کر سکیں۔ لیکن حکام وقت نے انہیں راستے میں ہی روک لیا، ان کے لیڈروں کو گرفتار کیا۔ کچھ کو کوڑے برسا کر لہولہان کر دیا اور کچھ پر جرمانہ عائد کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اس دلدوز واقعہ کے بعد جولاہوں، شالبافوں اور ان کے مالکوں کے درمیان زبردست تصادم ہوا جس کو حکومت نے سختی سے کچل دیا اور پورے شہر کو فوج کے حوالے کیا۔ فوج نے لوگوں کو ہر طرح کی تکلیفیں دینے کے علاوہ لوٹ مار اور عورتوں کی عصمت ریزی کی۔ ۳۰۰ سے زائد شالبافوں کو جموں رام نگر جیل بھیج دیا گیا۔ لیڈروں خاص کر رسل شیخ، ابلی بابا، عبدالقدوس اور سونہ شاہ کو شیر گڈھی پیلس میں بند کر کے زبردست زدوکوب کیا گیا جس کے نتیجہ میں رسل شیخ اور ابلی بابا کی موت وہیں پر واقع ہوئی۔ کچھ لوگوں کو شیر گڈھی محل کے دروازے پر پنجروں میں رکھا گیا اور عام لوگوں کو کہا گیا کہ وہ ان پر تھوکیں۔ اس طرح نہ ان کو پانی اور نہ ہی خوراک دیا گیا۔ اس شورش اور تحریک کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۸۶۵ء میں شالبافی کی صنعت کے ساتھ ۲۷ ہزار جولاہے اور شالباف ۱۱ ہزار مشینوں (لومز) پر کام کرتے تھے ۔ ان ہنر مند مزدوروں کو روزانہ لگاتار کام کرنے کے باوجود قلیل ترین اجرت یعنی ۴ آنے ملتے تھے جو مہینہ بھر کے لئے ۷ یا ۸ روپے بنتے تھے۔ اس پر انہیں ماہانہ ۵ روپے حکومت کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا اور اپنی گذر بسر کے لئے تقریباً صرف ۳ روپے بچتے تھے۔ مزدوروں کے مالکان ان کے لئے کسی طرح کی مزید مدد نہیں کرتے تھے بلکہ ان جولاہوں کو یہ حق بھی حاصل نہ تھا کہ وہ کام چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کرتے۔ انہیں شال بنانے میں بہت محنت کرنی پڑتی تھی

کیونکہ یورپ میں شالوں کی بڑی مانگ تھی۔ اس وجہ سے تاجروں کو جولاہوں کی محنت سے بے پناہ فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ اس دور میں راج کاک دھر نے محکمہ شال کے ٹیکس کا ٹھیکہ حکومت سے ۱۲ لاکھ روپے سالانہ حاصل کیا تھا اور اس کو جولاہوں سے اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی طریقے سے ٹیکس وصول کرنے کی مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے رشوت خور ڈوگرہ افسر وزیر پنو کے ساتھ مل کر صراف کدل سرینگر میں اپنا ایک دفتر کھولا اور جولاہوں سے ٹیکس وصول کرنے کے لئے فوجی خدمات بھی حاصل کیں۔ اس کے پیش نظر جولاہوں اور شالبافوں کے ایک وفد نے قاضی گنڈ میں وزیر پنو سے مل کر اپنے مسائل سے ان کو آگاہ کیا۔ لیکن وہاں پر کسی نے ان کے مسائل پر غور نہیں کیا جس کے بعد ایک وفد دیوان کرپارام سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ لیکن راج کاک دھر اور وزیر پنو کی شہ پر دیوان کرپارام نے ان شالبافوں کے وفد سے ملنے سے انکار کیا جس وجہ سے ان شالبافوں اور جولاہوں میں زبردست غم وغصہ پیدا ہوا اور وہ جدوجہد کے میدان میں کود پڑے۔ اس کے علاوہ ریشم خانہ کے مزدوروں نے کئی بار اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کی لیکن حکام نے ان کی اس جدوجہد کو سختی سے دبا دیا۔ آخر ۱۹۲۴ء میں وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کشمیر آئے تو یہاں کے مزدوروں نے ان کو ایک یاداشت پیش کی جس میں یہاں کے حکمرانوں کی ظلم وستم کی داستان بیان کی گئی تھی۔

مغل روڈ

قدیم زمانے سے باہر سے آنے والے لوگوں نے کشمیر میں داخل ہونے کے لئے کئی راستے متعین کئے تھے۔ مختلف ادوار میں بعض اوقات یہ پہاڑی راستے دشوار گزار بن جانے سے ان راستوں میں تغیر وتبدل ہوتا آیا ہے۔ تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کا ایک قدیم راستہ ''نمک روڈ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ راستہ مغل شہنشاہوں کی کشمیر میں آمد سے پہلے بھی مستقل تھا، اور کشمیر جانے والی دوسری شاہراہوں کی طرح یہ ایک عام پہاڑی راستہ کی حیثیت سے ہی مشہور تھا، لیکن شہنشاہ اکبر نے ۱۵۸۶ء میں زیر سرکردگی قاسم خان میر بحر (سپہ سالار) کشمیر پر حملہ کر کے قبضہ کیا۔ چونکہ نمک روڈ لاہور سے سرینگر تک نزدیک ترین راستہ ہونے کے باعث اس کو کلیدی حیثیت اور اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس لئے مغلوں نے ''نمک روڈ'' کا نام تبدیل کر کے ''مغل روڈ'' رکھا۔ اور اس شاہراہ کو رابطے کے لئے مستقل طور پر اپنایا۔ اس طرح اس پہاڑی شاہراہ پر شاہی قافلوں کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ نتیجہ کے طور پر اب ''مغل روڈ'' نہ صرف از سر نو تعمیر کی گئی، بلکہ لاہور سے سرینگر تک کے پورے راستے پر گاؤں، سرائیں، قیام گاہیں، بارہ دریاں، مسجدیں وغیرہ بنائی گئیں، پھر اس پر ہاتھی، گھوڑے،

اونٹ، اہل کار، اُمراء، وزراء اور شاہی درباروالے قافلوں کی گہما گہمی شروع ہوگئی۔ کشمیر چونکہ ابتداہی سے اپنے حسن و جمال کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور معروف رہا ہے۔

اس لئے زمانہ قدیم سے ہی بیرونی حملہ آور اس علاقہ کو فتح کرنے کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔ لیکن وادی کو چاروں جانب سے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی سلسلوں نے اس انداز سے گھیرا ہے کہ حملہ آوروں کے لئے ان کو عبور کرنا بہت مشکل تھا یہی وجہ تھی کہ ۱۰۱۴ء سلطان محمود غزنوی نے جب کشمیر پر چڑھائی کی تو وہ کشمیر کو فتح نہ کرسکا۔ اور بھاری جانی و مالی نقصان اٹھا کر واپس غزنی لوٹنا پڑا تھا۔ چونکہ پہاڑی سلسلے نا قابل عبور ہوتے تھے لہٰذا کشمیر میں داخل ہونے والی شاہراہیں اور درّے بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کشمیری حکمران اپنی پوری قوت اہم سڑکوں اور دروں کی حفاظت اور نگہبانی پر صرف کرتے تھے۔

کلہن کی راج ترنگنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی تک پیر پنچال کو عبور کر کے کشمیر میں داخل ہونے کے لئے مغل روڈ جسے اس زمانے میں نمک روڈ کہا جاتا تھا کو کوئی خاص فوجی اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ یہ ایک عام پہاڑی راستہ تھا اور اس دور میں توسہ میدان والا ہی راستہ کشمیری حکمرانوں کی تمام جنگوں کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا۔

اسی طرح بارہویں صدی عیسوی تک مغل روڈ کے بجائے درہ توسہ میدان والی سڑک ہی فوجی نقطہ نگاہ سے اہم رہی ہے اگر چہ بارہویں صدی

عیسوی تک نمک روڈ کو فوجی اہمیت حاصل نہ تھی اور شاہی قافلے اس راستے پر سفر نہ کرتے تھے لیکن درہ پیر پنچال شاہراہ کا ذکر کلہن کی راج ترنگنی میں ملتا ہے چونکہ یہ راستہ پنجاب کے ساتھ رابطے کے لئے نزدیک ترین راستہ تھا۔ اس لئے تاجر اپنا مال واسباب اسی راستہ سے کشمیر میں لایا کرتے تھے۔

اسی طرح کشمیری بادشاہوں سے بغاوت کے بعد وزراء، امراء کشمیری شہزادے بھی کئی بار بھاگ کر اسی راستہ راجوری اور دوسرے علاقوں میں پناہ لینے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ۱۴۲۰ء میں جب بڈشاہ کشمیر کے تخت پر براجمان ہوا۔ تو انہوں نے آگے چل کر ملک کے انتظامی ڈھانچے میں زبردست تبدیلیاں کیں۔ ۱۴۵۰ء میں سلطان نے راجوری، نوشہرہ، لوہر کوٹ اور پونچھ کے علاقوں کو ملا کر ایک نئی ریاست کی تشکیل عمل میں لائی۔ سلطان نے اس ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لئے وہاں اپنے ولی عہد حاجی خان کو گورنر بنا کر بھیجا۔ اب چونکہ راجوری، نوشہرہ اور پونچھ پر مشتمل ایک نئی ریاست قائم ہو چکی تھی اس لئے اس خطے کے ساتھ رابطے کے لئے کشمیر دربار کو ایک ایسی شاہراہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان تینوں علاقوں کے درمیان سے گزرتی ہو۔ اس لئے نمک روڈ والے راستے کو رابطے کی سڑک کے طور پر منتخب کیا گیا۔ جو راجوری، پونچھ اور نوشہرہ علاقوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ شاہراہ نہ صرف سرینگر کے ساتھ رابطے کے لئے موزون تھی بلکہ پنجاب کے ساتھ تجارت کے لئے بھی بڑی اہم تھی۔ اسی طرح بڈشاہ کے وقت میں راجوری، پونچھ اور نوشہرہ کو ملا کر نئی ریاست قائم

ہونے کے ساتھ نمک روڈ روشنی میں آنے لگی۔ اور اب امرا اور اہل دربار درہ توسہ میدان والی شاہراہ کے بجائے اسی راستے سے سفر کیا کرتے تھے۔

نمک روڈ کو فوجی مقصد کے لئے پہلی بار ۱۴۵۲ء میں حاجی خان (جو کہ سلطان زین العابدین کا بیٹا تھا) نے استعمال کر کے اپنے والد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور فوجی لشکر لے کر بہرام گلہ درہ پیر پنچال سے ہوتے ہوئے ہیر پورہ جا پہنچا۔ جہاں سلطان مقابلے کے لئے کھڑا تھا۔ اس لڑائی میں بڈشاہ نے اپنے فرزند کو شکست دے دی اور حاجی خان نمک روڈ کے راستے فرار ہوا۔ تاریخی حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغلوں کے حملے سے پہلے بھی نمک روڈ پر آمد و رفت کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ لیکن اس زمانہ میں یہ نہایت دشوار گزار پہاڑی راستہ تھا۔ نہ تو کوئی ٹھہرنے کا انتظام تھا نہ سرائیں نہ بنگلے تھے۔ بس چاروں اطراف سر بلند پہاڑ، خطرناک جنگل اور خونخوار درندے ہوا کرتے تھے۔ ہمایوں کے مرنے کے بعد ۱۵۵۶ء میں شہنشاہ اکبر جب ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ تو اس کی نظریں کشمیر پر لگ گئیں۔ چنانچہ ۱۵۶۰ء میں اکبر نے قرہ بہادر کو کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا وہ اس مقصد کے لئے نمک روڈ کے ذریعے فوج لے کر نوشہرہ آ پہنچا۔ دوسری جانب اس حملے کی خبر پا کر کشمیر کا حاکم غازی چک مقابلے پر نکل آیا۔ اور تھنہ منڈی آ گیا۔ اس مقام پر غازی چک اور قرہ بہادر کی فوجوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔ اور مغل فوج نے شکست کھائی۔ اور کشمیری فوج فتحیاب ہو کر نمک روڈ کے راستے واپس سرینگر آ گئی۔

اس کے باوجود اکبر کی نظریں کشمیر پر تھیں۔ اور وہ ہر حال میں کشمیر فتح کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۵۸۶ء میں ایک اور مہم کشمیر سر کرنے کی شروع ہوئی مشیروں نے اکبر کو صلاح دی کہ کشمیر پر حملہ کرنے سے پہلے نمک روڈ پر واقع چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنا ہم نوا بنا کر ساتھ ملا لینا چاہیے۔ چنانچہ اکبر نے بھمبھر، راجوری، نوشہرہ اور بہرام گلہ کے چھوٹے چھوٹے راجوؤں کو پیغام بھیجا کہ وہ اطاعت قبول کر کے ان کے ساتھ مل جائیں۔ اسی طرح تمام انتظام مکمل کر کے شہنشاہ اکبر نے ۱۵۸۶ء میں مرزا قاسم کی سرکردگی میں کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم صادر کیا مغل لشکر نمک روڈ کے راستے سے آگے بڑھنے لگا۔ اور راجوری کی طرف کوچ کیا۔ اس کے بعد مرزا قاسم نے اپنی لشکر سمیت بڑی آسانی کیساتھ درہ پیر پنچال عبور کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مغل فوج مرزا قاسم کی سرکردگی میں کشمیر پر قابض ہوگئی۔

اب چونکہ کشمیر فتح ہو چکا تھا۔ شہنشاہ اکبر کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ وادی کشمیر کا نظارہ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ چنانچہ کشمیر ہندوستان کا ایک صوبہ بن گیا۔ اور حکومت چکوں سے منتقل ہو کر مغلوں کے ہاتھ میں آگئی ۱۵۸۷ء میں شہنشاہ اکبر پہلی مرتبہ کشمیر کے دورے کے لئے نمک روڈ سے ہوتا ہوا وارِدِ کشمیر ہوا۔ شہنشاہ کی آمد سے پہلے قاسم خان نے نمک روڈ کے ارد گرد سرائیں۔ آرام گاہیں، باغات اور مسجدیں تعمیر کیں۔ اور راستے کے نشیب و فراز کو ہموار کرنے کے لئے تین ہزار سنگ تراش روانہ کئے۔ شہنشاہ نے بھمبھر پہنچ کر اس کا نام اکبر آباد رکھا اور نمک روڈ کا نام آگے

چل کر مستقل طور پر مغل روڈ پڑ گیا۔ یہاں سے کشمیری زبان بولنے والے لوگوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اس جگہ بادشاہ بہرام گلہ آیا اور یہاں پہلی دفعہ خوب صورت پھل پھول اور چنار کا درخت دیکھا۔ بہت سی ندیوں پر پل باندھے گئے تھے۔ انہیں عبور کیا۔ آگے برف ہی برف تھی۔ بادشاہ بھی برف پر چلا۔ فروری کے دن تھے۔ برف باری کی بہتات تھی۔ برف پر کشمیری لوگ گھاس کی جوتی پہن کر بڑی آسانی کے ساتھ چلتے تھے۔ شاہی کارواں کے لئے گھاس کی جوتیاں بنوائی گئیں۔ بادشاہ نے خود بھی پہنی اور برف پر سے گزر گئے جلوس شہر سرینگر میں داخل ہوا بادشاہ نے گورنر کشمیر مرزا یوسف خان کے مکان میں قیام فرمایا تیسرے دن شہاب الدین پورہ کی سیر کی۔ جو دریا کے کنارے ایک عجیب دلکش جگہ ہے۔ اور پھر کشتیوں میں مراز (اسلام آباد) کی سیر کے لئے روانہ ہوا اکبر تین مرتبہ کشمیر آیا۔ تینوں بار اس نے مغل روڈ کے راستے ہی سفر کیا۔ اکبر کی وفات کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر ہندوستان کے تخت پر براجمان ہوا۔ اس بادشاہ کو کشمیر کے قدرتی حسن سے بہت لگاؤ تھا۔ کشمیر کے ساتھ اس کی محبت اور وابستگی کی داستان اسی دن سے شروع ہوئی ہے جب وہ ۱۵۸۹ء میں اپنے والد شہنشاہ اکبر کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ ہندوستان کا بادشاہ بننے کے بعد وہ تیرہ مرتبہ پورے دربار کے ساتھ براستہ مغل روڈ کشمیر آیا تھا۔ چونکہ شہنشاہ جہانگیر بار بار سرینگر آیا کرتا تھا لہٰذا اس نے اپنے مشہور انجینئر علی مردان خان کو مغل روڈ کی از سر نو تعمیر اور ہر پڑاؤ پر رہائش گائیں سرائیں و دیگر عمارتیں بنانے کے لئے متعین کیا۔ اور دوسری

طرف راجہ راجوری نے اس سڑک کی حفاظت کا کام انجام دیا اس طرح مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور میں مغل روڈ کو شاہی راستہ یا شاہراہ کی حیثیت حاصل ہوگئی جہانگیر آخری مرتبہ ۱۶۲۷ء میں کشمیر آیا تھا اور ۷ نومبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے مغل روڈ کے پہاڑی راستوں میں دم توڑ دیا۔ اس کے جسم کا کچھ حصہ چنگس سرائے میں دفن ہے۔ یہ مقام آج بھی قابل دید ہے۔ تابوت لاہور پہنچایا گیا۔ اور وہیں بمقام شاہدرہ سپرد خاک ہوا۔

۱۶۲۷ء میں شاہجہاں ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح کئی مرتبہ کشمیر کی سیر کو آیا۔ اور ہمیشہ اپنی بیگم ممتاز محل کیساتھ مہینوں یہاں قیام کیا اورنگ زیب صرف ایک دفعہ ۱۶۶۵ء میں کشمیر کی سیر کو آیا۔ ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر اس کے ساتھ تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اورنگ زیب مغل روڈ کے دشوار گزار راستے سے اتنا گھبرایا تھا کہ دوبارہ کشمیر آنے کا کبھی نام ہی نہ لیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ۱۷۵۳ء میں کشمیر پر افغانوں کا قبضہ ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہراہ مغل روڈ پر شاہی قافلوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ختم ہوگیا افغانوں نے کشمیر پر ۱۷۵۳ء سے ۱۸۱۹ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد پنجاب میں سکھ برسر اقتدار آگئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کا حکمران بن گیا۔

۱۸۱۴ء میں مغل روڈ کے راستے سکھوں نے کشمیر پر حملہ کیا اُدھر کشمیر میں افغان گورنر عظیم خان نے خالصہ فوجوں پر پے در پے حملے شروع کردیے تھے۔ مہاراجہ کی فوجوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا اور واپس لاہور گئے۔

مہاراجہ نے اس شکست کا بدلہ ۱۸۱۹ء میں کشمیر فتح کر کے لیا سکھوں کے دور اقتدار میں مغل روڈ کے راستے کوئی خاص جنگی مہم نہیں ہوئی کیونکہ یہ علاقہ ۱۸۴۶ء میں لاہور دربار سے مہاراجہ گلاب سنگھ نے حاصل کرلیا۔ جنہوں نے جموں کو سرینگر کے ساتھ رابطے کے لئے بانہال کاٹ روڈ والے راستے کو اپنا لیا۔ یوں مغل روڈ شاہی سڑک سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی اور یہ شاہراہ دھیرے دھیرے پہاڑی کی پگڈنڈی میں تبدیل ہوگئی۔

مغل روڈ لاہور سے شروع ہوکر سرینگر تک جاتی تھی اس کی کل لمبائی ۲۴۶ میل تھی۔ چونکہ مغل روڈ گجرات سے سرینگر تک ہی مانی جاتی ہے۔ جس کی کل لمبائی ۱۷۶ میل ہے اور راستہ کا سفر ۱۴ پڑاؤں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ان پڑاؤں پر مغل شہنشاہ اور اہل دربار کشمیر جاتے ہوئے قیام کرتے تھے۔ پڑاؤں کی تفصیل یوں ہے۔

۱	گجرات سے بھمبر	درمیانی فاصلہ	ساڑھے ۲۸ میل
۲	بھمبر سے سید آباد	درمیانی فاصلہ	۱۵ میل
		کل فاصلہ	ساڑھے ۴۳ میل
۳	سید آباد سے نوشہرہ	درمیانی فاصلہ	ساڑھے بارہ میل
		کل فاصلہ	۵۶ میل
۴	نوشہرہ سے چنگس	درمیانی فاصلہ	ساڑے ۱۳ میل
		کل فاصلہ	ساڑھے ۶۹ میل

۵	چنگس سے راجوری	درمیانی فاصلہ	۱۴ میل
		کل فاصلہ	ساڑھے ۸۳ میل
٦	راجوری سے تھنہ منڈی	درمیانی فاصلہ	۱۴ میل
		کل فاصلہ	ساڑھے ۹۷ میل
۷	تھنہ منڈی سے بہرام گلہ	درمیانی فاصلہ	ساڑھے ۱۰ میل
		کل فاصلہ	۱۰۸ میل
۸	بہرام گلہ (چنڈی مڑھ) سے پشیانہ	درمیانی فاصلہ	۸ میل
		کل فاصلہ	۱۱٦ میل
۹	پشیانہ سے علی آباد سرائے	درمیانی فاصلہ	۱۱ میل
		کل فاصلہ	۱۲۷ میل
۱۰	علی آباد سرائے سے ہیر پور	درمیانی فاصلہ	۱۲ میل
		کل فاصلہ	۱۳۹ میل
۱۱	ہیر پور سے شوپیان	درمیانی فاصلہ	۸ میل
		کل فاصلہ	۱۴۷ میل
۱۲	شوپیان سے رامو	درمیانی فاصلہ	۱۱ میل
		کل فاصلہ	۱۵۸ میل
۱۳	رامو سے کنک پورہ	درمیانی فاصلہ	۸ میل

		کل فاصلہ	۱۶۶ میل
۱۴	کنگ پورہ سے سرینگر	درمیانی فاصلہ	۸ میل
		کل فاصلہ	۱۷۴ میل

تقسیم ملک کے بعد مغل روڈ کے پہلے ۵۰ میل یعنی گجرات سے نوشہرہ کی سرحد تک پاکستان کے قبضے میں آگئے تھے آزادی کے بعد ایک عرصہ تک یہ اہم شاہراہ نظر انداز کرلی گئی۔ لیکن اس سڑک کی از سر نو تعمیر (جموں سے سرینگر کے راستے کے متبادل سڑک کے طور پر) ہو رہی ہے۔ کشمیر و راجوری پونچھ دونوں طرف سے اس سڑک کی تکمیل کا کام تقریباً مکمل ہو رہا ہے کشمیر کی جانب سے مغل روڈ تقریباً ہیر پورہ سے آگے مکمل ہوگئی ہے اور عنقریب یہ راستہ آمد و رفت کے لئے کھول دیا جائے گا۔ مغل روڈ کی تکمیل سے نہ صرف پونچھ اور راجوری کا رابطہ سرینگر سے قائم ہو جائے گا بلکہ یہ سڑک جموں کو سرینگر سے ملانے کے لئے متبادل راستے کے طور پر بھی استعمال ہوا کرے گی۔ اس سڑک کے کھولنے سے پونچھ اور راجوری کے عوام کی اقتصادی حالت پر بڑے مثبت اثرات پڑ سکتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جس سے یہاں کے غریب لوگوں کو روزگار کے وسائل فراہم ہوں گے۔ یہ راستہ پہاڑی پگڈنڈی کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں سے لوگ اپنے مال مویشیوں سمیت چھوٹے چھوٹے ڈھوکوں میں رہتے تھے۔ لیکن اب وہ دن دور نہیں جب ایک بار پھر مغل روڈ پر آمد و رفت شروع ہوگی اور اس کا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال ہو جائے گا۔

۱۶۹۹ء میں اس سڑک پر موئے شریف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کشمیر میں بصد احترام لایا گیا اس وقت ہندوستان کا بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا اور کشمیر کا گورنر فاضل خان تھا۔ موئے شریف کے استقبال کے لئے مشہور بزرگ شیخ محمد چستی رادھو عشائیؒ ننگے پیر ہیر پورہ پہنچے۔ اور زیارت نقشبند صاحبؒ میں پہلی دفعہ موئے شریفؐ کی نشان دہی کی گئی۔

چار چناری

روپہ لانک۔سونہ لانک

روپہ لانک:-

یہ زمین کا ایک مربع ٹکڑا ہے جو ایک چھوٹا جزیرہ جھیل ڈل میں واقع ہے۔اس کے چار کونوں پر چار چنار کے درخت لگے ہیں۔ یہ جھیل ڈل کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ اس جزیرہ کی بنیاد مغل شہزادہ مراد بخش نے ۱۶۴۱ء میں ڈال دی۔ جو کہ شاہجہاں کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ گرمیوں میں لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر یہاں سیر و تفریح کے لئے آتے تھے اور دلفریب نظاروں اور آب و ہوا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہاں پر ناچنے گانے کی محفلیں لگتی تھیں مغلوں نے کشمیر میں چنار لگانے کی مہم بڑے زور شور سے چلائی خاص طور پر مغل شہنشاہ جہانگیر نے اس میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ اس نے باغوں، شہراؤں، ڈل کے کناروں پر چنار درختوں کو لگوایا۔ چنار کو کاٹنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ درخت حکومت کی تحویل میں تھے۔ چار چناری (روپہ لانک) کی جگہ خاموش اور سکوت ہے اور عبادت کے لئے موزون ہے۔ ڈل کے کنارے مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک سڑک تعمیر کی ہے جس کو بلوارڈ روڑ کا نام دیا گیا ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد

سلطان حسن شاہ کے وقت میں ۱۴۸۶ء میں ڈالی ۔ ہیگل اور ٹمپل کے خیال کے مطابق اس جزیزہ کی بنیاد اس سے پہلے پڑی ہے۔

سنہ لانک :-

اس کے کونوں پر بھی چار چنار لگے ہیں یہ حضرت بل کے مقابل میں ہے گرمیوں میں لوگ شکاروں میں بیٹھ کر یہاں کے خوشگوار ماحول کا لُطف اُٹھاتے ہیں۔ یہاں سے نشاط، شالیمار اور زبرون اور مہا دیو پہاڑیوں کا نظارہ بڑا دلفریب لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے پٹھان گورنر (۱۷۷۸-۱۷۷۲ء) امیر خان جواں شیر نے نسیم باغ سے خوبصورت پتھر اُٹھا کر یہاں سونہ لانک میں لگوائے۔ یہ سونہ لانک کس نے بنائی اس کے بارے میں تاریخ دان خاموش ہیں۔

خام پور سرائے

مغل روڈ کو پرانے وقت میں نمک روڈ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لیکن ۱۵۸۶ء میں جب شہنشاہ اکبر نے اس راستے سے کشمیر کو فتح کیا تو اس کے بعد لاہور سے سرینگر تک نزدیک ترین راستہ ہونے کے باعث نمک روڈ کو کلیدی حیثیت اور زبردست اہمیت حاصل ہوگئی مغلوں نے نمک روڈ کا نام تبدیل کر کے مغل روڈ رکھ دیا۔ اور اسی طرح مغل روڈ کی پہاڑی پگڈنڈیوں پر شاہی قافلوں کی آمد ورفت شروع ہوئی۔ اور اب مغل روڈ کی از سر نو تعمیر ہوئی ہے۔ لاہور سے سرینگر تک اس راستہ پر سرائیں، آرام گاہیں اور مسجدیں بنائی گئیں۔ اور مغل روڈ کا معمولی سا ویران پہاڑی راستہ ایک شاہراہ میں تبدیل ہوگیا۔ جس پر ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، درباری چلنے لگے۔ ویسے تو مغل روڈ لاہور سے شروع ہو کر سرینگر تک جاتا ہے۔ لیکن لاہور سے گجرات تک میدانی سفر اس روڈ میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح اصلی روڈ گجرات (پاکستان) شہر سے سرینگر تک ہی مانا جاتا ہے راستے میں مختلف پڑاؤ آتے ہیں۔ جن میں خاص طور پر گجرات، چنگس، نوشہرہ، راجوری، تھنہ منڈی، بہرام گلہ، علی آباد سرائے، ہیر پورہ، شاجی مرگ اور خام پور سرائے قابل ذکر ہیں۔ خام پور تحصیل پلوامہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کے

نزدیک چاڈورہ کا خوب صورت گاؤں ہے جہاں سے ہم آستانہ شیخ نور الدین نورانیؒ پر پہنچ سکتے ہیں۔ مغل کارواں شوپیان سے چل کر خام پور پہنچ کر سرینگر کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ یہاں پر مغلوں نے ایک خوبصورت سرائے بنوائی۔ یہ سرائے سرینگر پہنچنے سے قبل آخری پڑاؤ تھی۔

۱۵۸۹ء میں جب اکبر اعظم نے کشمیر کا دورہ کیا تو آپ نے خام پور میں قیام کیا۔ اس کے بعد شہنشاہ جہانگیر بھی اس سرائے میں قیام پذیر ہوتا تھا۔ جہانگیر کو یہ علاقہ بہت پسند تھا وہ اپنی ملکہ نور جہاں اور مرزا حیدر چاڈورہ کے ساتھ چاڈورہ اور ارد گرد کے علاقہ کا سیر کرتا تھا۔ اس کے بعد شاہ جہاں ۱۶۵۸-۱۶۲۷ء) کے حکم پر گورنر کشمیر علی مرداں خان نے خام پور پر از سر نو ایک مضبوط اور سنگین سرائے تعمیر کرائی جو اب بالکل خستہ ہو چکی ہے۔ خام پور سرائے کی تعمیر میں پتھروں، اینٹوں اور چونے کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سرائے میں دس کمرے تھے اور عبادت کے لئے ایک چھوٹی مسجد تھی۔

سرائے کے سامنے ایک کھلا میدان ہے جس میں مسافر خیمے لگا کر قیام کرتے تھے۔ شاہ جہاں کے حکم سے علی مرداں خان نے کشمیر سے راجوری تک تمام منزلوں پر سرائیں، راستے اور بارہ دریاں بنوائیں جن کے آثار ابھی تک دکھائی دیتے ہیں جن میں تھنہ منڈی، بہرام گلی، شاجہ مرگ، ہیر پورہ اور خام پور قابل ذکر سرائیں ہیں جو یادگاریں علی مرداں خان اور شاہ جہاں کی ہیں۔ خام پور سرائے سے آگے راستے میں سرینگر کی طرف دلفریب

اور خوب صورت نظارہ دیکھا جاسکتا ہے خوبصورت گاؤں لہلاتے کھیت اور سیب کے باغات نظر آتے ہیں۔

کشمیر کی تاریخ میں خام پور سرائے کی اس لحاظ سے بھی اہمیت ہے کہ اس جگہ کے قریب مرزا حیدر دوغلت جو کشمیر کا حکمران ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۰ء تک تھا اور شہنشاہ ہندوستان بابر کا خالوزاد بھائی تھا۔ اس کو اسی جگہ ۱۹ نومبر ۱۵۵۰ء میں ہلاک کیا گیا۔ بعد میں اس کو مزار سلاطین زینہ کدل سرینگ میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرزا دحیدر دوغلت نے کشمیر کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کو تاریخ رشیدی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نسیم باغ

مغلوں نے کشمیر پر پورے پونے دوسوسال حکومت کی اور کشمیر کو ایک
نہ صرف چمکتی دمکتی، مہکتی سرزمین کی حیثیت سے دنیا میں روشناس کرایا بلکہ
انہوں نے یہاں رفاہ عامہ کے بہت سارے کام کیے۔ مغل حکمران جہانگیر
پکار پکار کر کہتا تھا کہ کشمیر کو ملک مت کہو۔ یہ قدرت کا لگایا ہوا باغ ہے۔
مغلوں نے یہاں بہت سارے باغات لگوائے۔ جن میں شالیمار، نشاط،
چشمہ شاہی اور اچھ بل وغیرہ کے علاوہ نسیم باغ شامل ہیں۔ نسیم باغ میں بارہ
سو کے قریب چنار کے درخت لگوائے گئے تھے۔ بقول (تاریخ دان) حسن
ان درختوں کی آبیاری پانی کے بجائے دودھ سے کی گئی۔ لہٰذا ان میں سے
ایک بھی چنار ضائع نہ ہوا تھا۔ ایک زمانے میں باغ کی سبز گھاس مخمل کے
مانند دکھائی دیتی تھی۔ باغ کے فوارے اور آبشار بھی اس پانی کی مدد سے چالو
ہوتے تھے۔ افغانوں کے دور حکومت میں امیر خان جوان شیر گورنر کشمیر نے
اس باغ کی بربادی اور تباہی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور باغ سے سنگ
سیاہ اور دیگر پتھر نکال کر ان کو شیر گڈھی اور سونہ لانک میں نصب کروائے۔
باغ سے فوارے بھی ہٹا دیئے گئے جس سے باغ کی وسعت روز بہ روز کم
ہوتی گئی۔ البتہ باغ میں آج بھی چنار کے درخت اس باغ کی عظمت اور

جلال کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس باغ میں لوگ خیموں میں بیٹھ کر ڈل جھیل اور دو خوبصورت پہاڑوں زبرون ، مہادیو اور داچھی گام کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں اس باغ میں کشمیر کا پہلا انجینئرنگ کالج قائم ہوا۔ اب کشمیر یونیورسٹی نے اس کو اپنی تحویل میں لیا ہے۔ اس باغ میں صبح سویرے دل کو لبھانے والی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ موسم خزان میں باغ کی خوبصورتی اور بڑھ جاتی ہے جبکہ چنار کے پتوں کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے درختوں کو پانی دینے کے لئے باغ کے وسط میں ایک خوبصورت نہر تھی۔ جس میں پانی پرانی حبک نہر سے آتا تھا۔ یہ نہر حضرت بل درگاہ کو بھی پانی مہیا کرتی تھی اور اس کے بعد جھیل دل میں گرتی تھی مگر اب اس نہر کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔

ایس پی کالج

کشمیر میں اسکول اور کالج کھلنے سے پہلے کشمیری پنڈت اپنے بچوں کو
پاٹ شالوں اور مسلمان اپنے بچوں کو دینی درسگاہوں میں بھیجا کرتے
تھے۔ جہاں وہ سنسکرت فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایس پی
کالج مغربی طرز کا پہلا کالج ہے جہاں کشمیری طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم دی
جاتی ہے۔ ہر ایک تعلیمی ادارہ کی کشمیر میں اپنی اپنی تاریخ ہے کچھ ادارے
ایسے ہیں جن کا ماضی شاندار رہا ہے اور ہم شاندار طریقے سے یاد کرتے ہیں
جیسا کہ سری پرتاپ کالج ادارہ علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ پہلا ادارہ ہے
جس نے کشمیریوں کو اونچی تعلیم بہم پہنچائی۔ اس سے پہلے سرینگر میں ایک
اسکول قائم ہوا تھا جس کو ہندو اسکول کے نام سے یاد کیا جاتا۔ جو سرینگر شہر
میں واقع تھا اور بنارس ہندو یونیورسٹی سے مسلک تھا۔ بنارس سے مسٹر ولسن
بحیثیت پرنسپل اس اسکول میں مقرر رہوا۔ ۱۹۰۰ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ جو کہ
کشمیر کا مہاراجہ تھا کی دلی تمنا تھی کہ سرینگر میں ایک کالج قائم ہو۔ جہاں پر
کشمیری طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں مہاراجہ
پرتاپ سنگھ کا پرائیویٹ سکریٹری ایک پرانا کشمیری راجہ دیا کرشن کول تھا اور
اس کی بھی خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے سرینگر میں بھی ایک کالج

قائم ہو۔اسی دوران ۱۹۰۵ء میں ایک انگریز خاتون ماہر تعلیم انی بینسٹ
سرینگر وارد ہوئی۔ان کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔
اتفاقاً پنڈت کول کو بھی اِنی بینسٹ کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے انہوں
نے اِنی بینسٹ سے استدعا کی کہ سرینگر میں ایک کالج قائم ہواور وہ بنارس
ہندو یونیورسٹی سے رابطہ کریں اس کے بعد ہندو ہائی اسکول فتح کدل میں
ایک میٹنگ بُلائی گئی۔ جس میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ۔اِنی بینسٹ منسٹر
صاحبان اور باعزت شہریوں نے شرکت کی۔ چنانچہ متفقہ طور پر فیصلہ لیا گیا
کہ سرینگر میں ایک کالج قائم ہو۔اس طرح ۱۹۰۵ء میں سری پرتاپ ہندو
کالج قائم ہوا۔سبھی کے چہروں پر خوشی اور شادمانی ٹپکتی تھی مذکورہ کالج بنارس
ہندو یونیورسٹی سے منسلک ہوا۔مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے کالج کھلنے پر خوشی
کا اظہار کیا اور کالج تعمیر کرنے کے لئے پولو گراونڈ کے نزدیک زمین متعین
کی جہاں کالج کی سنگ بنیاد رکھی گئی اور تعمیر کا کام بڑے جوش وخروش سے
شروع ہوا۔فسٹ ائر کلاس جون ۱۹۰۶ء سے شروع ہوئے یہ کلاس راجہ دیا
کرشن کول کے مکان کے ایک کمرے میں تھا۔کمرہ چھوٹا تھا اور اس میں دس
لڑکے مشکل سے تعلیم حاصل کرتے تھے جو کہ سب کشمیری پنڈت تھے اس
کے بعد کالج کی تعمیر بڑی مستعدی سے ہوئی۔تین چار کمرے تیار ہوئے اور
مسٹر مور بحیثیت پرنسپل مقرر ہوئے بڑے مشکل حالات کے باوجود مسٹر مور
نے کالج کا انتظام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔آپ کو کالج سے بڑا لگاؤ تھا
آپ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کالج کے پرنسپل رہے۔آپ کے وقت میں

وائسرائے ہند نے کالج کا دورہ کیا اور آپ نے کالج میں جیولیس سیزر کا ڈرامہ دیکھا یہ ڈرامہ دیکھ کر وائسرائے اور انگریز آفسران بہت متاثر ہوئے۔ مسٹر مور نے کالج کا چارج مسٹر کلی کو دیا۔ آپ بہت بڑے عالم اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ۱۹۰۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے کالج کا نظم نسق اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کالج کا نام سری پرتاپ کالج رکھا اس کے بعد کالج ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن رہا اور طالب علموں کی تعداد بھی بڑھ گئی یہ ایسا کالج کشمیر میں تھا جس میں نصف صدی تک یہاں کے لڑکوں کو اونچی تعلیم دلائی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں کالج کی وابستگی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے رہی۔ اس کے بعد کالج میں مختلف قسم کی سرگرمیاں عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۰۹ء سے لیکر ۱۹۲۱ء تک کالج کے پرنسپل اقبال کرشن شار جا تھے۔ وہ بھی بڑے قابل اور ذہین تھے ان کا اصلی وطن کشمیر تھا۔ کالج میں جن پرنسپلوں نے کام کیا۔ ان میں چند ایک کے نام یہ ہیں۔ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۳۹-۱۹۳۱ء، محمد دین تاثیر ۱۹۴۲-۱۹۴۱ء، خواجہ غلام احمد عشائی، جیالال کول، ایس ایل رینہ، نورالدین، سیف الدین، محمد یوسف، محمد اسلم بچھ، غلام محمد بانڈے۔ غریب لڑکوں کو مالی امداد دینے کیلئے Mutual Benefit Fund قائم ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور پرتاپ میگزین اجراء ہوا۔ اس میگزین نے پچھلے ایک سو سال میں بڑے اچھے قلمکار پیدا کئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر کالج نے شاندار کامیابی دکھائی۔ ۱۸ گریجویٹ، ۲۶ ایف اے، ۴۴ ایف ایس سی

طالب علم امتحان میں کامیاب ہوئے۔ تعلیمی نظام میں بڑی پیش رفت ہوئی جب سرینگر میں میڈیکل کالج اور انجینئر نگ کالج قائم ہوئے۔اس میں بیشتر طلباء ایس پی کالج کے ہی تھے۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں کشمیر یونیورسٹی قائم ہونے کے باوجود کالج علم کا گہوارہ تھا۔ ۱۹۲۵ء کے بعد جس وقت مہاراجہ ہری سنگھ جموں کشمیر کے مہاراجہ بن گئے، کالج میں نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ تعلیم کو عام کرنے کیلئے مہاراجہ نے نمایاں اقدام کئے۔غریب اور پسماندہ لوگوں کو مالی امداد دی گئی۔ تعلیم حاصل کرنے کیلئے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لڑکوں کو کشتیوں میں چشمہ شاہی، نشاط اور شالیمار باغوں کی سیر کرائی جاتی۔ اس وقت لڑکے کلاسوں کا بائیکاٹ وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ نہ ہڑتال (Strike) وغیرہ ہوتی تھی۔ کشمیر کی تحریک آزادی میں ایس پی کالج کے جن طالب علموں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ بعد میں ریاست کے وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ بن گئے خاص طور پر شیخ محمد عبداللہ، غلام محمد صادق، سید میر قاسم، ڈاکٹر فاروق اور مفتی محمد سعید نے کشمیر کی ثقافت کے حوالے سے کالج میں بھر پور حصہ لیا اور کھیلوں میں بھی کافی شہرت حاصل کی۔ Philanthropic سوسائٹی کا عمل کالج میں شروع ہوا جو طالب علموں کو ایک اچھا شہری بننے کی تربیت دیتے تھے۔ یہاں کے طالب علموں نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی قابلیت دکھائی۔ چاہیئے وہ ڈاکٹری ہو یا انجینئر نگ کالج میں نئے نئے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً Hydro Biology، کمسٹری Bio، کالج کا Motto یہ ہے Ad.Aethere tenden

فاتح اعظم سلطان شہاب الدین

(شیرِ شامک) ۱۳۵۴-۱۳۷۳ء

(شیرِ شامک) سلطان شہاب الدین ۱۳۵۴ء میں کشمیر کا بادشاہ بنا اس کی تخت نشینی کی تاریخ درج ذیل شعر سے نکالی جاسکتی ہے۔

ہاتف غیبی بہر سال جلوس گفت بر گو شہنشہ نامی

تخت نشین ہونے پر اس نے شہاب الدین کا لقب اختیار کیا۔ وہ علاؤ الدین کا فرزند اور شہمیری سلطنت کے بانی سلطان شمس الدین شہمیر کا پوتا تھا۔ شہاب الدین کی تربیت معقول طریقے سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہم عصر بچوں سے زیادہ عقلمند تھا۔ اس کو اپنے مذہب کے علاوہ تاریخ کے بارے میں بھی اچھی واقفیت تھی۔ مزید اسے فن سپہ گری شمشیر زنی میں بھی کافی مہارت حاصل تھی سلطان شیروں کا شکار کرنے کا بہت شوقین تھا۔ ایک روایت ہے کہ لڑکپن کے زمانہ میں ایک دن شہاب الدین شکار کھیلنے گیا۔ اسی اثنا میں اس نے کسی جانور کے پیچھے گھوڑا دوڑایا۔ اس دوڑ دھوپ سے شہاب الدین کو شدت سے پیاس لگی اور ادھر ادھر بھٹکنے لگا کہ اچانک ایک عارفہ دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے درہ کوہ سے نکلی۔

(اس عارفہ کی نسبت بعض مورخوں کا قول ہے کہ وہی مشہور لل عارفہ تھی) اور عارفہ کی دعوت پر پیالہ لے کر دودھ پی لیا۔ پیالہ واپس لے کر اس عارفہ نے شہاب الدین سے مخاطب ہوکر کہا اے شہاب الدین تو ایک دن بڑا بادشاہ بن جائے گا اور بہت سی فتوحات کرے گا اس کے بعد شہاب الدین کشمیر کا سلطان بن گیا۔

شہاب الدین اپنے والد کے عہد میں ہی امور سلطنت میں شامل تھا۔ چنانچہ سلطان علاؤ الدین کو نہ صرف اپنے بیٹے سے حد درجہ پیار تھا بلکہ اس کی انتظامی صلاحیتوں پر کافی بھروسہ بھی تھا۔

شہاب الدین نے جن حالات میں آنکھ کھولی وہ کشمیر کی تاریخ میں انتہائی آزمائش کُن دور تھا۔ آخری ہندو حکمران سہہ دیو اور کوٹہ رانی کی حکومت سازشوں بغاوتوں اور سیاسی قتل و غارت کا دور تھا۔ جاگیرداروں کی طاقت زوروں پر تھی۔ ملک میں افراتفری کی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ لوگوں کی زندگی اور جائیداد محفوظ نہ تھی۔

پہلے جو علاقے کشمیر کے باج گزار تھے ان ہی سے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ کشمیر کی ابتری کا ایک سبب یہ تھا کہ وسط ایشیا سے ایک تاتاری سردار زولچو ستر ہزار فوج کے ساتھ کشمیر پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے کشمیر میں بربریت اور لوٹ مار روا رکھا۔ بادشاہ سہہ دیو زولچو کے ڈر سے کشتوار بھاگ گیا۔ اور رعایا کو زولچو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ۸ مہینے کشمیر میں رہ کر اُس نے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ذولچو کے اس حملہ کے بعد کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر جاگیرداروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ایسے آڑے وقت میں جو دو اہم شخصیتیں عوام کے بہی خواہ کے طور پر ابھریں وہ رینچن شاہ اور شاہ میر تھے۔ ان کے ذاتی اخلاق واوصاف سے ہندو اکثریت نے انہیں اپنا بھرپور اعتماد اور تعاون دے کر حکمران تسلیم کیا۔ شاہ میر جو بعد میں سلطان شمس الدین کے لقب سے کشمیر کا پہلا سلطان ۱۳۳۹ء سے لے کر ۱۳۴۲ء تک بنا۔ شہاب الدین کا دادا تھا۔

مزید پریشان کن حالات کشمیر میں سلطان شہاب الدین کے زمانہ تک برابر قائم تھے۔ وہ لوگوں کی زبوں حالی کو جان گیا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ لوگوں کے دکھ درد دور کر سکے اور کشمیری قوم کو اپنا کھویا ہوا وقار واپس دلا سکے۔ چنانچہ یہی تمنا اس کے دل میں تھی ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے بھی سلطان کی شجاعت کی تعریف جاوید نامہ میں بیان کی ہے۔ شہاب الدین ایک آزمودہ کار سپاہی ہونے کے علاوہ ایک قابل حکمران بھی تھا۔ اسے اپنے کشمیر سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اس کے ماضی سے باخبر تھا۔ عقلمند تیغ زن اور علم دوست بھی تھا۔ اور عالموں کا قدردان بھی تھا۔ وہ میدان جنگ میں فتح پانا بھی جانتا تھا اور رعایا سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

سلاطین کشمیر شمس الدین اور سلطان علاو الدین کی حکومت اگرچہ وادی کشمیر تک محدود تھی۔ لیکن شہاب الدین نے کشمیر کے اردگرد علاقوں کو فتح کرنے کی طرف قدم بڑھایا اور کشمیر کے گردونواح میں جو علاقے تھے ان کو

بھی فتح کیا جن میں ملتان، کابل، غزنی اور بلوچستان قابل ذکر ہیں کشمیر میں جو جنگجو قبیلے تھے جن میں خاص طور پر تانترے، نائیک، لون تھے ان کو اپنی قابل رہنمائی سے اپنا دوست اور خیر خواہ بنایا اس کے علاوہ اپنی فوج میں پونچھ، راجوری، کشتواڑ اور مظفر آباد کے پہاڑی قبائل بھی شامل کردئے۔ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور اس غرض کے لئے اس نے حضرت امیر کبیرؒ کے بھتیجے اور سید تاجؒ کے فرزند سید حسن بہادر کو امیر لشکر بنا کر شمالی ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اور دہلی کو فتح کرنے کا ارادہ کرلیا۔ فیروز شاہ تغلق شہنشاہ ہندوستان نے ستلج کے کنارے اس کا مقابلہ کیا یہ جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئی آخر کار حضرت امیر کبیرؒ نے ان دو عظیم بادشاہوں کے درمیان صلح کرائی۔ اس کی رو سے سرہند سے لے کر کشمیر تک کا علاقہ شہاب الدین کے قبضے میں آگیا۔ سید حسن بہادر رستم ہند کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ مزید فتح ہندوستان کے موقعہ پر فیروز شاہ بادشاہ نے اپنی بیٹی سید حسن کے لئے نامزد کی۔ سید حسن اور ان کی بیگم نے جب انتقال کیا تو اپنے والد سید تاج الدینؒ کے مقبرے واقع شہام پور (نزدیک نوہٹہ پولیس سٹیشن) میں سپرد خاک کئے گئے۔ شہاب الدین کا عہد کشمیر میں شاندار رہا ہے جب کہ کشمیریوں نے اپنی بہادری اور فوجی طاقت دنیا کو دکھائی شہاب الدین پہلا حکمران تھا جس نے کشمیر سے باہر اپنی فتوحات جاری رکھیں۔ جب وہ فوجی مہموں پر جاتا تھا۔ اس کو نہ سردی نہ گرمی کا غم ہوتا تھا اور نہ بھوک کا نہ پیاس کا۔ وہ بڑی بہادری کے ساتھ تیز دریاؤں مشکل پہاڑوں اور صحراؤں کو پار کرتا تھا۔ کشمیر کی تاریخ

میں للتادیتہؒ کے بعد ایک عظیم الشان بادشاہ تھا۔ سلطان کے عہد میں جو بڑے بڑے بہادر فوجی افسر تھے ان میں چندرا ڈار، شوراسید سید حسن بہادر، ابدال رینہ وغیرہ تھے۔ اپنے سپاہیوں کے رہنے کے لئے سلطان نے بارکیں بنوائیں۔ شہاب الدین کو کشمیری پیار اور عزت کرتے تھے۔ اس کے عہد حکومت میں کشمیر اور کشمیری ایک بڑی طاقت بن گئی۔

سلطان اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا وہ ایک قابل حکمران تھا اور حکومت کا انتظام عدل وانصاف سے چلاتا تھا۔ ۱۳۶۱ء میں کشمیر میں ایک تباہ کن سیلاب آیا۔ جس سے سرینگر کا بڑا علاقہ برباد ہوگیا۔ تمام پل بہہ گئے اس کے لئے سلطان نے بچاؤ کاروائیاں کیں۔ اس نے لوگوں کو اونچی جگہوں پر پہنچانے کے لئے ہر ممکن امداد دی۔ اور دریائے جہلم کی بھی کھدائی کروائی اس نے کوہ ماراں (ہاری پربت) کے اردگرد جگہ کو اپنی راجدھانی کے لئے منتخب کیا۔ یہاں اس نے ایک نیا شہر اپنی رانی لکشمی کے نام پر لکشمی نگر بنایا جو سیلاب سے محفوظ علاقہ تھا۔

اس نے دریائے جہلم اور سندھ کے سنگم پر ایک قصبہ شہاب الدین پور جسے آج شادی پورہ کہتے ہیں بسایا۔ قصبہ کی تعمیر پر ساری دولت لٹادی جو اس نے اپنی فتوحات کے دوران حاصل کی تھی جہانگیر نے بھی (۱۶۲۷-۱۶۰۵ء) شادی پور کی تعریف کی ہے اس کے بارے میں آپ نے بیان کیا ہے کہ شہاب الدین پورہ (شادی پورہ) کشمیر کی بہترین جگہوں میں سے ایک ہے۔ یہاں پر تقریباً ایک سو پرشکوہ چنار ایک سرسبز میدان میں کھڑے ہیں۔

وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملے ہوئے ہیں کہ سارے میدان کو زیر سایہ لاتے ہیں یہاں فرش بچھانا بے سود ہے۔

شہاب الدین پہلا شاہ میر سلطان ہے جس نے وادی کے مختلف حصوں میں مدارس قائم کئے اور سرینگر میں قرآن وحدیث پڑھانے کے لئے ایک کالج قائم کیا۔ ان میں پڑھانے کے لئے ترکستان، ایران اور ہندوستان کے عالموں کو یہاں بلایا۔

سلطان اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتا تھا۔ شہاب الدین کے بیشتر سردار غیر مسلم تھے جب بادشاہ کو جنگ کے کثیر اخراجات کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا اس کے وزیر اعظم اودھے کری نے مہاتما بدھ کی پیتل کی مورتی کو پگھلا کر سکہ بنانے کا مشورہ دیا تو سلطان نے خفا ہو کر جواب دیا۔ کہ پرانی نسلوں نے ان دیوتاؤں کی مورتیاں نصب کر کے عزت حاصل کی۔ اور تم ان کو گرا دینے کا مشورہ دیتے ہو یہ کتنی بڑی بد اخلاقی ہے مزید اس نے اپنے عہد میں کئی خستہ مندروں کی مرمت کرا کے انہیں ٹھیک کرا دیا۔ شہاب الدین کا انیس سالہ اقتدار کا دور ہر لحاظ سے تعمیر و ترقی کا دور تھا۔ اس نے کشمیریوں میں ایک بار پھر خود اعتمادی اور خودداری پیدا کر دی اور کشمیر کا وقار سارے ایشیا میں بلند کیا۔

سلطان ربط وضبط اور دیگر امورات میں اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ چنانچہ اس کا زمانہ حسن انتظام کے لحاظ سے قابل رشک خیال کیا جاتا ہے جن علاقوں کو اس نے فتح کیا ان کو وہاں کے حاکموں اور وارثوں کے حوالہ کر دیا

جس سے اس کا نام روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھا۔

آپ کے وقت میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے چچیرے بھائی سید تاج الدین کشمیر تشریف لائے سلطان اس کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ اور دل و جان سے خدمت گزاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور ان کو اپنے محل کے نزدیک جگہ دی۔

سلطان کاروبار، حکومت کے کاموں ملکی لڑائیوں میں ان سے مشورہ لیتا تھا۔ سلطنت کی فتوحات کی کثرت کو حضرت سیدؒ کی روحانی ہمت اور طاقت کا نتیجہ جانتے تھے۔

آخر ۱۳۷۳ء میں سلطان کو موت نے اپنی آغوش میں لیا۔ اور حالت مرگ میں اپنے بھائی سلطان قطب الدین کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ محلّہ مہاراج گنج میں نزدیک ڈاکخانہ اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔ جس پر ایک سنگین گنبد بھی بنایا گیا تھا۔ لیکن انقلاب زمانہ نے اس کا نام و نشان ڈوگرہ عہد میں مٹا دیا۔ تاریخ وفات

زِ دربار کشمیر چوں رخت بست

شہاب و دگر قطب جائش نشست

حکومت وقت کا فرض ہے کہ اس عظیم فاتح سلطان کا مقبرہ از سر نو تعمیر کریں۔ یہ ہمارے لئے باعث شرم ہے کہ اس کی قبر کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔

☆☆☆

بادام واری

کشمیر کے دلفریب مناظر اور مرغزار و باغات دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہر سال ملکی و غیر ملکی سیاح ان باغوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کشمیر آتے ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ کشمیر میں باغات کی ابتداء مغل شہنشاہوں نے کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شالیمار، نشاط اور دوسرے مغل باغات کی ابتداء مغل بادشاہوں نے کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شالیمار، نشاط اور دوسرے مغل باغات سے پہلے ہی کشمیر کے قدیم حکمرانوں نے اپنے سیر و تفریح کیلئے خوشنما اور خوبصورت باغ لگوائے تھے لیکن زمانے کے حادثات کی وجہ سے ان باغوں کا نام و نشان تک مٹ گیا ہے۔ سلطان علاؤالدین نے دریائے جہلم کے کنارے حبہ کدل اور فتح کدل کے وسط میں ایک باغ لگوایا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے قلعہ ہاری پربت کے دامن میں باغات لگوائے تھے۔ بڈشاہ نے اپنے دارالخلافہ نوشہرہ کے نزدیک ایک عظیم الشان باغ بنوایا۔ انہی باغوں میں ہاری پربت (کوہ ماراں) کے دامن میں ایک خوبصورت باغ بادام واری ہے۔ (کوہ ماراں) ہاری پربت جو شہر سرینگر کے وسط میں ایک خوبصورت، خوشنما اور دلکش پہاڑی ہے۔ جس کے چاروں اطراف پتھر کی دیوار (فصیل اکبری) ہے جس کا سنگ بنیاد مغل شہنشاہ اکبر

نے ۱۵۹۸ء میں رکھا تھا۔ وہ ۵۔۳ میل لمبی ۲۸ فٹ اونچی اور ۱۳ فٹ چوڑی تھی۔ اس قلعہ کے اندر ناگر نگر کا ایک چھوٹا سا شہر بھی آباد کیا۔ جس میں مغل بادشاہوں نے رہائش کے لئے بارہ دریاں اور فوجی اور سول حاکموں کیلئے چھاونیاں اور دوسری عمارتیں تعمیر کیں۔ شہزادوں اور امیروں کے لئے محلات بنوائے۔ اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۸۵-۱۸۵۷ء) نے کوہ کے دامن (ناگر نگر) میں ہر طرف بادام کے پیڑ لگوائے اور یہ کوہستانی زمین کا ٹکڑا ایک حسین جمیل دل پسند نخلستان بن گیا۔ اپنے پر کشش اور شاداب نظاروں کے سبب اس کو بادام واری کا نام دیا گیا۔ اس باغ میں سینکڑوں کی تعداد میں بادام کے پیڑ لگوائے گئے۔

موسم بہار کے آتے ہی ان بادام کے پیڑوں میں شگوفے نکل آتے ہیں۔ جن سے باغ دلکش اور دلربا بن جاتا ہے۔ سیر وتفریح کے لئے کشمیری بڑی تعداد میں اس باغ میں تفریح کے لئے آتے ہیں۔ آج بھی بادام کے پیڑ اس باغ کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں اور کشمیری بادام کے شگوفوں کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ مناظر فطرت کی رو سے یہ لاثانی ہے۔ ناگر نگر میں اندر جانے کے لئے تین دروازے ہیں۔ کاٹھی دروازہ، باجھی دروازہ اور سنگین دروازہ افغان گورنر عطا محمد خان نے ۱۲۷۲ھ میں کوہ ماراں (ہاری پربت) کی چوٹی پر ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ بادام واری ۱۹۷۴ء تک بہاروں کے ملن کی آماجگاہ تھی۔ رفتہ رفتہ یہ اپنی دلکشی اور دلربائی کھونے لگی اور باغ کے کچھ حصہ پر ناجائز تعمیرات بننے لگے۔ اب اس کو از سر نو تعمیر کرنے کیلئے جموں و کشمیر بنک

نے ۲۰۰۷ء میں یہ قیمتی عوامی میراث جو باغ وارث خان جو اکبر بادشاہ نے باغ درشن اور جروگہ شاہی کے نام سے ڈل کے کنارے بنائے تھے کو دوبارہ بنوایا گیا اور لوگوں کو بہار سے لیکر خزان تک اس سے لُطف اندوز ہونے کا موقعہ فراہم کیا گیا۔ یہ باغ تاریخی بادام واری کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ جموں و کشمیر بنک کی وساطت سے طرز نو کے ساتھ مزید اور متواتر تفریح کے لئے اب اس باغ کو ماہرین کی خدمات حاصل کر کے خوشنما گلزار میں تبدیل کیا گیا ہے اور افتتاحی تقریب (۴ مارچ ۲۰۰۸ء) کے بعد عوام کے لئے وقف کر دیا گیا۔

پریذنٹیشن کانونٹ اسکول

کشمیر میں عیسائی مشینری اسکولوں نے اپنا کام ۱۸۸۰ء سے ہی شروع کیا تھا۔ ان کو یہاں کچھ ان پڑھ لوگوں سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود یہاں ان کے ہاتھوں جدید تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی۔ ان میں کانونٹ اسکول سرفہرست ہے۔ عیسائی مشنریوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کئے بغیر سماجی زندگی میں تبدیلی کے امکانات تاریک ہیں اس لئے انہوں نے اس امر کی طرف بھی توجہ دی۔ مس چرچل ٹیلر، مس فٹز (Fitz) مس میلنس کا شمار ان خواتین مشنریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر میں تعلیم نسواں کو مقبول بنانے میں نمایاں اور کلیدی رول ادا کیا۔ عیسائی کانونٹ اسکولوں کا جال دنیا کے بہت سارے ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی بنیاد نانینونیگل نے ۱۷۷۵ء میں آئرلینڈ میں ڈال دی یہ ایک خاتون تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم سے ہی انسان کی صحیح تربیت ہو سکتی ہے آخر کار اس کی محنت اور کوشش اس وقت رنگ لائی۔ جب آپ نے کارک شہر میں بہت سارے اسکول قائم کئے نینونیگل نے عیسائی کھیتولک اسکول قائم کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ اس وقت ان کا ادارہ پوری دنیا میں نینونیگل کے اسکول چلانے کا تھا۔ کانونٹ اسکول نے کشمیر میں رہ کر

خدمت خلق کو اپنا نصب العین بنایا اور ایسے طلباء طالبات پیدا کئے جنہوں نے دیانتداری کو اپنا اصول بنایا۔ غیر اخلاقی طریقہ کار پر موت کو ترجیح دی اس اسکول نے تعلیمی نظام کو مغربی طریقہ پر ڈالا۔ طلباء و طالبات کو صاف وردی پہننے، بالوں کو صاف رکھنے اور ناخنوں کی صفائی کا عادی بنایا اور یکساں وردی استعمال کرنے پر زور دیا۔ اسکول میں وقت کی پابندی اور بلند فکری پر زور دیا۔ جسمانی ورزش، کرتب بازی، کھیلوں سے طالبات کو روشناس کیا گیا اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی تلقین کی گئی۔

اس اسکول نے کشمیر سے جہالت، غریبی، تنگ نظری اور تعصب کو دور کیا۔ اس اسکول کا مقصد یہاں کے طالبعلموں میں انسانیت اُجاگر کرنا تھا جن میں جرأت، چال وچلن، ہمدردی، سچائی اور انصاف ہو۔ اس اسکول نے شمع کی مانند دوسروں کو روشنی دکھائی۔ اس اسکول نے طالبات میں اپنی مدد آپ کرو اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کر دیا۔ یہاں کے طلباء کوڑھ کے مرض میں مبتلا بیماروں کے پاس اسپتال جاتے ہیں۔ ان کی خبر گیری کرتے ہیں اور مالی امداد بھی کرتے ہیں۔ جن طلباء نے کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی وہ اپنی خوش نصیبی پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔ اس اسکول نے اپنی محنت اور ہمدردی سے کشمیریوں کے دل میں جگہ پیدا کر دی ہے۔ کشمیر میں کانونٹ اسکول کی ابتداء سرینگر میں ۱۷ مارچ ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے کانونٹ ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں ادارہ کے منتظمین سے گذارش کی کہ سرینگر میں بھی ایک اسکول قائم ہو۔ ان کی یہ گذارش منظور ہوگئی۔ اور سسٹرس

(Sisters) راولپنڈی سے سرینگر تشریف لائیں۔ تاکہ اسکول کا نظم ونسق سنبھالیں۔ وہ جھیل ڈل کے کنارے بلوارڈ پر رہائش پذیر ہوئیں۔ آخر کار مہاراجہ ہری سنگھ نے کانونٹ اسکول کیلئے راج باغ میں زمین الاٹ کی۔ اسی اثناء میں اسکول بلڈنگ تیار ہوگئی اور ۱۵ جون ۱۹۳۹ء میں اسکول میں باقاعدہ طور تعلیم شروع ہوئی ساتھ ہی اسکول کا افتتاح ہوا۔ ۱۹۷۷ء تک یہاں Co-Education تھی۔ اب یہاں صرف طالبات تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے ۱۲ جنوری ۱۹۶۵ء میں اسکول آگ کی نذر ہوا۔ جو بڑی بلڈنگ تھی وہ بھی آگ میں خاکستر ہوگئی۔ صرف کلاک ٹاور بچ گیا۔ ۱۹۸۰ء میں اسکول میں اردو سیکشن قائم ہوا۔ جہاں پر غریب طلباء وطالبات تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ۲۰۰۹ء اسکول کے لئے خوش قسمت سال تھا اس سال نئی بلڈنگ (نگل بلاک) کا افتتاح ہوا۔ اور گیارویں اور بارویں کلاسز شروع ہوئے اور اسکول ہائر اسکینڈری میں تبدیل ہوگیا۔ یہ طلباء وطالبات کا ایک دیرینہ خواب تھا جو پورا ہوگیا۔ ۲۰۱۱ء میں اسکول میں پلیٹنم جُبلی Platinum Jublee منائی گئی۔ کشمیر میں ان ۷۵ سالوں میں جو شاندار کام تعلیم پھیلانے میں اس ادارہ نے کیا وہ قابل فخر وتحسین ہے۔ Platinum Jublee پلیٹنم جُبلی پر اسکول میں رنگا رنگ پروگرام منعقد ہوئے۔ جن میں پرانے طلباء وطالبات نے بھرپور حصہ لیا۔ اور طلباء و طالبات مختلف یتیم خانوں میں گئے اور یتیموں کی مالی امداد کی جہاں پر ذہنی طور کمزور بچیاں بھی پرورش پاتی ہیں۔ اسکول میں ۲۷ اور ۲۸ جولائی ۲۰۱۱ء کو

ایک پروگرام منعقد ہوا۔ جہاں پر موسیقی اور دوسرے تفریحی پروگرام دکھائے گئے ۔ اسکول کا ماٹو Virtue اور Labour ''ورچو'' کے معنی انسان میں اچھی خصلت اور اچھے جوہر ہونے چاہے labour کے معنی انسان جفاکش اور محنتی ہونا چاہیے ، انسان کو ہمیشہ دیانتداری اور سچائی کا ساتھ دینا چاہیے۔ جو تاج ماٹو میں ہے وہ حضرت مریم علیہ السلام کی یاد دلاتا ہے۔

عجائب گھر (میوزیم)

کشمیر صدیوں سے قدرتی مناظر کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے علماء و فضلاء پیدا ہوئے ہیں اور ہر جگہ آثار قدیمہ نظر آتے ہیں۔ جن کی وابستگی بدھ مذہب ہندو دھرم اور دین اسلام سے رہی ہے۔ مغربی ممالک سے جو سیاح، تاریخ دان ماہرین آثار قدیمہ عیسائیت کے مبلغین و اہل دانش وقتاً فوقتاً وارد کشمیر ہوئے ان میں اکثروں نے اپنے سفرناموں، یاداشتوں اور تاریخوں میں یہاں کے رسم و رواج، رہن وسہن اور آثار قدیمہ کے متعلق اپنے اپنے انداز میں ذکر کیا ہے۔ ہم بہت سارے یورپی سیاحوں کے مرہون منت ہیں جنھوں نے یہاں کی تہذیبی وراثت کو چار چاند لگائے اور یہاں کی سرزمین میں بہت سارے نادر و نایاب قلمی نسخے، مورتیاں، مجسمے، کتبے دریافت کئے۔ سب سے پہلا یورپی سیاح برنیر ۱۶۶۵ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ہمراہ وارد کشمیر ہوا۔ جس نے اپنا سفرنامہ بھی لکھا۔ اس کے بعد کنگھم ۱۸۴۶ء میں یہاں آیا۔ جس نے راج ترنگنی کا ترجمہ سنسکرت سے انگریزی میں کیا۔ اس طرح راج ترنگنی پوری دنیا میں روشناس ہوگئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں راجہ امر سنگھ جو مہاراجہ

پرتاب سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا۔ نے ایک یاداشت مہاراجہ کو پیش کی۔ کہ سرینگر
میں ایک میوزیم قائم کیا جائے۔ جہاں پر جموں، کشمیر، گلگت بلتستان وغیرہ
کے نادر نمونے رکھیں جائیں۔ راجہ امر سنگھ کیساتھ اس کام میں یورپی آثار
قدیمہ کے ایک ماہر کیپٹن گارڈ میری نے پورا تعاون کیا۔

آخر ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ کے حکم سے میوزیم کی بنیاد ڈالی گئی۔ میوزیم
جو ڈوگرہ مہاراجوں کا گرمائی محل تھا کی بنیاد دریائے جہلم کے بائیں کنارے
پر رکھی گئی۔ پھر اس عمارت کو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تعمیر کیا۔ ڈوگرہ مہاراجے
شیر گڈھی محل سے نکل کر دریائی جلوس کی صورت میں لال منڈی گھاٹ پر
اُتر کر اس گرمائی محل میں چند دن گزارا کرتے تھے۔ محل میں ایک وسیع
خوبصورت باغ تھا۔ جس میں قسم قسم کے پھول اور مختلف میوہ دار درخت
اُگائے گئے تھے۔ آج کل اس میوزیم کو ۱۱۵ برسوں کے بعد ایک نئی عمارت
جو متصل ہی ہے میں منتقل کیا گیا ہے۔ عمارت جدید طرز کی خوب صورت
اور ہوا دار ہے۔ ان ۱۱۵ برسوں کے دوران متعلقہ محکمہ کے اہلکاروں نے
مختلف اوقات میں ۸۰۰۰ نادر نمونے میوزیم میں جمع کئے ہیں۔ نئی عمارت دو
منزلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی منزل کی ایک گیلری میں ماڈلوں کے ذریعے
کشمیر کی پرانی تہذیب برزہامہ جو آج سے ۳ ہزار سال پرانی ہے دکھائی گئی
ہے۔ کہ کس طرح اس زمانے کے لوگ گڈھوں میں رہتے تھے۔ یہ گڈھے
دہانے پر تنگ اور نیچے کافی کشادہ کھودے جاتے تھے۔ برزہامہ میں ہڈیوں
کے اوزار مثلاً مچھلیاں پکڑنے کا سامان۔ سوئیاں، پتھروں کے بھالے،

چھریاں اور دیگر اوزار شامل ہیں۔ جو آج کل اسی گیلری میں موجود ہیں۔

مہاراجہ کنشک جو پہلی صدی عیسوی میں کشمیر کا حکمران تھا۔ بدھ مت کا پیرو کار تھا۔ بدھ مت کی چوتھی عالمی کانفرنس کا انعقاد کشمیر کے علاقہ ہارون میں زیر سرپرستی مشہور بدھ عالم ناگ ارجن منعقد ہوئی۔ بدھ مذہب کشمیر میں کافی پھیلا۔ یہاں جو مختلف ڈیزائنوں کی اینٹیں دریافت ہوئی ہیں ان پر مختلف اقسام کے بیل بوٹے پھول۔ مرغوں کی جھڑپ، بیلوں کی لڑائی ڈرم بجاتی ہوئی ناچنے والی لڑکی کے نقش کندہ ہیں اور ان اینٹوں کی مشابہت وسط ایشیا کے مختلف ممالک کے رہن سہن اور لباس سے ہے۔ رام چند کاک جو ان دنوں محکمہ آثار قدیمہ کا ڈائریکٹر تھا کے زیر سرپرستی جب ہارون میں کھدائی کی گئی تو یہ اینٹیں دریافت ہوئیں۔ غالباً یہ پہلی صدی عیسوی کی بات ہے آج یہ اینٹیں سرینگر میوزیم کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ علاقہ جڈی بل میں روضہ و مسجد مدین صاحب واقع ہے جو سرینگر سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور ہے۔ جس کو بڈشاہ نے ۱۴۴۴ء میں اپنے پیرو مرشد سید محمد مدنیؒ کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اس کی دیواروں پر خوب صورت ورنگین ٹائلیں چسپاں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ٹائلیں میوزیم میں رکھی گئی ہیں۔

آثار قدیمہ گیلری

اس گیلری میں بدھ مت اور ہندو مت کی مورتیاں نسب کی گئی ہیں۔ جن کو کھدائی کے دوران پانچویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک کشمیر کے مختلف علاقوں سے دریافت کیا گیا۔

علم سکہ جات گیلری

اس گیلری میں کشمیر کے مختلف ادوار کے سکے رکھے گئے ہیں۔ یہ سکے تین سو سال قبل مسیح سے یہاں موجود ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ کشمیر کے لوگ سکہ جات کے متعلق پہلے واقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سکے سرینگر کے صراف محلّہ میں ملائے جاتے تھے۔ ان سکوں میں رومی سلطنت، خاندان کارکوٹ، سلاطین کشمیر، چک دور، مغلیہ دور، سکھ دور اور ڈوگرہ دور کے سکے شامل ہیں۔ سکوں کے متعلق یہ کہانی ہمیں کشمیر کی تاریخ تمدن اور ثقافت کے متعلق جانکاری دیتی ہے۔

زیبائشیں گیلری

اس میں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک کشمیر کے مختلف کاریگروں کے شاندار فن کے نمونے مثلاً لکڑی کا کام۔ پیپر ماشی، تانبے کے برتنوں پر نقش نگاری، پتھروں پر دیوی دیوتاؤں کی خوبصورت تصاویر رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ موسیقی کے اوزار جو کشمیر میں زمانہ قدیم سے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ گیلری میں موجود ہیں جن میں خاص طور سے ستار، سنتور، تمبک ناری وغیرہ شامل ہیں۔

زیورات گیلری

اس میں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک کے مختلف زیورات جو کشمیری خواتین استعمال کرتی تھی رکھے گئے ہیں۔ جو مختلف دیہاتوں میں بنائے جاتے تھے جن میں سونے تانبے اور چاندی کے زیورات شامل ہیں۔

اسلحہ خانہ و جنگی سامان گیلری

اس گیلری میں جنگی ساز و سامان جو پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۸-۱۹۱۴ء)
میں استعمال ہوتے تھے موجود ہیں اور ڈوگرہ فوجیوں کو اس جنگ میں
بہادرانہ کارنامے دکھانے کے لئے جو انعامات تمغے دئے گئے تھے وہ بھی
موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سترویں صدی کی مختلف تلواریں اور دیگر جنگی ساز
و سامان بھی موجود ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ تقریباً سات سو رنگا رنگ
آمیزی کی مختلف قسم کی مصوری جو ملک کے مختلف علاقوں سے حاصل کی گئی
ہیں بھی گیلری میں رکھی گئی ہیں۔ جن میں کانگرہ بسوہلی۔ مغل، راجستھان
وغیرہ کے علاقے قابل ذکر ہیں۔ نیز یورپی کاریگروں کی بنائی ہوئی واٹر کلر
کی مصوری بھی یادگار کے طور پر رکھی گئی ہیں۔ جن میں گلگت اور لداخ کے
نظارے دکھائے گئے ہیں۔

قلمی نسخہ گیلری

اس گیلری میں شاردا، سنسکرت، عربی اور فارسی کے قدیم نسخے بھی
دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ قلمی نسخے بھوج پتوں پر درج ہیں۔ اس کے علاوہ پندرویں
صدی میں لکھا گیا قرآن شریف بھی یہاں موجود ہے۔ جو عقیدت مندوں
کیلئے باعث کشش ہے۔ نیز رامائن مہابھارت اور بھگوت گیتا کے قلمی نسخے
بھی موجود ہیں۔

Natural History گیلری

اس گیلری میں مختلف قسم کے پرندے اور جنگلی جانور جو کشمیر کے

جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ موجود ہیں۔ جن میں شیر، بھالو، گلہری، بطخ، ہرن، رنگ رنگ کے پرندے، چوپائے، سانپ وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کو مسٹر واڈن نے انیسویں صدی کے اوائل میں جمع کیا تھا۔ جو کشمیر کے حیوانات کی خاص واقفیت اور ان سے دلچسپی رکھتے تھے۔ پرندوں میں ایسے پرندے بھی شامل ہیں جو سردی کے ایام میں وسط ایشیا اور سابیریا سے وارد کشمیر ہوتے ہیں۔ یہ گیلری سکولی بچوں کے لئے کافی دلچسپی کی باعث ہے۔

☆☆☆

براری نمبل منگلیشور مندر

براری نمبل مولانا آزاد شاہراہ کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ دلدل پانی کا ذخیرہ ہے۔ جو سرینگر کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہ نمبل جھیل ڈل کے ساتھ ناؤپورہ رعناواری نہر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ مشہور نالہ مار بھی اسی سے نکلتا تھا۔ براری نمبل کے مغرب کی طرف مشہور باغ دلاور خان ہے۔ یہاں سے نالہ مار سانپ کی مانند بہتا تھا۔ لہٰذا اس کا نام ماریعنی سانپ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ براری نمبل سرینگر اور جھیل ڈل کے نزدیک والے دیہات کے درمیان اندرونی آمدورفت کے لیے اہم ذریعہ ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس اندرونی راستے نے جھیل ڈل کے ساتھ مواصلات خاص کر جھیل کے مختلف پیداوار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے آسانی پیدا کی تھی۔ چودھویں صدی تک ڈل کا پانی ناؤپورہ سے براری نمبل بڈیار حبہ کدل سے بہتا ہوا دریائے جہلم میں جا گرتا تھا۔ پھر بڈشاہ نے اس میں مٹی اور پتھر ڈلوا کر اس جگہ کو پر کیا۔ اس کے بدلے براری نمبل سے آنچار جھیل تک ایک نئی نہر نکالی۔ بڈشاہ کی تعمیر کردہ اس نہر کو نالہ مار سے یاد کیا جاتا ہے،۔ براری نمبل شہر کی اندرونی آمدورفت کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ ڈل کی تمام پیداوار ستھو سرینگر کے ہر گلی کوچہ تک بہ آسانی پہنچائی جاتی رہی ہیں۔ براری نمبل کی شاخیں شہر سرینگر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں

کی عدم موجودگی کی وجہ سے براری نمبل اور نالہ مار آمدورفت کا سب سے بڑ ا ذریعہ تھا۔ اکثر عمارتیں براری نمبل کے کناروں پر تعمیر کی گئیں خاص کر خواجہ سلام شاہ کی حویلی جس میں ایک باغ تھا اور باغ میں مختلف اقسام کے خوب صورت پھول لگے ہوئے تھے۔ خاص کر گل لالہ Tulip کے پھول تھے۔ جن سے باغ کی رونق دوبالا ہوئی تھی۔ براری نمبل کے کنارے کچھ محلے جن میں ناؤ پورہ، خانیار کاوج محلہ شہلی ٹینگ، باغ دلاور خان، نائد کدل، کلاش پورہ قابل ذکر ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے براری نمبل کا پانی گہرا اور شفاف ہوا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں گہرائی اور چوڑائی کم ہونے اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے شہر کا سارا کوڑا کرکٹ اس میں جمع رہتا تھا۔ جس وجہ سے اس خوبصورت پانی کا یہ ذخیرہ حفظان صحت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ بدقسمتی سے ۱۹۷۰ء میں اس خوبصورت نالہ مار کو مٹی سے برائی کر کے پُر کیا گیا اور اس پر سڑک تعمیر کی گئی۔ وقت گزرنے پر براری نمبل کو ختم کرنے کا حکومتی فیصلہ وقت نے غلط ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ مغل بادشاہوں اور سرداروں نے وادی کشمیر کے مختلف علاقوں کے ساتھ ساتھ شہر سرینگر میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑ دی ہیں جن میں بارہ دریاں اور باغات۔ خاص کر نشاط باغ شالیمار باغ، چشمہ شاہی، پتھر مسجد، باغ دلاور خان وغیرہ شامل ہیں۔ باغ دلاور خان گورنر دلاور خان نے اپنے نام پر بنوایا۔ جو ۱۶۱۸ء سے ۱۶۲۰ء تک جہانگیر بادشاہ کے عہد حکومت میں کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ یہ باغ دل کو فرحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ جو براری نمبل کے کنارے پر واقع تھا۔ اور اس میں چنار کے بڑے بڑے درخت لگے تھے۔ پگڈنڈیوں کے ساتھ

ساتھ سرو کے درخت اور پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ باغ کے سامنے ایک چھوٹی سی جھیل جس کو براری نمبل جھیل کہتے تھے جو کافی دلفریب تھی۔اور یہاں پر موجود پرندوں کی چہچہاہٹ دل کو راحت پہنچاتی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ نے باغ میں ایک سکول بنوایا۔اور اسی کو آج باغ دلاور خان سکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو سرینگر میں ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے۔ یہ کشمیر کا پہلا سرکاری سکول تھا جس میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔اس سے پہلے کشمیری طلبا مکتبوں اور پاٹ شالوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔سکھ اور ڈوگرہ دور کے اوائل میں جو یورپی و برطانوی سیاح کشمیر آتے وہ اسی باغ میں قیام کر کے کشمیر کی خوب صورتی کا لطف اٹھاتے تھے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق بھگوان شیو ہمیشہ محتاجوں اور مفلسوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ منگلیشور کے روپ میں انسانیت کی خدمت کرتے تھے۔شیو اور پاروتی جب کشمیر کا رخ کرتے ہیں تو یہاں روحانی بحث کرتے ۔اپنے بحث میں وہ بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے اقدام اٹھاتے ۔ پاروتی نے شیو سے کشمیر کے مذہبی مقامات کے متعلق جانکاری حاصل کی اور ان کی مذہبی اہمیت خاص کر منگلیشور تیرتھ جو ایک جزیرہ پر واقع ہے کے متعلق معلومات حاصل کیں یہاں پر ارد گرد کافی دلکش فِضا ہے۔ پاروتی نے یہ تیرتھ پہلے بھی دیکھا تھا اور اس کی خوبصورتی و ماحول سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ شیو جی سے اس کے متعلق مزید جاننا چاہتی تھی۔شیو جی نے اس تیرتھ کے متعلق بتایا کہ کشپ ریشی جس نے کشمیر سے پانی نکال کر لوگوں کا زندہ رہنا آسان بنا دیا۔انہوں نے راکھشس جل بو

دیو کو مارا اس کا ایک فرزند تھا جس کا نام نمچی تھا۔ وہ بڑا طاقتور مکار دھوکہ باز اور شریر تھا۔ اس نے اپنے ظالمانہ رویہ سے لوگوں کو تنگ کیا۔ لہٰذا دیوتاؤں نے اندرا سے گزارش کی کہ وہ اس کا خاتمہ کرائیں۔ اندرا کی عبادت سے شیو متاثر ہوا اس نے اپنے آپ کو اس جگہ منگلیشور بہرو کے روپ میں تبدیل کیا جہاں اندرا نے عبادت کی تھی۔ آج اس جگہ پر مندر ہے۔ شیو جی سے آشیرواد (نروان) ملنے کے بعد اندرا نے نمچی کو للکارا۔ آخر کار ایک خونریز لڑائی میں نمچی مارا گیا۔ اور اندرا فتحیاب ہوئی۔ فتحیابی کے بعد اندرا نے شیو جی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نہ مل سکا۔ اس کو اس بات سے حیرانی ہوئی کہ جس جگہ پر شیو نے اندرا کو آشیرواد دیا تھا۔ اس جگہ پر ایک درخت تھا۔ اس نے اسی درخت کو شیو مان کر اس کی پرستش کی۔ ساتھ ہی لوگوں نے اسے منگلیشور بہرو مان کر اس کی پوجا کی۔ اس علاقے کے لوگ بیساکھ پچھمی میں اس مندر جو جزیرہ میں ہے کی عبادت کرتے ہیں اور ہون رچا کر پھول پیش کرتے ہیں پہلے چاول (تہری) پرشاد کے طور لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں اس مندر کا نام منگلیشور مندر ہے۔ سرینگر کے پنڈت اس مندر کا کافی احترام کرتے ہیں۔ اور اس کی روحانی عظمت کے قائل ہیں۔ اس مندر نے سیلاب کی تباہ کاریاں بھی دیکھی ہیں۔ لوگ زمانہ قدیم سے اس مندر میں آ کر پوجا پاٹھ کرتے رہے ہیں۔ یہ راز شیو جی نے پاروتی کو اس مندر کے متعلق بتایا کشمیری پنڈت برادری پراتھنا کرتے ہیں کہ شیو جی بحیثیت منگلیشور یہاں کے لوگوں کو امن خوشحالی اور ترقی کا پیغام دے۔

☆☆☆

ریذیڈنسی ایمپوریم گارڈن

بیعہ نامہ امرتسر کے ذریعے انگریزوں نے پورے کشمیر کا علاقہ ۱۸۴۶ء میں ڈوگرہ خاندان مہاراجہ گلاب سنگھ کو ۷۵ لاکھ روپے کے عوض فروخت کیا۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر میں ڈوگرہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔

اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر حکومت برطانیہ نے یہاں اپنے نمائندے مقرر کیے۔ ساتھ ہی کشمیر آنے والے برطانوی افسروں اور عام باشندوں کو خصوصی مراعات بھی حاصل ہو گئے ان برطانوی افسروں کا کام مہاراجہ کی کارکردگی اور انگریزی سرکار کے مفادات کی نگہداشت کرنا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرینگر میں برطانوی باشندوں کے علاوہ فوجی و سول افسروں کے لیے کئی کالونیاں معرض وجود میں آئیں۔ چنانچہ برطانوی حکمرانوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ۱۸۸۵ء میں کشمیر دربار کے لیے اپنا نمائندہ یا ریذیڈنٹ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں مقرر کیا۔ جس کے اختیارات کافی وسیع تھے۔ وہ مہاراجہ اور اس کے اہلکاروں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ ادھر سے وسط ایشیا میں روس کی پیش قدمی کی وجہ سے انگریز سرکار سخت فکرمند ہوئی۔ کیونکہ وسط ایشیا کشمیر کا قریب ترین ہمسایہ ہے۔ لہٰذا برطانوی نمائندہ یا رزیڈنٹ کی رہائش کے لیے دریائے جہلم

کے دائیں کنارے پر رام منشی باغ کے نزدیک ایک خوب صورت عمارت تعمیر کی گئی۔ جس کا نام ریذیڈنسی رکھا گیا، جو ایک خوب صورت باغ کے وسط میں تعمیر کی گئی۔ ریذیڈنسی کا یہ باغ سرینگر کے خوب صورت ترین باغوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ باغ میں بڑے بڑے چنار کے درخت موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اقسام کے پھول بھی باغ میں اُگائے گئے جن سے باغ کی خوبصورتی دوبالا ہوئی ہے۔ ریذیڈنسی کی یہ عمارت دومنزلہ ہے۔ اس میں اندر اور باہر آنے جانے کے لیے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ مغرب کی طرف سے اور دوسرا مشرق کی طرف سے کھلتا ہے۔ اس عمارت کی بناوٹ برطانیہ کے طرز تعمیر کی ہے۔ مغربی دروازہ دومنزلہ ایک چھوٹی عمارت کے اندر ہے۔ جو مستطیل شکل کی ہے۔ عمارت کی پہلی منزل میں کئی کمرے ہیں اور کچھ محراب بھی۔ کمروں کی چھتوں پر ختم بند لگا ہوا ہے۔ مشرقی دروازہ عبداللہ برج کی طرف ہے یہ دروازہ ایک منزلہ عمارت کے اندر ہے۔ دروازہ کے دائیں بائیں دو کمرے ہیں ان کمروں کی چھتوں میں ختم بند لگا ہوا ہے۔ آج کل یہ کمرے سیکورٹی فورسز استعمال کر رہے ہیں۔ باغ کے اندر ایک صوفی بزرگ سید علی اکبرؔ کا روضہ شریف واقع ہے۔ جہاں عقیدت مند حاضری دینے آتے ہیں۔

کشمیر میں برطانوی ریذیڈنٹوں میں اعلیٰ پایہ کے انجینئر، ماہرین تعمیرات، بجلی اور ریلوے انجینئر ہوئے ہیں۔ جنہوں نے سرکاری ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی ثقافت زبان اور تاریخ کے تئیں خاصی

دلچسپی دکھائی۔ سرینگر میں برطانوی افسران۔ رام منشی باغ، امر سنگ بلڈنگ اور ریذیڈنسی روڑ علاقوں میں رہائش پذیر تھے۔ جہاں ان کے دفاتر بھی تھے۔ کشمیر میں جو زیادہ مشہور ریذیڈنٹ رہتے تھے ان میں سر فرانس، ینگ ہسبنڈ اور مسٹر بوٹ قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں اس عمارت کو جموں و کشمیر سرکار نے اپنی تحویل میں لے کر اس میں آرٹس ایمپوریم قائم کیا اور اس میں کشمیر کی مشہور دستکاریاں رکھی گئیں۔ کشمیر کے تاجروں نے بھی یہاں اپنا مال فروخت کے لیے رکھا۔ ریاستی سرکار کی طرف سے بھی آرٹس ایمپوریم کی اس عمارت میں مختلف قسم کی دستکاریوں کا سامان بیچنے کے لیے رکھا گیا۔ جس سے یہاں کے کاریگروں کی معاشی حالت سدھر گئی۔ آرٹس ایمپوریم کی شاخیں آج کل ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا سہرا کشمیر کے مایہ ناز سپوت خواجہ احسن اللہ کے سر باندھا جاتا ہے۔

'شاہراہ ابریشم' کا کشمیر سے عظیم تاریخی وتمدنی رشتہ

شاہراہ ابریشم براعظم ایشیاء کو براعظم یورپ سے ملاتی تھی۔اس کے ذریعہ نہ صرف ، ریشم ،سونا اور قیمتی پتھروں کا درآمد و برآمد ہوتا تھا، بلکہ اس کے ذریعہ تہذیب وتمدن کا تبادلہ ہوتا تھا۔ یہ شاہراہ مشکل ترین پہاڑوں، ریگستانوں اور بیابانوں سے گذرتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کشمیراور ہندوستان کے بدھ بھکشوں اسی راستہ سے بدھ مذہب کا پرچار کرنے کے لئے افغانستان وسطی ایشیاء اور چین جاتے تھے۔ جہاں پر انہوں نے بُدھ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ کشمیر کے لوگ چینیوں، یونانیوں اور مصریوں سے گل مل گئے اور ان ملکوں کے تہذیب وتمدن کا اثر کشمیر کے مندروں، خانقاہوں، مسجدوں پر پڑا جس کے نقوش آج بھی پری ہاس پورہ، مارتنڈ (اسلام آباد) اوراونتی پورہ کے آثار قدیمہ میں نظر آتے ہیں۔اس شاہراہ سے نہ صرف بُدھ مذہب بلکہ کچھ صدیوں بعد عیسائیت بھی وسطی ایشیا اور شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ ۵۹۷ قبل مسیح میں ملک جوڑا کو بابل کے بادشاہ نے مسمار کردیا، اس کے بعد بہت سارے اسرائیلی شاہراہ ابریشم سے ایران،

افغانستان اور بخارا بھاگ گئے اور یہاں پر سکونت پذیر ہو گئے۔ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے بعد واپسی پر کچھ یونانی سپاہ سالاروں کو شاہراہ ابریشم کے نزدیک نگاہ بانی کے لئے مقرر کیا۔ آٹھویں اور نویں صدی میں کشان خاندان نے وسط ایشیا کے بہت سارے علاقوں پر قبضہ کرلیا جن میں خاص طور پر کاشغر، یارقند، ختن، کابل اور کشمیر قابل ذکر ہیں۔ مہاراجہ کنشک کے وقت میں بدھ مت کشمیر میں بے حد مقبول ہوا۔ بدھ مت کی چوتھی کانفرنس ہارون کشمیر میں منعقد ہوئی اور ایک نیا فرقہ 'مہایان'' وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد بہت سارے کشمیری بدھ بکشوں شاہراہ ابریشم سے وسط ایشیاء بدھ مت پھیلانے کے لئے چلے گئے۔ ورچنا پہلا کشمیری تھا جس نے ختن میں پہلا بدھ وی ہار قائم کیا۔ شاہراہ ابریشم سے بدھ مت پھیلانے کے لئے کشمیری بھکشو چین تک چلے گئے جن میں خاص طور پر کمارجیوا قابل ذکر ہے۔ کشمیر کی صنعت وحرفت شاہراہ ابریشم کے توسط وسط ایشیا تک پھیل گئی۔ اس وقت بھی کشمیری صنعت وحرفت کے آثار ختن اور کاشغر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ سب کام کشمیری کاریگروں نے سرانجام دیا۔ کشمیری آرٹ کو کسی وقت گندھار آرٹ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ رنگین ٹائلیں مٹن، ہارون میں دریافت ہوئی ہیں، ان میں جو تصاویر ہیں ان میں بھی وسطی ایشیاء کا تہذیب وتمدن نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ للتہ دتیہ (۷۶۵-۷۲۵ء) کے وقت میں کشمیر اور وسطی ایشیاء کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ شاہراہ ابریشم کی تین شاخیں تھیں جو ان شاہراؤں کو کشمیر سے ملاتی تھیں۔ ایک راستہ قرا

قرم پہاڑ پار کر کے نوبرا وادی پہنچ کر لداخ تک آتا تھا پھر وہاں سے سرینگر پہنچتا تھا۔ دوسرا راستہ گلگت سے ہوتا ہوا گریز، بانڈی پورہ اور پھر سرینگر سے ملتا تھا۔ تیسرا راستہ افغانستان سے مظفر آباد ہوتا ہوا کشمیر پہنچ جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے بعد یہ راستے بند ہو گئے۔

چین میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد بہت سارے مسلمان پناہ گزین جو کہ چینی ترکستان میں قیام پذیر تھے، قراقرم پہاڑ پار کر کے سرینگر پہنچ گئے یہاں سے وہ ترکی کے لئے روانہ ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے تبت پر قبضہ کیا تو بہت سارے تبّتی مسلمان جن کے آباد واجداد کشمیری تھے، واپس کشمیر آ گئے اور اس وقت بھی ان کی کالونیاں عیدگاہ اور حول سرینگر میں ہیں۔ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں اس وقت بھی گاڑیاں گلگت سے کاشغر جاتی ہیں۔ اگر سرینگر میں بھی ایسے اقدامات کئے جائیں تو سرینگر سے کاشغر تک بسیں اور ٹرکیں تین چار دنوں میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جایا کریں گی۔ جولائی ۲۰۰۹ء میں جب تاجکستان کے سفیر کشمیر یونیورسٹی سرینگر آئے تو انہوں نے وعدہ کیا کہ سرینگر سے تاجکستان ''کولاب'' تک ہوائی سروس شروع کی جائے گی جہاں پر کہ حضرت امیر کبیرؒ کا روضہ شریف ہے۔ ہندوستان کی صدر پرتیبھا پاٹل کولاب تشریف لے گئی جہاں انہوں نے حضرت امیر کبیرؒ کے روضہ شریف پر حاضری دے کر خراج عقیدت پیش کیا۔ کہ حضرت امیرؒ نے ہی کشمیر میں لوگوں کو دین اسلام سے روشناس کیا۔

شاہراہ ابریشم کا اثر کشمیر کے سیاسی، سماجی اور مذہبی اداروں پر بھی پڑا۔ جتنے

بھی صوفیائے کرام کشمیر تشریف لائے، وہ تقریباً شاہراہ ابریشم سے ہی کشمیر میں وارد ہوئے۔ بلبل صاحبؒ، جو ترکستان سے کشمیر تشریف لے آئے، ریچن شاہ، جو کہ بدھ مذہب کا پیرو کار تھا۔ ان کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوا اور کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ بنا جن کا نام صدر الدین رکھا گیا۔ اس کے علاوہ میر سید علی ہمدانیؒ، سید تاج الدینؒ، سید حسین سمنانیؒ اور میر محمد ہمدانیؒ نے بھی شاہراہ ابریشم سے ہی کشمیر وارد ہو کر تبلیغ اسلام کا کام سرانجام دیا۔ سلاطین کشمیر کے وقت میں فارسی کشمیر کی سرکاری زبان بن گئی اور برہمنوں نے بھی فارسی زبان سیکھ لی۔ آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے کشمیری پنڈت فارسی میں شعر و شاعری بھی کرتے تھے اور ان کو حافظ، سعدی، عطار، خسرو اور جامی کے اشعار یاد ہوتے تھے اور اسی طرح آہستہ آہستہ کشمیری برہمن اسلام سے متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ مذہب قبول کیا۔ سلطان بڈشاہ (۷۰-۱۴۲۰ء) خود ۷ سال سمرقند میں امیر تیمور کے پاس رہے اور وہاں سے کاریگر لائے جنہوں نے یہاں کے لوگوں کو پیپر ماشی، شال بافی، نمدہ سازی وغیرہ کے ہُنر سکھائے۔ مزید آپ نے دو کشمیریوں کو سمرقند روانہ کیا تاکہ وہ وہاں سے دستکاریاں وغیرہ سیکھ لیں۔

کشمیری بہت حد تک وسطی ایشیاء ایران کے صوفیوں سے متاثر تھے۔ پرانے وقتوں سے کشمیر شاہراہ ابریشم کا ایک حصہ تھا، سماجی، اقتصادی، جغرافیائی، مذہبی طور پر ہم وسطی ایشیاء کا ایک حصہ ہے نہ کہ جنوبی ایشیاء کا۔ شاہراہ ابریشم ایک عظیم شاہراہ تھی جو کہ یورپ کو ایشیاء سے ملاتی تھی۔ اس

شاہراہ پر جو بھی شہر آتے تھے وہ تہذیب وتمدن میں بہت آگے بڑھ گئے تھے جن میں خاص طور پر کیوا، ختن، کاشغر، یارقند، سمرقند، بلخ، بخارا، تہران، مشہد، بغداد ہمدان، یروشلم قابل ذکر ہیں۔ چینی سیاح ہیون سانگ اسی راستہ سے کشمیر آیا۔ کشمیری شہتوس، اون یارقند اور کاشغر سے کشمیر لاتے تھے۔ وسطی ایشیاء کے تاجروں کے لئے سرینگر میں صفا کدل کے نزدیک ایک سرائے تھی جس کا نام یارقند سرائے ہے جو وسطی ایشیاء کے قافلوں کا مرکز رہی ہے۔ آج یہ عمارت خستہ حالت میں ہے۔ مغل دور میں یہ ایک تجارتی پڑاؤ تھا لیکن اب ہندوستان کے بٹوارے کے بعد اس کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔ یارقند سرائے کشمیر اور وسطی ایشیاء کے درمیان تجارتی روابط کا واحد مرکز تھی۔ یہاں پر خرید و فروخت کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ یہ سرائے مغل حکمرانوں اور ڈوگرہ حکومت میں بھی پھر سے تعمیر ہوئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں سیف خان جو کہ کشمیر کا گورنر تھا نے یارقند سرائے کے نزدیک صفا کدل پل تعمیر کیا تا کہ تجارتی قافلے لداخ اور گلگت سے گاندربل اور صورہ سے ہوتے ہوئے عید گاہ اور صفا کدل پار کر کے سیدھے یارقند سرائے پہنچ سکیں۔ کشمیر میں وسطی ایشیاء سے ریشم، قالین، چاندی، مونگا، چمڑا، کھالیں، خشک میوہ، کشمش درآمد ہوتے رہے اور پھر کشمیر سے ان چیزوں کو پنجاب برآمد کیا جاتا تھا۔ کشمیر میں اُس وقت یارقندی گھوڑوں کی بڑی مانگ ہوا کرتی تھی جن کو تاجر عید گاہ کے سرسبز میدان میں رکھتے تھے۔ جرمن سیاح بیرن جو سکھ دور میں کشمیر آیا۔ (۱۸۴۶-۱۸۱۹ء) کے مطابق چین، تبت، یارقند، بخارا اور وسطی ایشیاء

ممالک کے ساتھ کشمیر کی تجارت کا سلسلہ بہت اچھے طریقے پر قائم تھا۔
دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) کے دوران ان تجارتی راستوں کو
بند کیا گیا جس سے صدیوں پرانے تجارت کو دھچکا لگا۔ خاص کر شال اور نمدہ
سازی کی صنعت کو کشمیر میں زوال آگیا۔ کیونکہ کشمیر میں سارا خام مواد ان ہی
راستوں سے آتا تھا اور اسی طرح یارقند سرائے بھی زوال پذیر ہوئی۔ مزید
بہت سارے یارقندیوں کی شادیاں کشمیری گھرانوں میں ہوئیں اور سرائے
کے نزدیک حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ کی جو خانقاہ موجود ہے۔ اس کے ملحق
مزار میں بہت سارے وسطی ایشیاء کے تاجر سپرد خاک ہیں۔ یارقند کے لوگ
زیادہ تر نان کباب کھانا پسند کرتے ہیں اور کشمیر میں بھی اس کا کاروبار کرتے
تھے۔ اب اس یارقند سرائے میں نہ تو تجارتی چھل پہل ہے اور نہ وہ محفلیں لگتی
ہیں، سرائے اب خستہ حالت میں ہے۔ وسط ایشیائی خاندان اب بھی اس
سرائے میں غریبی اور کسمپرسی کی حالت میں سکونت پذیر ہیں۔

اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر
(میر واعظ رسول شاہ صاحب)

کسی قوم اور ملک میں ایک ایسے انسان کا وجود جس کی نظر مستقبل کے حالات پر ہو۔ خدا کی ایک عظیم نعمت سے کم نہیں ہندوستان میں اس کی مثال سرسید احمد خان اور الطاف حسین حالیؔ کی ذاتیں ہیں۔ اور کشمیر میں ایسی میر واعظ رسول شاہ صاحب کی صورت میں ملتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مغل سلطنت زوال پذیر تھی اور انگریزی تہذیب عروج پر تھی۔ مستقبل میں وہی قوم زندہ رہ سکتی تھی جو زمانے کا ساتھ دیتی۔ سرسیدؔ، حالیؔ اور مولانا رسول شاہ نے اس حقیقت کو سمجھا۔ کشمیر میں انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کا قیام جو کہ مولانا رسول شاہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ جب آپ کا نام لیا جاتا ہے تو نہ صرف مذہبی عالم کی حیثیت سے بلکہ دینی و دنیاوی امور میں بھی آپ ایک رہبر اور رہنما کی حیثیت سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ مسلمانوں کے لئے جدید اور مروجہ انگریزی تعلیم کے پیشرو تھے۔ قدیم تعلیم کے ساتھ آپ نے جدید تعلیم کی بھی بھرپور وکالت کی۔ ۱۸۵۷ء میں مغل حکومت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی حالت دگرگوں ہوگئی اور

انگریزی تعلیم سے وہ دور ہونے لگے تو سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم پڑھنے کے لئے کہا اور پوری قوم میں تعلیمی بیداری کی تحریک شروع کی جس سے کئی دانش کدے وجود میں آئے۔ اس علمی تحریک کی ایک کڑی سرینگر میں اسلامیہ ہائی اسکول کی صورت میں سامنے آئی۔

اس وقت سرینگر میں عیسائی مشنریوں کی تحریک زوروں پر تھی۔ مولانا رسول شاہ میر واعظ کشمیر نے محسوس کیا کہ سرینگر میں ایک اسکول قائم کیا جائے تاکہ کشمیری طالب علم مروجہ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی حاصل کریں۔ تاکہ مسلمانوں کی اپنی عظمت برقرار رہ سکے جس کا واحد ذریعہ حصول تعلیم تھا۔ مولانا رسول شاہ صاحب ۱۸۵۴ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ مولانا ایک بہت بڑے عالم، واعظ اور ایک اُستاد تھے۔ اور اپنی پوری زندگی آپ نے اسلام کی خدمت کی ہمیشہ لوگوں کو قرآن وسنت کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ نے اپنے بزرگوں کی تقلید کی اور مسلمانوں میں جو سماجی بُرائیاں تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے ۱۸۸۹ء میں انجمن نصرت اسلام کی بنیاد کشمیر میں ڈال کر زندگی کا بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ایک تعلیمی ادارہ کھولا تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی کمزوریاں دور ہوں آپ نے یہ محسوس کیا تھا کہ کشمیری مسلمان صدیوں سے بیرونی قبضے میں رہے ہیں اور وہ سماجی، اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔ پہلے آپ نے ایک پرائمری اسکول کھولا جس میں ایک قابل اُستاد حسن شاہ وفائی اسکول کا سربراہ مقرر ہوا۔ پہلے پہل حکومت کی طرف سے اس کو کوئی مالی مدد نہیں ملی۔ بلکہ مولانا

اور اس کے دوست اپنے جیب سے اسکول کا خرچہ برداشت کرتے تھے۔
اس کے بعد آپ نے مڈل اسکول کھولا مالی مشکلات کے باوجود آپ نے یہ
کام بڑی ہمت سے سرانجام دیا۔ اس کے علاوہ آپ کو کچھ ناعاقبت اندیش
لوگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جو آپ کے اس کام کی مخالفت کرتے تھے۔ آخر کار
آپ کی انتھک کوششوں سے یہ ادارہ ۱۹۰۵ء میں اسلامیہ ہائی اسکول بنا۔
تب سے آج تک سینکڑوں طلباء اس ادارے سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔
مولانا صاحب بڑے دوراندیش تھے اور قدرت نے ان کو ہمت اور جرأت
دی تھی۔ آپ کو دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ سے نفرت تھی۔ آپ کا یہ تعلیمی طریقہ کشمیر
میں بڑا مقبول ہوا اور اسلامیہ اسکول کی شاخیں سرینگر کے بہت سارے
علاقوں میں قائم ہوئیں اور جنوبی کشمیر میں اسلام آباد، اور بجبہاڑہ میں بھی
نصرت الاسلام کے مدرسے قائم ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں آرینٹل کالج قائم ہوا۔
جس میں قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم دی گئی۔ اور یہاں پر مولوی، مولوی
عالم، منشی عالم اور منشی فاضل نصابوں کی تعلیم دی گئی۔ یہ تعلیمی ادارے کشمیر میں
بڑے مقبول ہو گئے۔ اور طالب علم ان اسکولوں میں داخلہ لینے میں فخر محسوس
کرتے تھے تعلیم جدید کے سلسلے میں مولانا رسول شاہ کو سرسید کشمیر سے یاد کیا
جاتا ہے۔ انجمن نصرۃ الاسلام مولانا رسول شاہ مرحوم کا ایک عظیم ناقابل
فراموش کارنامہ ہے اُس وقت ان پڑھ لوگ کہتے تھے کہ انگریزی پڑھنے
والے طالب علم عیسائی بن جاتے ہیں۔ اسلامیہ اسکول میں پڑھنے سے
طالب علموں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا مرحوم رسول شاہ صاحب کو

اسلام سے واقفیت کے علاوہ سیاست، سخاوت اور تاریخ پر بھی گہری نظر تھی۔
اس ادارہ سے فارغ ہوکر کشمیری بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز
ہو گئے۔ ڈاکٹرس، انجینئرس اور پروفیسرس بن گئے۔ جموں کشمیر کے تین
وزرائے اعلیٰ اس اسکول کے پرانے طالب علم ہیں۔ خاص طور پر شیخ محمد
عبداللہ، سید میر قاسم، مفتی محمد سید، ماہر تعلیم، خواجہ غلام احمد عشائی قابل ذکر
ہیں۔ اس اسکول میں قابل اور تجربہ کار استاد تعینات تھے۔ خاص طور پر محمد
عاصم، محمد جعفر جو بیرون ریاست کے تھے۔ شام لعل مدن، مولوی محمد حسن،
مفتی جلال الدین، مفتی غلام الدین سعد الدین چستی۔ اس وقت محمد ابراہیم
شاہ جنرل سکریٹری اسکول کا نظم نسق بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتے
ہیں۔ مسلمانان کشمیر طرح طرح کی فضول رسم و رواج میں مبتلا ہوئے تھے۔
مولانا نے ایک مہم کے ذریعہ بہت حد تک ان رسموں کا خاتمہ کیا۔ لوگوں کو
شادی بیاہ کے موقع پر رسومات بے جا سے بچنے کی تلقین کرتے۔ مولانا کی
ذاتی آمدنی کا بیشتر حصہ یتیموں، بیواؤں کی دستگیری پر خفیہ طور پر صرف ہوتا۔
میر واعظ نے عالی مسجد اور جامع مسجد و دیگر مساجد کی مرمت کا بھی بیڑا اُٹھایا
آپ عربی فارسی کے بڑے عالم تھے۔

آخر کار میر واعظ رسول شاہ صاحب ۱۱ رجب ۱۳۲۷ھ یعنی ۳۰ جولائی
۱۹۰۹ء خدا کو پیارے ہو گئے۔ آپ کو اپنے آبائی مقبرہ ملہ کھاہ میں سپرد خاک
کیا گیا۔ آپ کی وفات پر ہیڈ ماسٹر صادق علی کا یہ مرثیہ ہے

تسکین و تعلیم رضا
علم و عمل صدق و صفا
ہم زینت اہل ذکا
بے سر شد ندا ز بس جفا

اسی دور میں خاندان سادات کے ایک مقتدر علمی و سماجی، سیاسی و مذہبی شخصیت آغا سید حسین جلالی جنہوں نے تحریک آزادی کشمیر میں نمایاں رول ادا کیا۔ نے بھی جڈی بل میں مروجہ تعلیم کے لئے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی جو آج امامیہ ہائی اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جہاں سے ریاست کے بڑے بڑے رہنماؤں اور اعلیٰ انتظامی افسروں نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ مفلوک الحال لوگوں کے بچوں کو مذکورہ اسکول میں مفت تعلیم دی جا رہی ہے۔

بسکو میموریل اسکول امیراکدل سرینگر

بسکو صاحب کشمیر میں بسکٹ صاحب کے نام سے مقبول ہیں۔
آکسفورڈ کے ہاٹسن نامی گاؤں جو برطانیہ میں واقع ہے ۱۸۶۳ء میں پیدا
ہوئے۔ایک خداترس گھرانے میں پلے بڑھے بسکو کی دلی تمنا غریبوں کی
خدمت کرنا اور بدی کا خاتمہ کرنا تھا موصوف پر افریقہ میں کام کرنے کی دھن
سوار تھی۔لیکن کشمیری عوام کی خدمت کرنا ان کا مقدر تھا۔آپ ۱۸۹۰ء میں
کشمیر آئے یہاں انہوں نے نولز سے مشن اسکول کا چارج لیا۔ یہ مدرسہ فتح
کدل میں واقع تھا۔آپ نولز کے ہمراہ سرینگر کے اندرونی علاقے میں گئے
اور وہاں سے فتح کدل اسکول گئے۔آپ نے دیکھا کہ سرینگر شہر گندگی اور
بدبو سے بھرا پڑا تھا کوچے اور سڑکیں تنگ تھیں۔کئی گھر میں چمنی یا شیشے کی
کھڑکیاں موجود نہیں تھیں۔جب آپ پہلی دفعہ کلاس روم میں داخل ہوئے۔
تو آپ نے دیکھا سب لڑکے جو کہ برہمن تھے پھرن اور کانگڑی لے کر تھے۔
یہ موسم سرما تھا کلاس روم کی کھڑکیاں بند تھیں۔تقریباً سب لڑکے شادی شدہ
تھے۔ان کے ماتھے پر بڑا ٹیکہ لگا ہوا تھا بہت لڑکوں کو کانوں میں بالیاں
تھیں۔ناخن بہت لمبے تھے۔بہت سارے لڑکے گنجے تھے۔مسلمان اس
وقت اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیجتے تھے۔

مشن اسکول کے کھلنے سے پہلے کشمیری ہندوؤں اپنے بچوں کو پاٹ شالوں اور مسلمان اپنے بچوں کو دینی درسگاہوں میں بھیجتے تھے وہاں پر وہ سنسکرت، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بسکو نے کشمیر میں رہ کر خدمت خلق کو اپنا نصب العین بنایا آپ نے ایسے انسان تیار کئے جنہوں نے دیانتداری کو اپنا عظیم اصول بنایا۔ غیر اخلاقی طریقہ کار پر موت کو ترجیح دی۔ بسکو نے تعلیمی نظام کو مغربی طرز پر لایا۔ طلباء کو صاف وردی پہننے، بالوں کو صاف رکھنے اور ناخون کی صفائی کا عادی بنایا۔ اور یکساں وردی استعمال کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے وقت کی پابندی اور بلند خیالی پر زور دیا۔ اننت ناگ، رعناواری، نواکدل حبہ کدل، امیرا کدل میں مڈل اسکول قائم کئے اور فتح کدل میں ایک سنٹرل ہائی اسکول قائم کیا۔

بہرکیف اسکولوں کا ایک جال وادی میں بچھایا گیا جس میں جسمانی ورزش، کرتب بازی، ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ جیسے کھیلوں سے طلباء کو روشناس کیا گیا۔ انہوں نے کشتیوں کا ایک بیڑا حاصل کر کے جھیل ڈل کی سطح پر آبی کھیلوں کو رائج کیا۔ آج کل کے تعلیمی اداروں میں طلباء کی کارگذاری کی رپورٹیں اصل میں مسٹر بسکو کی مرہون منت ہیں۔ جنہوں نے پہلی بار کشمیر میں کریکٹر فارم سسٹم کو متعارف کرایا۔ جو ہر طالب علم کو سال میں دو بار دیا جاتا کشمیری طالب علم فٹ بال کو چھوتا بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ چمڑے کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ ان دنوں بچے کھڑاؤں اور لمبے پھرن پہن کر ہی کھیلا کرتے تھے۔ بسکو صاحب نے ان کو قمیض پہن کر فٹ بال کھیلنے پر آمادہ کیا جو ایک کٹھن

مرحلہ تھا۔ ان تمام اختراعات کی مخالفت نے ایک سنجیدہ صورت حال پیدا کی۔ لیکن اپنے آہنی عزم کی بدولت بسکو آگے ہی بڑھتے رہے اور فتح کدل میں واقع اسکول کے گیٹ پر یہ ماٹو لٹکایا۔ "وہ کہتے ہیں کیا کہتے ہیں۔ انہیں کہنے دو جو کہتے ہیں"۔ مسٹر بسکو نے طلباء کو کشتی رانی تیراکی دغوطہ زنی سکھانے کے علاوہ دوسروں کی جان بچانے کے طریقے بھی سکھائے۔ کشتی رانی اور تیراکی سکھانا بڑے سخت کام تھے۔ کشتی رانی کے لئے کوئی بھی چپو چلانے کے لئے سامنے نہ آتا تھا۔ لیکن بسکو نے ہوشیاری۔ لگن اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا اور طلباء کو چپو چلانے کشتی کھینچنے اور ڈوبنے والوں کو بچانے کے طریقے سکھائے ان ایام میں ڈوبنے والوں کو بچانے کے بجائے لوگ پولیس کی پکڑ دھکڑ کے خوف سے بھاگ جاتے تھے۔

کشتیوں کا اولین بیڑا جو کہ کشمیری پنڈتوں پر مشتمل تھا چپو چلانا یا ناؤ کھینچنا ایک ایسا پیشہ تھا جسے ہر شخص اپنی شان کے خلاف تصور کرتا تھا۔ چنانچہ جب یہ بیڑا امیرا کدل گھاٹ کے نزدیک پہنچا تو کشتی بانوں نے اپنے چہرے سفید چادروں سے چھپائے تاکہ وہ شرمندگی سے بچ جائے۔ مارچ کے دنوں میں جھیل ولر پر بارہ روزہ کیمپ کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ جہاں اسکولوں کے طلبا اور اساتذہ کشتی رانی میں شریک ہوتے اس کے بعد وہ جھیل میں تیرا کی بھی کرتے تھے۔ بہت سارے لڑکوں نے جھیل ولر بھی عبور کیا۔ لوگوں کا خیال تھا جھیل ولر بھوتوں اور جنوں کا مسکن ہے مگر مشن اسکول کے طالب علموں نے ان توہمات کو رد کیا اس کے بعد اساتذہ اور طلباء کو کوہ پیمائی کے لئے لیا

جاتا۔اور چوٹیوں کو سر کیا جاتا یہ چوٹیاں ان کے خیال میں بھوت پریت اور بدروحوں کا مسکن تھا۔لیکن بسکو صاحب نے یہ سوچ بدل کر رکھ دی اور ۱۹۳۴ء میں باضابطہ ایک کلب اس مقصد کے لئے قائم کیا گیا اس کشمیری کوہ پیما کلب (Kashmir Climbing Club) نے وادی کی تمام چوٹیوں کو ہی نہیں بلکہ بلند ترین چوٹیوں کو بھی سر کرلیا۔

بسکو صاحب نے اپنے طلبا میں یگانگت کا احساس پیدا کیا۔اور پرانے طلبا کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھے بسکو صاحب نے سماجی بھلائی کے کاموں پر بے حد زور دیا حیوانات کے تئیں ہمدردی کا جزبہ پیدا کیا اور طلبا میں آتشزدگی جو کہ ان دنوں سرینگر میں عام ہوا کرتی تھی کے موقعوں پر جذبہ خدمت اُبھارا۔

۱/ آپ نے اپنے اسکول میں بیمار حیوانات اور پرندوں کے لئے ایک گوشہ مخصوص رکھا۔

۲/ آگ بجھانے والے سامان کے لئے بھی ایک گوشہ رکھا تاکہ شہر میں کہیں آگ لگنے پر اس سامان کو استعمال کیا جاسکے۔بسکو کی عزت افزائی نہ صرف یہاں کے لوگوں بلکہ حکام نے بھی کی۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے جو ملاقات وائسرائے ہند لارڈ ویول کے ساتھ کی اس میں مرحوم بسکو بھی شامل تھے۔ہندو بیواؤں کی افسوس ناک حالت کو دیکھ کر آپ کے کہنے پر مہاراجہ کشمیر نے ۱۹۲۸ء میں ہندوں بیواؤں کی دوسری شادی کرنے کو جائز قرار دیا۔بسکو صاحب کے لئے یہ ایک خوشی کا

مقام تھا بسکو نے خدمت خلق کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس نے ایسے طالب علم پیدا کئے جنہوں نے دیانت داری کو اپنا عظیم اصول بنایا۔ اور غیر اخلاقی طریقہ کار پر موت کو ترجیح دی ان میں رعنا واری کے سیمل بقال اور لداخ کے چمت گرگن کی مثالیں قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۹۰ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک بسکو نے کشمیریوں کی خدمت میں ۵۷ سال کشمیر میں گزارے۔ آپ کی آخری خواہش تھی کہ آپ کی آخری آرام گاہ کشمیر میں ہی ہو لیکن آپ کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہوسکی۔ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو اکتوبر ۱۹۴۷ء میں سرینگر سے جنوبی افریقہ روانہ ہونا پڑا۔ جہاں پر آپ کے برادر قیام پذیر تھے۔ وہاں پر بھی آپ کو کشمیر کے پہاڑ، اور جھلیں یاد آتی رہیں۔ آخر کیم اگست ۱۹۴۹ء میں آپ کو موت نے اپنی آغوش میں لیا۔ آپ کو عیسائی قبرستان سیلس بری جنوبی افریقہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد جب انگریز ہندوستان سے چلے گئے کشمیر میں چرچ مشن کے سب اسکول بند ہو گئے۔ صرف امیرا کدل اسکول ابھی چل رہا ہے۔ جس کو سی ایم۔ ایس۔ ٹنڈل بسکو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بسکو کی قائم کردہ روایات اور اصول اب بھی اس اسکول میں باقی ہیں۔

نالہ مار کا تاریخی پس منظر

کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ مار یا امری لفظ کا تذکرہ سب سے پہلے جون راج اور شری ور کی کتابوں میں آتا ہے کلہن پنڈت مار کے بدلے ''مہاسرت'' لفظ لکھتا ہے۔ نیل مت پران میں تیل بل کے نالے کو مہوری کہا گیا ہے۔ مزید کشمیری ڈکشنری میں مار لفظ کا سرچشمہ مہاسد بتایا گیا ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے یہ کوہل (نالہ مار) ٹیڑھے انداز میں بہتی ہے اس لئے اس کا نام مار یعنی سانپ جیسی کوہل پڑا ہے انگریز عالموں نے اس لفظ کا ترجمہ (Serpent Canal) کیا ہے۔ بڈشاہ سے پہلے کشمیر کے مشہور انجینئر سویہ بانی سوپور نے آبپاشی کے جو اہم کام کشمیر میں سرانجام دئے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ مشہور تاریخ دان جون راج اور شری ور کی تاریخوں میں سلطان کے عہد کی تعمیر شدہ نہروں کی فہرست مل سکتی ہے جن میں قابل ذکر مارتنڈ کوہل، شاہ کوہل،۔۔۔ گنگا، نالہ پہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں سرینگر کی مار کنال ان سب میں مشہور رہے۔ یہ نہر سرینگر اور جھیل ڈل کے نزدیک والے دیہات کے درمیان اندرونی آمد ورفت کا اہم ذریعہ ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس اندرونی راستے نے جھیل کے ساتھ مواصلات خاص طور سے جھیل کی گوناگوں پیداوار کے انتقال کو آسان بنا دیا تھا۔

چودھویں صدی تک جھیل کا فالتو پانی حبہ کدل پل کے نزدیک دریائے جہلم میں گرتا تھا بڈشاہ کے انجینئروں نے اس کو بند کیا اس کے بجائے جھیل کے پانی کو بڈشاہ کے بنائے ہوئے نالہ مار کی طرف موڑ دیا۔

نالہ مار شہر سرینگر ہاری پربت اور دریا جہلم کے درمیان کے حصے کو آبپاشی فراہم کرتی تھی۔ نالہ مار کا منبع مشہور جھیل مار سر مانا جاتا ہے۔ مار کوہل کا پانی اچھی طرح سے نکل کر ہارون کے سر بند میں جمع ہو جاتا ہے جہاں سے اس کا ایک حصہ شہر سرینگر کو نلوں کے ذریعے بھیجا جاتا ہے مگر ہارون سے تھوڑا آگے اس کی ایک اور نہر شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں شالیمار تک نکالی گئی جس کو بعد میں آصف جاہ نے نشاط باغ تک پہنچا دیا۔ اصل مار کوہل ہارون کے جانب تیل بل سے گزر کر علاقہ حبک کے نزدیک جھیل ڈل میں جا گرتی ہے۔ جھیل ڈل سے نکل کر یہ پانی دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک حصہ ڑونٹھی کول کی طرف بہتا ہے جو بعد میں مائسمہ کے قریب بالمقابل شیر گڑھی محلات دریائے جہلم میں گرتا ہے یہاں پر بسنت باغ ایک خوب صورت باغ سکھوں اور ڈوگرہ حکمرانوں کے لئے ہوا کرتا تھا ان کی رانیاں اس باغ کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتی تھیں، دوسرا حصہ چودھویں صدی تک ڈل سے ناؤ پورہ براری نمبل، بڑی یار حبہ کدل سے بہتا ہوا جہلم کے ساتھ مل جاتا تھا بڈشاہ نے مٹی اور پتھر ڈلوا کر اس جگہ کو بند کر دیا اور ایک نئی نہر شہر بابا ڈیمب سے آنچار تک نکالی گئی۔ بڈشاہ کی تعمیر کردہ اس نہر کو نالہ مار سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کئی بادشاہوں نے علیحدہ شاخیں نکالیں

جن میں خانیار کوہل، دولت کوہل، کاوڈارہ کوہل اور تارہ بل کوہل قابل، ذکر ہیں۔ مار کوہل اسی حصہ نالہ مار کے نام سے مشہور تھی۔ یہ کوہل دلدلی علاقوں سے گزر کر آنچار جھیل سے نکل کر ڈب واکورہ کے نزدیک سندھ دریا سے مل کر شادی پور پہنچ کر دریائے جہلم میں جاملتی تھی۔ بادشاہ نے اس پانی سے فائدہ اٹھانے کی دو تجویزیں سوچیں ایک تو یہ کہ پرگنہ اچھن وہ علاقہ جو عیدگاہ کے اردگرد واقع ہے کو آباد اور سرسبز کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عیدگاہ تک کس طرح پانی پہنچایا جائے تاکہ لوگوں کو وضو وغیرہ کے لئے تکلیف نہ ہو لیکن یہ دونوں تجاویز بظاہر خوش اسلوبی سے طے ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ آخر بڈشاہ نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ ایک سانپ نکلا ہے اور وہ دوڑتا جاتا ہے اور پانی کا راستہ دکھاتا جاتا ہے۔ چونکہ بڈشاہ صاحب کو روحانیت میں بھی کمال حاصل تھا اس نے یہی واقعہ بعد میں عالم بیداری میں مشاہدہ کیا اور دیکھا ایک سانپ نکلا ہے لوگ اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور سانپ بھاگا جارہا ہے اور کسی کے قابو میں نہیں آتا یہاں تک کہ میدان عیدگاہ تک پہنچا وہاں سے اچھن میں جاکر غائب ہوگیا یہ واقعہ نالہ کی تیاری کے لئے ایک اشارہ تھا چنانچہ سلطان نے اس راستہ پر کھدائی کی چونکہ سانپ کو فارسی میں مار کہتے ہیں اس طرح اس نالہ کا نام نالہ مار مشہور ہوگیا۔

یہ نالہ شہر کی اندرونی آمدورفت کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس نے ڈل تک پہنچنے کے لئے ایک آسان گذرگاہ شاہراہ تیار کردی تھی اس کے ذریعہ ڈل کی تمام پیداوار دوسرے مقامات خصوصاً شہر سرینگر کے ہر گلی کوچہ

تک بہ آسانی پہنچ رہی تھی۔ نالہ مار اور اس کی شاخیں شہر سرینگر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کوہل (نالہ مار) آمد و رفت کا سب سے بڑا وسیلہ تھی سرینگر کی؛ کثر عمارات آستانے اور مندر اسی نالے کے کناروں پر آباد تھے۔ پلوں پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گنبد نما محراب بنے تھے اور بیچ میں اونچائی کی وجہ سے سڑک ناہموار تھی۔ اکثر پلوں پر دونوں اطراف دوکانوں کی قطاریں تھیں۔ وادی میں شاید واحد کوہل (نالہ مار) تھی جس کے فرش پر اینٹیں بچھائی گئیں تھیں۔ مار کے کنارے کچھ محلے ناؤ پورہ، شیلی ٹینگ، باغ دلاور خان، بہوری کدل، مہاراج گنج، شیخ محلّہ، کاوُڈارہ وغیرہ ہیں اس نالے پر تعمیر کردہ پلوں میں نائد کدل، بہوری کدل، صراف کدل، کادی کدل، راجوری کدل، کاوُڈارہ کدل اور ڈونبہ کدل قابل ذکر ہیں اور یہ سب کدل بڈشاہ نے تعمیر کرائے۔

گہرائی اور چوڑائی کم ہونے کے باعث مار کول میں سال میں فقط ۸ ماہ پانی رہتا تھا اور اکثر اوقات اس کی صفائی نہ کئے جانے کی وجہ سے شہر کا سارا کوڑا کرکٹ اس نالے میں جمع رہتا تھا جس کے نتیجے میں یہ خوب صورت کوہل (نالہ) آبادی کے لئے حفظان صحت کا مسئلہ بن گئی۔ عیدگاہ کے نزدیک عالی مسجد کے دائیں طرف نالہ مار پر سیاہ پتھروں کی سیڑھیاں وضو کے لئے بنوائی گئی تھیں جو مٹی سے ڈھکی ہوئی اور پانی میں چھپی ہوئی تھیں اس کے پانی میں لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ سرینگر میں نالہ مار آمد و رفت کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ سرینگر کی اقتصادی اور مالی حالت پر اس کا بڑا اثر تھا۔

سرینگر کے شرفا اور امیر لوگوں کے مکانات نالہ مار کے دونوں کناروں پر آباد تھے جن میں خاص طور پر رئیس کشمیر خواجہ سلام شاہ نقشبندی کا خوب صورت باغ تھا جہاں پر گل لالہ کے پھول موسم بہار میں دلفریب نظارہ دیتے تھے۔ نالہ مار سرینگر کے دائیں طرف پانی کے نکاس کے لئے ایک اہم ذریعہ تھا۔

لیکن بدقسمتی سے ۱۹۷۰ء میں اس خوب صورت نالہ کو بھرائی سے پُر کر کے سڑک میں تبدیل کیا گیا جس سے بہت ساری مشکلات شہر سرینگر کو پیش آئیں۔ پہلا پانی کا نکاس بند ہوگیا سرینگر کو جو خوب صورتی ان خوب صورت نالوں سے حاصل تھی وہ ختم ہوگئی۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ یہ حکام کا ایک غلط فیصلہ تھا۔ نالہ مار پر کئی بزرگ آسودہ خاک ہیں۔ جن میں خاص طور پر سید محمد بیہقیؒ، میر سید حبیب سرخابیؒ، میر نازک قادریؒ قابل ذکر ہیں۔ سید حبیب سرخابیؒ وسط ایشیا کے علاقہ تبریز کے ایک قصبہ سرخاب سے تعلق رکھتے تھے آخر پر کشمیر میں وارد ہو کر دن رات عبادات میں وقت صرف کرتے تھے۔ محلہ کاوڈارہ میں نالہ مار کے کنارے دفن ہوئے۔ انہوں نے دولت مندوں اور حاکموں سے کبھی بھی الفت نہ کی وہ صاحب قہر و جلال تھے۔

میر نازک قادریؒ شہر سرینگر کے بزرگوں میں سے تھے۔ حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کی نظر رفیق سے مکرم و محترم ہوئے۔ بابا داؤد خاکیؒ سے بھی تعلقات تھے۔ جب حضرت اسماعیل شامی قادریؒ کشمیر تشریف لائے تو آپ ان کے مرید ہوئے اور حضرت شامی نے ان کو سلسلہ قادریہ کے لازمی امور

سکھائے۔ فقیری اور تنہا نشینی اختیار کی۔ آخر ۹ ذی الحجہ ۱۰۲۲ء میں انتقال کیا کادی کدل نالہ مار کے کنارے سپرد خاک ہوئے۔ اس کے علاوہ مغل صوبیداروں نے نالہ مار کے کنارے خوب صورت بارہ دریاں اور باغات تعمیر کئے جن میں خاص طور پر باغ دلاور خان تھا۔ جہاں پر خوب صورت درخت اور پھول لگائے گئے تھے دلاور خان جہانگیر کے وقت میں ۱۶۱۸ء سے لے کر ۱۶۲۰ء تک کشمیر کا گورنر تھا۔ اس کے عہد میں کشمیر میں جہانگیر نے خوب صورت مسجدیں اور باغات بنوائے جن میں خاص طور پر شالیمار باغ، پتھر مسجد، ویری ناگ، اچھ بل قابل ذکر ہیں۔

اس باغ کا اب نام ونشان نہیں لیکن ابھی بھی اس علاقہ کو باغ دلاور خان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈوگرہ عہد میں یہاں ایک سکول کا قیام عمل میں آیا۔ جس کو آج باغ دلاور خان سکول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سرینگر کا ایک قدیمی تعلیمی ادارہ ہے۔

جھیل ڈل تاریخ کے آئینے میں

مورخ حسن نے اپنی تاریخ کے ایک حصے میں لکھا ہے۔ وہ علاقہ جس کو ڈل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس کو ویتال مرگ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کلہن نے اپنی راج ترنگنی میں ڈل جھیل کا ذکر وضاحت سے نہیں کیا ہے قدیم زمانے میں مختلف متبرک مقامات جھیل ڈل کے کنارے پر موجود تھے۔ جن میں خصوصی طور پر آثار شریف حضرت بل کی مقدس زیارت بھی ڈل کے کنارے پر ہی ہے۔ شنکر آچاریہ کی پہاڑی جو ڈل کے کنارے کھڑی ہے پر ایک خوب صورت مندر مہاراجہ اشوک کے فرزند جلوک نے تعمیر کیا۔ اس کے بعد مہاراجہ گوپادت نے جلوک کے مندر کی بنیاد پر گوپادری کا مندر بنوایا۔ پہاڑی کے دامن میں راجا گوپادت نے میدانی علاقوں سے بلائے گئے برہمنوں کو گوپ اگر ہار عطا کیا جو آج کل گپکار ہے اور ۱۹۲۵ء میں یہاں مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے شاہی محلات تعمیر کئے۔ جس کے بعد یہاں پر ہوٹل بنا دیا گیا۔ اس مقام پر راجہ سندھومتی نے کئی مندر اور بودھ وہار تعمیر کئے تھے سوریشوری تیرتھی یہاں ایک قدیم تیرتھ ہے۔ یہاں ایک چشمہ ہے۔ جسے گپت گنگا کہا جاتا ہے۔ اشبر کا گاؤں گپت گنگا کے نام سے بھی مشہور رہا ہے اور ڈل کے کنارے پر واقع ہے ہارون تاریخی

اعتبار سے ایک نہایت اہم مقام ہے۔ یہاں کشان دور کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔ دریافت شدہ ٹائیلوں پر ہمیں چرند و پرند اور نباتات کے وہ سبھی نقوش موجود ملے ہیں جو اب بھی ڈل جھیل اور اس کے مضافات میں نظر آتے ہیں۔

آج سے پانچ ہزار سال کی تہذیب ہمیں برزہامہ میں نظر آتی ہے یہاں پر ابتدائی دور کے انسان نے بسیرا کیا ہوگا۔ کیونکہ یہاں ایسے اوزار ملے جن کی مدد سے ایسے شکار کرنے کے علاوہ ڈل سے غذائی چیزیں حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہوگی۔ اس حقیقت کا پتہ ہمیں اس سامان سے ملتا ہے جو سامان برزہامہ کے لوگ مچھلیاں پکڑنے کے لئے استعمال کرتے تھے اور آج آثار کے ساتھ برآمد ہو رہے ہیں۔ برزہامہ کے آثار اس بات کو باور کرانے کے لئے کافی ہیں کہ ڈل جھیل ہزارہا سال سے اپنی جگہ پر موجود رہا ہے۔

سدرکھون بھی ایک مقدس مقام ہے یہاں پر یاترا کا مرکز ایک چشمہ رہا ہے۔ جس کا پانی ڈل میں شامل ہوتا ہے۔ اس چشمہ کا ذکر راج ترنگنی میں بھی کیا گیا ہے۔ ڈل کا ذکر سب سے پہلے جون راج نے کیا ہے۔ جو بڈشاہ کے وقت میں (۱۴۲۰-۱۴۷۰ء) ایک درباری تھا۔ جس نے بیان کیا ہے کہ بڈشاہ ہر روز کشتی پر سوار ہو کر اس کی سیر کرتا تھا۔ ڈل میں برزہامہ کے نزدیک تیل بل نالہ ملتا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگ ڈونگوں اور کشتیوں میں تیل بل نالہ کی سیر کو جاتے تھے۔ نالہ کے ارد گرد لہراتے درخت، پودے، شالی

کے لہلہاتے کھیت تھے جون راج کے مطابق جھیل کا نام سوریشوری بھی رہا ہے۔ جہاں تک لفظ ڈل کا تعلق ہے بعض لوگوں کا بیان ہے یہ تبتّی یا بودھ لفظ ہے اور اس کے معنی ٹھہرے ہوئے یا ساکن کے ہیں ڈل کے وسط میں دو جزیرے ہیں سونہ لانک (سنہری جزیرہ) اور روپہ لانک (چاندی کا جزیرہ) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سونہ لانک کے بارے میں یہ ہے کہ مربع شکل کی ہے۔ اس کے چار کونوں پر چنار کے درخت لگے ہیں۔ ۱۶۴۱ء میں شہزادہ مراد نے اس جزیرہ سونہ لانک کو بنایا۔ گرمیوں میں یہاں لوگ خوشگوار موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جو یہاں پر کشتیوں کے ذریعے آتے ہیں۔ روپہ لانک کا ذکر شری ور نے بھی کیا ہے حسن لکھتا ہے کہ اس جزیرے کو پندرہویں صدی عیسوی میں سلطان حسن شاہ نے بنوایا۔ یورپی سیاح فیڈرک ڈریو ڈل جھیل کے بارے میں لکھتا ہے کہ ڈل جھیل سرینگر شہر کے مشرق میں واقع ہے۔ اس میں پانی کی سطح کو برقرار رکھنے میں چشموں اور نالوں کا رول خاصا اہم ہے۔ جھیل میں پانی کی سطح شاز و نادر ہی تبدیل ہوتی ہے اس کا ایک راستہ دریائے جہلم کی جانب بھی کھلتا ہے۔ جس کے آگے دروازہ لگا ہوا ہے۔ دریا کی سطح گر جانے کی صورت میں دروازے کو بند کیا جاتا ہے۔ تاکہ جھیل کی سطح آب کم نہ ہونے پائے۔ سیلاب کی صورت میں بھی دروازے کو بند کیا جاتا ہے تاکہ جھیل میں زیادہ پانی نہ بھر جائے اور سبزی کے باغات پانی کی زد میں نہ آجائیں سر والٹر لارنس نے ڈل کے بارے میں لکھا ہے۔

ڈل کی لمبائی چار میل ہے اور چوڑائی اڑھائی میل۔ یہ جھیل دنیا کے ایک خوب صورت ترین مقام پر واقع ہے اور ایک روح افزا منظر کو پیش کرتا ہے۔ جھیل کے ارد گرد سبزہ اور قطار در قطار درخت جنت کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ پہاڑوں پر درختوں کے پتے موسم خزان میں سرخ ہو جاتے ہیں۔ جھیل سے شہر کی طرف دیکھتے وقت شنکر آچاریہ کی چوٹی بائیں جانب پڑتی ہے۔ دائیں طرف ہاری پربت ان دو پہاڑوں کے درمیان سرینگر آباد ہے۔ مغرب میں برف سے ڈھکے پہاڑ ہیں۔ شہنشاہ اکبر نے ڈل کے کنارے نسیم باغ بنوایا۔ پری محل کے آثار ڈل کے کنارے ایک مرقع علم و دانش رہا ہے۔ جوز برون پہاڑی کی گود میں بسا ہوا ہے۔ ڈل کی سطح پر تیرتے باغات نظر آتے ہیں۔ ان باغات کو کشتی سے باندھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لے جایا جا سکتا ہے۔ مقامی زبان میں ان باغات کو راد کہا جاتا ہے۔ اور ان کی بناوٹ میں درختوں کی ٹہنیاں اور ڈل کے اندر اُگنے والی گھاس کا استعمال ہوتا ہے۔ راد کے کونوں پر چار کھمبے گہرائی میں نصب کیئے جاتے ہیں اور ان ہی کھمبوں کے ساتھ راد بندھا رہتا ہے۔ رادوں پر سبزیاں اور پھول اُگائے جاتے ہیں۔ اور کافی حد تک شہر میں سبزی کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ڈل کے کنارے پر کافی ادارے اور درسگاہین قائم رہی ہیں۔ سلطان حسن شاہ نے پکھری بل میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اور کشمیر کی دانش گاہ اور سب سے بڑی یونیورسٹی ڈل کے کنارے پر ہی واقع ہے۔ سلطان کشمیر یوسف شاہ چک اور اس کی ملکہ حبہ خاتون کشتی

میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کیا کرتے تھے۔

ملکہ نور جہاں نے ۱۶۲۳ء میں ڈل کے مغرب کی طرف ایک باغ بنوایا تھا جو بحر آرا کہلاتا تھا۔ اس باغ میں ملکہ نے ایک محل تعمیر کروایا تھا کہا جاتا ہے مغلوں نے جھیل کے اردگرد باغات بنوائے تھے۔ ایسے حوالے بھی موجود ہیں کہ زبرون پہاڑوں کے دامن میں پہلے بھی باغات موجود تھے۔ اب حکومت نے یہاں خوب صورت باغ گل لالہ بنوایا ہے اور اس کے نزدیک باٹنیکل گارڈن بھی ہے۔ یہ باغ بڑا دلکش ہے یہاں پر گرمیوں میں سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں اشوک کا بسایا ہوا شہر سرینگر زبرون کے اُس پار اور اس پار بسا ہوا تھا۔ اس کی تصدیق آثار قدیمہ نے بھی کی ہے۔ گگری بل کے پاس نہرو پارک ایک جدید تعمیر ہے۔ اس کے آگے مہاراجہ ہری سنگھ کا کبوتر خانہ اب بھی موجود ہے۔ ڈل کے مشرقی کنارے پر سیاحوں کے لئے ایک خوب صورت ہوٹل حکومت نے تعمیر کیا ہے۔ جس کو شیر کشمیر کنونشن کمپلیکس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈل کے کنارے پر چشمہ شاہی تو سیاحوں کا باغ جنت ہے اور باغ کو شاہ جہاں کے گورنر علی مرداں خاں نے ۱۶۳۶ء میں بنوایا۔ باغ کے اندر میٹھے پانی کا چشمہ ہے۔ اس کا پانی ہاضمہ کے لئے نہایت مفید ہے۔

نشاط باغ بھی ڈل کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ یہ باغ ۱۶۳۴ء میں نور جہاں کے بھائی آصف جاہ نے بنوایا تھا۔ اس کا نچلا طبقہ ڈل کے کنارے کے ساتھ تھا جبکہ بالائی طبقہ زبرون پہاڑ کے دامن میں تھا۔

شالیمار باغ بھی ڈل کے کنارے واقع ہے جس کو جہانگیر نے ۱۶۱۹ء میں تعمیر کیا۔ ڈل کے کئی حصے ہیں۔ گگری بل جھیل ڈل کے چھوٹے حصہ جنوب مشرق میں واقع ہے جھیل ڈل کے بڑے حصہ میں تیل بل کا دلدل ہے۔ ڈل کے جنوب میں ڈل کٹوال ہے اس کے مغرب میں "سدرہ کھون" ہے اس کے نزدیک نگین ڈل ہے۔ جھیل کے وسط میں ایک پگڈنڈی جاتی ہے جو "سوتھ" کہلاتی ہے یہ سوتھ نایدیار (رعناواری) سے شروع ہوکر شمال مشرق سے اشبر کے جنوب میں نشاط کے شمال میں ڈل کے بائیں کنارے کو چھوتا ہے۔ پگڈنڈی کی لمبائی ساڑھے پانچ کلومیٹر کے قریب ہے اور چوڑائی بارہ فٹ ہے پگڈنڈی کے ایک پل پر مہیش چودھری کے نام کا کتبہ بھی موجود تھا۔ جھیل سے ماضی میں جو نہریں نکلتی تھیں وہ آمدورفت اور تجارت کا ذریعہ تھیں۔ ان ہی نہروں کی بناء پر سرینگر کو مشرق کا وینس (Venice) کہا جاتا تھا۔ اب صرف ڑونٹھ کول اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ مغلوں کے دور میں جھیل ڈل کا پانی استعمال کے لئے زیادہ موزوں مانا جاتا تھا۔ دریا کے پانی کے مقابلے میں جھیل کا پانی صحت مند ہاضم اور میٹھا تھا۔ گگری بل کے پانی کو شال دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ پچھلے چالیس سال سے جھیل کے حدود میں مداخلت کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ ہزاروں سال سے سرینگر شہر کے سرہانے پر ٹکے جھیل ڈل کا رقبہ آہستہ آہستہ سکڑ تا جارہا ہے۔

☆☆☆

مِس میلنسن

کشمیر کے افلاس زدہ پسماندہ اور توہم پرست عوام کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مشنری سکول قائم کیے گئے جیسا کہ ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔ جدید وقدیم کی آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ چنانچہ عیسائی مشنریوں کو بھی یہاں کشمیر میں کٹر پنتھیوں کی طرف سے شدید مخالفت ومخاصمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تاریخ کے پہیوں کو پیچھے کی طرف موڑنا چاہتے تھے۔ لیکن کامیاب کہاں ہوتے۔ رفتہ رفتہ اُن کا زور دار اثر کم ہوتا گیا اور یہاں عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں جدید تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی۔ آج کا میلنسن سکول بھی انہی اداروں میں سے ایک ہے۔ سکول کی بنیاد جے۔ ایچ۔ نو ولز کے مبارک ہاتھوں سرینگر میں ۱۸۸۰ء میں پڑی۔ قانون کی زد میں آنے سے بچنے کے لئے مشنری ہسپتال سرینگر کے احاطے میں انتہائی نازک حالات میں سکول کا کام جاری رکھا گیا اور ۱۸۹۰ء میں حکومت کی طرف سے پابندی اٹھائے جانے کے بعد دریائے جہلم کے کنارے فتح کدل کی ایک نادر طرز کی بڑی عمارت میں اسے منتقل کیا گیا، جس کی باقیات آج بھی یادگارِ زمانہ ہیں۔

عیسائی مشنریوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ عورتوں کو زیورِ تعلیم

سے آراستہ کئے بغیر سماجی زندگی میں تبدیلی کے امکانات تاریک ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس امر کی طرف بھی توجہ دی۔ مس چرچل ٹیلر، مس سٹبس، مس گوڈزال اور مس فٹ زے کا شمار ان ممتاز خواتین مشنریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر میں تعلیم نسواں کو مقبول بنانے میں نمایاں اور کلیدی رول ادا کیا۔

یہ سب انقلابی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے دور رس اقدام انتہائی دقتوں کا سامنا کرنے کے بعد ہی ممکن ہو سکے۔ ایک طرف سے عوام کی جہالت، تو ہم پرستی کا مقابلہ جاری تھا تو دوسری طرف ڈوگرہ حکومت کی عدم توجہی سب سے بڑی رکاوٹ بنی تھی کیونکہ علم کی روشنی سے عوام کی سیاسی بیداری کی شروعات ہوتی ہیں۔ جو ہر حکمران طبقہ کے لئے ہر دور میں سب سے بڑا خطرہ تصور کی جاتی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے مِس میلنسن کا کام تعلیم نسواں کے میدان میں بالخصوص تاریخ ساز بھی تھا اور انقلاب آفرین بھی۔۔ ان خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرحوم شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مِس میلنسن کے تئیں خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے بجا طور پر یوں رقمطراز ہیں۔

"مِس میلنسن کی حیثیت ریاستِ جموں و کشمیر میں تعلیم نسواں کے میدان میں ایک پیشرو کی ہے۔ اُس نے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۲ء تقریباً چالیس سال تک کشمیر میں قیام کیا۔ اس عرصہ کے دوران اس نے کشمیریوں سے محبت کی اور اُن کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیا جس کے نتیجہ میں کشمیریوں نے اس کو اپنے دلوں میں جگہ دی۔

اس کے وقت میں تعلیم نسواں خاص طور اکثریتی فرقے کی نظر میں ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی بے پناہ لگن، اور توجہ عورتوں کی فلاح کے لئے بنی رہتی تھی جو طالبات کو سکول جانے اور جدید زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کی موجب بنی۔ میری اپنی بڑی ہمشیرہ مِس میلنسن کے سایہ عاطفت ہی میں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں۔

اُسے نہ صرف تعلیم نسواں کے اعلیٰ آدرش سے لگاؤ تھا بلکہ وہ خواتین کی سماج میں برتری کو بھی عزیز رکھتی تھی۔ وہ کم کمری میں شادی کے خلاف سینہ سپر ہوئی اور عورت کو عزت و وقار کا مقام دلانے میں ہمہ تن جٹ گئیں۔

اُس نے عورت کے بارے میں رائج کئی سماجی تعصّبات اور ان مصائب کے خلاف لڑائیاں کیں جن میں یہاں کی خواتین مبتلا تھیں۔ یہاں کی عورتیں گھر سے باہر آکر کھلی ہوا میں سانس نہیں لے سکتی تھیں۔ مِس میلنسن ہی نے گرلز کیمپوں کا اہتمام کر کے طالبات کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکالا اور خود بھی ریاست کے گرل گائیڈ کمشنر کے منصب پر فائز رہی۔

مِس میلنسن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ منکسر المزاج تھی ساتھ ہی تدبر، تحمل، کا پیکر بھی۔ اُس کی رگوں میں انسانیت کا خون رواں دواں تھا۔ جہاں وہ نوخیز طالبات پر محبت و شفقت کی بارش برساتی تھی وہاں وہ اُن کی تعلیم و ترتیب کے لئے بھی صدر مدرس (Principal) کی حیثیت سے اپنے فرائض مستحسن طریقے سے انجام دیتی رہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ گرلز سکول بھی بائز سکول

کے ہی قریب محلّہ ملک یار میں برلب جہلم ایک وسیع قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا جسے ایک زمانہ میں ''چک باغ'' کہا جاتا تھا۔ سکول کی تعمیر کیوقت اس قطعہ زمین کے مالکانہ حقوق صاحبزادہ خاندان کو حاصل تھے مالکان زمین سے طے پایا تھا کہ سکول کی منتقلی کی صورت میں سکول کی عمارت کے ملکیتی حقوق بھی انہیں ہی حاصل ہوں گے۔ چنانچہ سکول کی عمارت ایل شیپ میں بنائی گئی ہے۔ اس کے صحن میں ایک اچھا خاصا تالاب بھی تھا کافی عرصہ گزرنے کے بعد مالکان زمین نے کرائے میں اضافے کی مانگ کی چنانچہ معاملہ کورٹ کچہری تک جا پہنچا۔ ادھر سکول کے منتظمین کو لگا کہ اب طالبات کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، اور سکول کی عمارت میں حسب منشاء توسیع کی گنجائش بھی نہیں تھی تو مذکورہ سکول کو بسکو سکول کے پاس ہی شیخ باغ منتقل کیا گیا اور سکول کی عمارت مالکان زمین کو بعوض پانچ ہزار روپے دے دی گئی۔

کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ مس میلنس نے بجاطور کشمیری عورتوں کے تعلیمی اور تہذیبی ارتقاء کے لئے اہم رول ادا کیا۔ اس کی ذات کے بغیر یہ دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی موثر اور متحرک رہنمائی میں یہ ادارہ ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ اُس نے تعلیمی نصاب میں تیراکی، رقص، کوہ پیمائی وغیرہ جیسی مہم بازیوں کو شامل کر دیا کسی گشت کے دوران لڑکیوں کا کہیں گھر سے باہر قیام پر آزادی سے اِدھر اُدھر گھومنے کا منظر نہایت ہی مسرت آمیز اور فرحت افزا ہوتا تھا۔ اس طرح کوہ

پیمائی کی پہلی مہم کا اہتمام ۱۹۳۸ء میں ہوا جب چالیس (۴۰) کے قریب طالبات نے مہادیوکوہ پیمائی میں شامل ہونے کے لئے تحریری اجازت مانگی۔ گرل گائیڈ تحریک نے لڑکیوں کو ایک دوسرے کی خاطر جینا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی طرف نہ صرف راغب کیا بلکہ ان میں ایسا کرنے سے احساسِ ذمہ داری، عزتِ نفس اور ضبطِ نفس کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔

انگریزی، اردو، فارسی اور ریاضی معلوماتِ عامہ اور مطالعہ فطرت جیسے مضامین شامل نصاب تھے۔ اور ۱۹۴۷ء میں سائنس کی تعلیم کو رائج کیا گیا جبکہ طالبات کے کسی اور سکول میں یہ مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ وہ کپڑے دھونے، کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ ٹوکریاں بنانے اور سوزن کاری و دیگر دستکاریوں کی طرف بھی طالبات کی توجہ مبذول رکھتی تھیں۔ جب وہ پہلی بار سرینگر آئی تو اس وقت فتح کدل کے گرلز سکول کی نوعیت نہایت معمولی تھی۔ اسی کی شفقت و نگہداشت میں وہ پروان چڑھا۔ جب بھی مس میلنسن کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے سامنے ایک سائیکل سوار خاتون کی شبیہ ابھرتی ہے جو نہایت انکساری و عاجزی کے ساتھ گھر گھر گھومتی ہے اور لوگوں کو تعلیم نسواں کی طرف راغب کرتی ہے۔

مس میلنسن سے سب کشمیری والہانہ محبت کرتے تھے اُس کے بارے میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں کے ذی حس لوگ سڑک پر جاتے ہوئے اپنی کاریں روک کر نیچے اُترتے اور اُس کا آداب بجالاتے۔ وہ چوراہے پر تعینات پولیس سپاہی سے بھی ملتی اور اُس کے گھر کے حالات

پوچھ لیتی۔ وہ کئی بار ہمارے گھر آئی۔ کیونکہ میری ہمشیرہ بھی اس کے سکول میں پڑھتی تھی۔ میں بھی اُن خوش بخت لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے مس میلنسن کے ماتحت جب کہ وہ بسکو سکول میں بحیثیت ایکٹنگ پرنسپل تھی کام کیا غالباً یہ واقعہ ۶۰-۱۹۵۹ء کا ہے۔ جب کہ میں بسکو سکول میں بحیثیت انچارج بیالوجی سیکشن تھا۔ اور میرے والد صاحب مرحوم سلام الدین بسکو سکول میں بحیثیت وائس پرنسپل تھے۔

مس میلنسن جو ۱۹۸۰ء میں اس دار فانی کو چھوڑ کر چلی گئی لیکن اس کے کارنامے کشمیری عوام خصوصاً کشمیری خواتین کے دلوں پر تا ابد نقش بر سنگ رہیں گے۔

یارقند سرائے صفا کدل سرینگر

شہر خاص کے صفال کدل میں موجودہ یارقند سرائے جو کبھی وسط ایشیاء کے تجارتی روابط کا مرکز رہی ہے آج خستہ حالی میں بھی ۷۰ پناگزین کنبوں کو اپنی آغوش میں سنبھالے ہوئے ہے۔ مغل دور میں قائم اس تجارتی پڑاؤ کو اگر چہ کئی صدیوں تک منظّم انداز میں اقتصادی منڈی کے مرکز کے بطور فروغ حاصل ہوالیکن متحدہ ہند کی تقسیم اور شاہراہ ابریشم پر آمدرفت کی پابندی نے اس سرائے کو تجارتی منظرنامہ سے ہٹادیا۔ یارقند سرائے کی تاریخی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ وسط ایشیاء کے پروفیسر گلشن مجید نے کشمیر عظمیٰ کو بتایا ''اقتصادی میراث کی حاصل یارقند رسرائے کشمیر اور وسط ایشیاء کے درمیان تجارتی رابط کا واحد مرکز تھا جہاں خرید و فروخت کی سرگرمیاں اس قدر عروج پر تھیں کہ روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی ہر شے سال بھر دستیاب رہتی تھی۔'' انہوں نے کہا کہ اس سرائے کو اگر چہ ڈوگرہ دورِ حکومت میں منظّم طور تعمیر کیا گیا مگر یارقند رسرائے میں اقتصادی سرگرمیاں مغل حکمرانوں کی کشمیر آمد کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھیں۔ پروفیسر گلشن مجید مزید کہتے ہیں ''کشمیر سے جو چیزیں وسط ایشیاء کے مارکیٹ میں فروخت کے لئے جاتی تھیں وہ یارقند سرائے سے ہی مختلف ممالک کے

لئے روانہ کی جاتی تھیں'' ان کے مطابق وسط ایشیاء کی مختلف مملکتوں اور چین سے جو ریشم، قالین، کپڑے، چاندی اور کھانڈ، سونا، فیروزے، مونگا، مشک، تمباکو، کشمش، بادام، صابن، چمڑا، کھالیں، خشک میوئے، ادویات وغیرہ آتے تھے پھر یارقند سرائے سے ان چیزوں کو زیادہ تر پنجاب برآمد کیا جاتا تھا۔ سکالر پیرزادہ محمد اشرف کا کہنا ہے کہ ''کشمیر میں اس وقت یارقندی گھوڑا رکھنا شان اور فخر کی علامت سمجھا جاتا تھا اور ان گھوڑوں کی خرید وفروخت سرائے کے قریب ایک میدان میں کی جاتی جو آج ایک گنجان بستی ہے۔'' ایک سوال کے جواب میں پیرزادہ محمد اشرف کہتے ہیں ''قدیم تجارتی شاہراہ ابریشم کی ایک شاخ قراقرم کے راستے لداخ تک آتی ہے جس پر صدیوں سے تجارتی قافلے گذرتے رہے اور اسی راستہ سے یہ تجارتی قافلے وادی میں داخل ہوتے تھے۔'' ان کے مطابق ۱۹۴۷ء کے بعد بھی کچھ عرصہ تک یہ تجارت کسی حد تک جاری تھی لیکن چین میں قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کے درمیان خانہ جنگی کے آخری مراحل پر ۱۹۴۹ء میں یہ تجارتی شاہراہ تاجروں کے لئے بند کر دی گئی، اس کے تیرہ سال بعد ۱۹۶۲ء میں بھارت اور چین کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد لیہہ اور تبت کی شاہراہ بھی بند ہوگئی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''سیاسی افراتفری کے باوجود بھی مغل دور میں وسطی ایشیاء کے مختلف ممالک کے ساتھ کشمیر کی تجارت جاری تھی تاہم اُس دور میں صرف سفری پڑاؤ تھا لیکن تجارت کے حجم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ یہ سرائے تجارت کے ایک اہم مرکز کے طور اُبھر کر سامنے آئی'' تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے پیرزادہ

اشرف کے مطابق سکھ دور میں مشہور جرمن سیاح چارلن بیرن ہیوگل کے مطاق، چین، تبت اور باقی وسطی ایشیاء ممالک کے ساتھ کشمیر کی تجارت کا سلسلہ نہایت ہی خوشگوار طریقے سے قائم و دائم تھا۔ ہیوگل نے سرینگر میں کچھ یارقندی تاجروں سے گفت وشنید کی تھی، ان کے مطابق کاشغر سے سمرقند تک پہنچنے میں سفری کاروان کو 28 دن لگتے تھے جبکہ کاشغر سے یارقند کا سفر پانچ دونوں میں طے ہوتا تھا اور سمرقند سے بخارا کا فاصلہ دس دن میں پورا ہوجاتا تھا۔ محقق محمد یوسف ٹینگ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''وسطی ایشیائی تاجروں کی سہولیت کے لئے کشمیر دربار نے سرینگر میں ۲ دوسرائیں تعمیر کرائیں جن کو عرفِ عام میں ''یارقندی سرائے'' کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران سنکیانگ میں پیدا شدہ حالات کے پیش نظر بعد ازاں ان تجارتی راستوں کو بند کیا گیا جس سے صدیوں پرانے تجارت کو دھچکا لگا۔'' انہوں نے کہا کہ ''خصوصاً شال اور نمدہ سازی کی صنعت کشمیر میں کافی حد تک متاثر ہوگئی کیونکہ سارا خام مواد انہی راستوں سے کشمیر آتا تھا اور اسی کے ساتھ یارقند سرائے بھی زوال کی نذر ہوگئی'' چونکہ یہ قافلے لداخ کے راستے سے ہوکر آتے تھے، لٰہذا لداخی تاجروں کا بھی اس سرائے میں عمل دخل تھا۔ مگر مشرق وسطی کے رابطے بند ہونے کے بعد اس سرائے میں لداخی بھائی رہ گئے اور آج بھی یارقند سرائے میں تقریبا ۷۰ لداخی کنبے مقیم ہیں تاہم ماضی کی تجارتی سرگرمیوں کی تاریخ ایک علامت بن کر آج بھی اس سرائے میں موجود ہے۔ ستارہ بیگم جو ایک یارقندی شخص کی

بیوہ ہے اس سرائے میں پچھلے ۴۰ برسوں سے مقیم ہے۔ ستارہ بیگم اگر چہ یار قند سرائے میں ماضی کی عالمی تجارتی عروج کی سرگرمیوں کو نہیں دیکھ پائی ہیں لیکن سرائے کی گرتی اور خستہ دیواروں سے کشمیر کے عالمی تجارتی رابطوں کا شور ضرور سنا ہے۔ ستارہ بانو اصل میں گلگت کی ہیں۔ ۶۵ برس قبل ان کی شادی حاجی صادق نامی ایک یارقندی باشندے سے ہوئی تھی۔ ۸۰ سالہ ستارہ بیگم اب عمر کی آخری دہلیز پر اسی سرائے میں زندگی کے دن گن رہی ہیں اور آج جب کبھی ریڈیو، ٹی وی پر عالمی تجارت کی بات ہوتی ہے تو اسے یار قند سے آنے والے وہ قافلے یاد آتے ہیں جو اسی سرائے میں قیام کرتے تھے اور وہ ان کے لئے ایک خصوصی ضیافت ''گوشت نان'' تیار کیا کرتی تھیں۔ کشمیر عظمیٰ سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''میرے شوہر دراصل یارقند کے تاجر تھے جو یارقند سے نمدے خرید کر اس سرائے میں فروخت کرتے تھے۔'' ان کے یارقندیوں کی شادیاں کشمیری گھرانوں میں ہوئی ہیں۔ جن کی موجودہ نسلیں جسمانی ہیت سے آج بھی مختلف نظر آتی ہیں۔'' ان کے مطابق اس سرائے کے قریب حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ کی جو خانقاہ موجود ہے، اس کے ملحق مزار میں دس کے قریب یارقندی مدفون ہیں، جن میں ان کے شوہر بھی شامل ہیں۔ ستارہ بیگم نے کہا کہ یارقند کے لوگ زیادہ تر ''گوشت نان'' کھانا پسند کرتے ہیں اور کشمیر میں گوشت نان کا چلن یارقند کے تاجروں کے ذریعہ ہی شروع ہوا ہے جو اب بھی جستہ جستہ جاری ہے تاہم اب یہ گوشت نان کچھ کشمیری نانبائی ہی تیار کرتے ہیں جنہوں نے

یہ کام یارقندی نانبائیوں سے سیکھا۔ انہوں نے کہا کہ میرے شوہر کی ایک رشتہ دار عورت نے مجھے گوشت نان بنانے کا طریقہ سکھایا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں ستارہ بیگم کہتی ہیں ''مرنے سے قبل میں ایک بار پھر دیکھنا چاہوں گی کہ اس سرائے میں پھر وہ تجارتی چہل پہل ہو، لوگ یارقند، ترکستان، سمرقند، گلگت وغیرہ سے آئیں اور وہ ماضی پھر جگمگا اُٹھے۔'' ڈوگرہ دور کی چوطرفہ تعمیر شدہ اس دومنزلہ سرائے میں کمروں کو رہائش اور گوداموں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ صحن میں تاجروں کے گھوڑے وغیرہ اور بیٹھک ہوا کرتی تھی۔

شہر آرہ وقت کالم

مزار شعراء (درگجن)

کشمیر کے آخری حکمران رینچن شاہ جو کہ بُدھ مت کا پیروکار تھا کی ملاقات حضرت شرف الدین بُلبل صاحب کے ساتھ ہوئی جو وسط ایشیاء سے کشمیر آتے تھے ان سے متاثر ہوکر رینچن شاہ مشرف بہ اسلام ہوئے رینچن شاہ نے ۱۳۲۰ء میں اسلام قبول کیا اور اپنا اسلامی نام صدر الدین رکھا۔ رینچن شاہ نے ۱۳۲۳ء میں انتقال کیا۔ اس کی قبر محلّہ بُلبُل لنکر میں جہلم کے دائیں کنارے میں موجود ہے۔ سرزمین کشمیر پر یہ کسی مسلمان کی پہلی قبر ہے۔ رینچن شاہ کے مزار کے نزدیک حضرت شرف الدین بُلبل صاحبؒ کی قبر ہے۔ حکومت اب اس آستان کو فاروق رینزو کی نگرانی میں ازسر نو تعمیر کر رہی ہے۔ مزید کشمیر میں جب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ تو قبرستانوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ایک قدیم قبرستان جو شہر سرینگر میں شنکر آچاریہ یا تخت سلیمان کے دامن میں واقع ہے اس مزار میں باکمال شخصیتیں مدفون ہیں جن میں کئی علماء شعراء اور مورخین کی قبریں ہیں اس تاریخی مزار میں جو قبریں ہیں وہ انسانی خودغرضیوں کے سبب منہدم ہورہی ہیں۔ یہ تواریخی مزار جو قدیم آثار پر قائم ہے۔ شاہراہ عام بن گیا ہے اور اردگرد ناجائز قبضہ اور مقبرے کی بھرائی کی وجہ سے یہ اپنی شان کھو بیٹھا ہے۔ اس تواریخی مزار کے

باہر نمدہ ساز محلے کی مسجد شریف کے عقب میں تین قبریں ہیں ان قبروں پر کتبے تحریر شدہ ہیں یہ قبریں شش طبقہ لیکن ایک ہی پتھر سے بنی ہیں۔اتنی بڑی قبروں کی سنگتراشی دیکھنے والے کو محو حیرت کر دیتی ہیں۔تواریخ میں ان قبروں کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔اس مقبرہ میں بہت سارے شعراء جو ایران سے آئے تھے سپرد خاک ہیں۔ان کی آخری خواہش تھی کہ ان کو اسی قبرستان میں سپرد خاک کیا جائے۔مقامی لوگ اس قبرستان کے بارے میں لاعلم ہیں۔ان شعرامیں جو یہاں مدفون ہیں ان میں محمد جان قدسی، حکیم ابونقع شیرازی، مشہدی، ابوطالب، کلیم ہیں۔

شیرازی:-

ایران کے عالموں میں سے تھے خوش بیان شاعر تھے۔پھر ہندوستان آئے۔یہاں آکر اکبر اعظم کے ایک درباری بنے تھے۔کشمیر آکر جھیل ڈل کی خوبصورتی دیکھ کر متاثر ہوئے واپس آگرہ جانے سے آپ نے انکار کیا۔ اور وصیت کی کہ مجھے ڈل کے کنارے دفن کیا جائے۔جس زمانے میں ان شعراء کو اس مقبرہ میں دفن کیا گیا۔تو جھیل ڈل کا پانی مقبرہ کے کنارے تک موجود تھا اس وقت بلوارڈ سڑک وجود میں نہیں آئی تھی اس کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۹۳۰ء میں بمبئی میرین ڈرایو کے طرز پر تعمیر کیا۔یہ مقبرہ ڈل گیٹ کے بازار اور گرجا گھر کے اوپر واقع ہے۔اس مقبرہ پر گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں۔قبروں کے اردگرد جھاڑیاں اور لمبی گھاس ہیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے یہ مقبرہ ویران ہے اور کسی کو اس کی دیکھ بال کے لئے

کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ان کو کیا معلوم کہ اس مقبرہ میں کون ہستیاں سپرد خاک ہیں اس وقت یہ قبرستان جواریوں اور شرابیوں کا مسکن ہے۔ افسوس ہے کہ مقبرہ ہماری ثقافت کا ایک خزانہ تھا لیکن ہم اس کو تحفظ نہ دے سکے۔

حاجی جان محمد قدسی:-

اصلی وطن مشہد مقدس تھا۔ پھر ہندوستان آئے۔ جس وقت ہندوستان کا بادشاہ شاہجہان تھا۔ بادشاہ نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ آپ شیرین زبان بلند خیال تھے۔ قصیدہ گوئی اور غزل گوئی میں وقت کے مانے ہوئے اُستاد تھے۔ اپنے بیٹے محمد باقر کے اچانک موت سے اتنا دل شکستہ ہوا کہ کشمیر میں ہی سکونت اختیار کی اور آخر ۱۰۵۵ء میں وفات پائی اور وصیت کے مطابق مزار شعرا درجگن میں سپرد خاک کئے گئے۔

مشہدی:-

خوش خیال۔ خوش فکر شاعر تھے۔ انشاپردازی میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے خطوط نہایت دل پسند ہیں۔ مغل شہزادہ مراد بخش کے ملازم تھے۔ ان کی مدح میں ایک عالیشان قصیدہ لکھا ہے۔

دارائے عرش و کوکبہ سلطان مراد بخش
زینت فزائے کرسی اورنگ آسمان

آپ فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ ایران کے شہر مشہد سے کشمیر تشریف لائے تھے۔

قاضی ابوالقاسم :۔

شاہجہاں کے عہد میں کشمیر کے مستقل دیوان تھے۔ قابل ذہن رکھتے تھے۔ علم کے تمام شعبوں خاص کر شعر وشاعری کے فن میں سحر کاری کرتے تھے۔ اسی مزار شعراء میں دفن ہیں۔

محمد قلی سلیم :۔

شاہجہان کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے۔ شاعری کے میدان میں شہسوار تھے۔ مثنوی در تعریف کشمیران کے خیالات کی بلندی کے نمونے ہیں۔ آخری عمر میں کشمیر آئے۔ اور راہی ملک بقا ہو گئے۔ مزار شعرا میں دفن ہوئے۔

مرزا طالب کلیم :۔

جائے ولادت ہمدان ہے۔ اور پھر شیراز گیا اور رسمی علوم حاصل کر کے ہندوستان آیا۔ کافی مدت تک ہندوستان اور دکن کی سیر کی۔ آخر شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دربار کے ملازموں میں شامل ہو گیا۔ ان کو شاہجہان نے شاہ نامہ شاہان چغتائیہ نظم کرنے کی غرض سے کشمیر بھیجا۔ یہاں ملا طاہر غنی سے دوستی ہوگئی اور کشمیر کی خوبصورتی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اور مزار شعرا میں دفن ہوئے۔ کلیم نے بہت ساری کتابیں تصنیف کی ہیں ان کے دیوان کے علاوہ مثنوی در تعریف ہندوستان و کشمیری شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

☆☆☆

دریائے جہلم

رگ وید میں اس دریائے جہلم کا نام وتستا آیا ہے۔ کشمیری میں اسے ویتھ اور یونانی اسے ہڑسپس (Hidaspes) کہتے ہیں اس کی کل لمبائی ۴۵۰ میل ہے جہلم کا منبع چشمہ ویری ناگ ہے جو سطح سمندر سے ۱۰۰۰ افٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ شاہ آباد، ڈورو، اسلام آباد، بجبہاڑہ، اونتی پورہ، سرینگر، سوپور، بارہمولہ، اوڑی، مظفر آباد اور کوہالہ کے شہر اور قصبے اس دریا کے کنارے آباد ہیں وادی کشمیر میں ۹۰ میل تک اس میں کشتی رانی ہوتی ہے۔ وادی کشمیر کے اندر مہورہ اور اوڑی کے مقام پر اس پر بنڈ باندھ کر بجلی گھر بنائے گئے ہیں۔

حکومت جھیل ولر پر ایک اور بیراج تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ جہلم ماضی میں ٹرانسپورٹ کا اہم ذریعہ تھا۔ اس سے سینکڑوں لوگ روزگار حاصل کرتے تھے۔ صارفین میں تقسیم ہونے والی راشن اور بالن کی فراہمی کے لئے جہلم کے کناروں پر جگہ جگہ گھاٹ قائم کئے گئے تھے۔ سرینگر جو کہ جموں و کشمیر کا گرمائی دارالخلافہ ہے۔ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے سرینگر کو سات پلوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ یہ پُل امیرا کدل، حبہ کدل، فتح کدل، زینہ کدل، عالی کدل، نوا کدل اور صفا کدل ہیں۔ اس کے علاوہ

پرانے پُلوں کی جگہ نئے اور جدید پُلوں نے لے لی ہے ان جدید پُلوں کی تاریخی حیثیت دیکھتے ہوئے سابقہ شان وشوکت بحال رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سرینگر میں دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر مساجد، زیارت گاہیں اور مندر موجود ہیں۔ جس سے کشمیر کی تواریخی اور بھائی چارے کی عکاسی ہوتی ہے۔ امیرا کدل کے پاس شیر گڈھی کے محلات ہیں جہاں پر افغان، سکھ اور ڈوگرہ حکمران رہتے تھے۔ شیر گڈھی کے نزدیک دریائے جہلم کے کنارے مہاراجہ کے درباریوں کے رہائشی مکانات تھے۔ ٹنکی کدل کے نزدیک ایک شاخ جہلم سے نکالی گئی ہے جس کو ''کٹہ کول'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پرانے وقتوں میں کٹہ کول پر نزدیک ٹنکی پورہ کدل ایک چھوٹا سا پُل ہوا کرتا تھا جو آج کل کے پرانے سکریٹریٹ اور ڈویژنل کمشنر کے دفتر کو آپس میں ملاتا تھا۔ یہاں سے ڈوگرہ رانیاں محل کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جاسکتی تھیں۔ کٹہ کول سید منصورؒ زیارت کے نزدیک دو نالوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک نالہ ایس - ایم - ایچ - ایس ہسپتال کے پاس سے گزرتا ہے جسے ''دسنز کول'' کہتے ہیں۔ دوسرا نالہ حاجی راتھر کدل ذالڈ گر اور نواب بازار سے ہوتا ہوا چھتہ بل کے نزدیک جہلم میں گرتا ہے جسے کٹہ کول کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۸۹۰ء تک کشمیر میں صرف آبی ٹرانسپورٹ تھا۔ سیاح لوگ سرینگر میں آبی ٹرانسپورٹ کے ذریعہ سے کشمیری دستکاریاں خریدتے تھے۔ یہ علاقہ فتح کدل سے زینہ کدل تک دریا کے بائیں کنارے پر آباد تھا۔ یہاں بڑی بڑی کوٹھیاں اور خوبصورت دکانات تھے۔ سیاح لوگ رام منشی باغ

سے کشتیوں میں آتے تھے اوران دکانوں کودیکھتے تھے۔

حبہ کدل کے نزدیک دریائے جہلم کے کنارے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے رگوناتھ مندر تعمیر کروایا تھا۔ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ نے بھی عبادت الٰہی کے لئے دریائے جہلم کے کنارے خانقاہ معلّٰی کا انتخاب کیا۔ حضرت بُلبُل شاہؒ کی زیارت گاہ، مزار سلاطین اور سید محمد امین اویسیؒ کا مقبرہ بھی جہلم کے کناروں پر واقع ہیں۔ دریائے جہلم پر متعدد جشن و تقاریب کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ غیر ملکی رہنما یا سیاسی شخصیات جب بھی کشمیر آتے تو ان کے اعزاز میں دریائی جلوس کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کے سالانہ عرس پر جہلم میں کشتی رانی کے مقابلے ہوتے تھے۔ جن میں شائقین کی بڑی تعداد ہوتی تھی۔ دریائے جہلم کا پانی صاف وشفاف تھا۔ موسم گرما میں سرینگر کے لوگ گرمیوں سے راحت پانے کے لئے جہلم کے کناروں پر وقت گذارا کرتے تھے۔ ڈونگوں میں رہائش پذیر کشتی باش کھانا بنانے اور پینے کے لئے جہلم کا پانی استعمال میں لاتے تھے۔ دریائے جہلم کے کناروں پر گھاٹ کے ساتھ پختہ سیڑھیاں موجود تھیں۔ جنہیں خواتین کپڑے دھونے کے لئے اور سرینگر کے لوگ پانی لانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اُس وقت سرینگر میں نلکوں کا رواج نہیں تھا شہر کی آبادی بڑھنے کے ساتھ پاخانوں کا رخ جہلم کی طرف موڑ کر اسے آلودہ بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی۔ موجودہ حکومت جہلم کے کناروں پر پارکیں اور گھاٹ تعمیر کر رہے ہیں۔ ماضی میں اکثر دریائے جہلم میں سیلاب آتے جس سے سرینگر اور جہلم کے

اردگرد گاؤں میں کافی مالی نقصان اور تباہی ہوتی۔ اگرچہ کچھ عرصہ سے جہلم میں سکوت طاری ہے حکومت نے جہلم کی شان رفتہ بحال کرنے کے لئے کوششوں کا آغاز کیا ہے۔ سیاحوں کے لئے موٹر بوٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جوزیرو برج سے لیکر صفا کدل تک دریائے جہلم میں سیر کر سکتے ہیں اور سرینگر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ سرینگر دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ جہلم کے معاون دریاؤں اور ندیوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

آرہ پتھ، اسلام آباد شہر کے قریب جہلم میں شامل ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ برنگی بھی جہلم میں یہاں پر شامل ہوتی ہے۔ شہر اسلام آباد سے تین میل کے فاصلے پر ایک اور ندی جس کا نام لدر ہے جہلم میں شامل ہوجاتی ہے۔ یہ شیش ناگ سے نکلتی ہے۔ بجبہاڑہ میں رمبی آرہ اور رومشی دریائے جہلم میں شامل ہوجاتی ہیں دودھ گنگا پرندی پیر پنچال پہاڑوں سے جنم لیتی ہے پھر چرار شریف سے لے کر سرینگر پہنچ جاتی ہے۔ بٹہ مالو اور چھتہ بل کے قریب سے گزرتے ہوئے صفا کدل کے قریب دریائے جہلم میں شامل ہوجاتی ہے۔ پوہرو ندی (Pohru) وادی کشمیر شمالی سرحد کی پہاڑی ڈھلوانوں سے نکل کر مغل پور کے قریب اس میں لولاب ندی شامل ہوتی ہے۔ یہاں سے جنوب کی طرف سوپور سے ۳ میل کے فاصلے پر دوآبگاہ گاؤں کے پاس دریائے جہلم میں شامل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جہلم میں سکھ ناگ اور فیروز پور نالہ بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ دریائے جہلم سوپور سے بارہمولہ اور بارہمولہ سے اوڑی پہنچ جاتا ہے یہاں سے جنوب کی جانب کشمیر اور پاکستان کی سرحد کے ساتھ بہتا ہوا منگلا جھیل میں داخل ہوتا ہے۔

پری محل

مغل بادشاہوں نے وادی کشمیر کے مختلف علاقوں کے ساتھ ساتھ سری نگر شہر میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ جن میں خاص طور پر نشاط باغ، شالیمار باغ اور چشمہ شاہی قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ایک یادگار پری محل بھی ہے۔ جو مغلوں کے ذوق تعمیر کا اعلیٰ اور شاندار نمونہ ہے سرینگر شہر سے کوئی چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر (ڈل گیٹ سے نشاط تک) قدرت نے ایک ایسا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جو دل کو فرحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا ہے۔ ایک طرف کوہ سلیمان (شنکر آچاریہ) پہاڑی اور زبرون پہاڑ دوسری طرف جھیل ڈل انسان کے ذہن پر اپنے نقوش چھوڑ دیتے ہیں۔ غالباً اسی سکون کی خاطر مغل شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی بیوی نادرہ بیگم کے نام پر اور اپنے استاد ملا شاہ کی خاطر زبرون کی اس پہاڑی کی ایک ڈھلوان پر پری محل تعمیر کروایا۔ اور اس کے کھنڈرات آج بھی اس کی شان و شوکت کی گواہی دیتے ہیں۔ پری محل کو کن، تولین کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی شکل ہندوستان کی ایک عمارت کن تولین سے ملتی تھی بہر حال پری محل جو کچھ بھی تھا یہ ایک صحت افزا مقام کے ساتھ ساتھ قدیم فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔

پری محل ڈل جھیل کے کنارے جنوب مشرق میں تقریباً ۲ کلومیٹر کے فاصلے پر اور چشمہ شاہی سے تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اور زبرون پہاڑی کی گود میں واقع ہے۔ ہیون سانگ کے مطابق اس جگہ یا اس کے آس پاس ایک بدھ وہار اور ستوپ رہا ہے۔ مگر اب یہاں پر کوئی پرانے آثار نظر نہیں آتے۔ پری محل دارا شکوہ نے شاہجہاں کے عہد میں اپنے استاد ملا آخون شاہؒ کے لئے نجوم کی ایک رسد گاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ وہ یہاں سے ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ پہاڑی ڈھلوان پر ذرا باہر کو نکلے ہوئے قطعہ کوہ پر کھڑے پری محل کی طرز پر یونانی مندروں کے اثر کا گمان ہوتا ہے۔ دارا شکوہ جو کہ شاہجہاں کا بڑا بیٹا تھا اور ہندوستان کے تخت کا وارث تھا۔ بڑا عالم اور فاضل تھا۔ آپ نے سنسکرت زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اور ہندو مذہب کی مقدس کتابیں بھی آپ نے پڑھی تھیں۔ دارا شکوہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا ایک نمونہ تھا۔ آپ نے اپنشد کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا نام ''سرا کبری'' رکھا۔

شہزادہ دارا شکوہ آخون ملا شاہؒ کی بڑی عزت کرتے تھے اور آپ ان کے روحانی کمالات سے بہت متاثر تھے۔ آپ نے ملا شاہؒ کی یاد میں ایک خوب صورت باغ ڈارنڈ میں تعمیر کیا۔ جو کہ سری نگر سے تقریباً شمال کی طرف ۱۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور اس باغ کو باغ ملا شاہؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس باغ سے آنچار جھیل کا نظارہ بڑا دلکش لگتا تھا۔ اس کے علاوہ شہزادہ دارا شکوہ نے کوہ ماران (ہاری پربت) کے وسط میں اپنے استاد

آخون ملا شاہؒ کے لئے ایک خوب صورت خانقاہ مسجد اور حمام تعمیر کروایا۔ اور مسجد کے آس پاس زائرین کے لئے دو الگ سرائیں بھی بنوائی گئیں۔

ملا شاہؒ بدخشاں سے ہندوستان وارد ہوئے آپ کا اصلی نام شاہ محمد تھا۔ آپ عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ آپ اپنے گھر سے نکل کر روحانی پیشوا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے لاہور پہنچ گئے اس وقت ہندوستان میں شاہجہاں کی حکومت تھی (۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) لاہور میں آپ کی ملاقات میاں میرؒ سے ہوئی جو بڑے بزرگ تھے۔ اور ان کی سرپرستی میں رہے۔ ملا شاہؒ میاں میرؒ کے روحانی کمالات سے متاثر ہوئے۔ آپ نے تیس سال تک میاں میرؒ لاہوری کی خدمت کی۔ اور ریاضت و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ جب آپ ہر طرح سے کامل ہو گئے۔ پھر اپنے مرشد کی اجازت سے کشمیر میں ۱۶۳۵ء کو تشریف فرما ہوئے کشمیر کی سیاحت کے دوران آپ کوہ ماران کے دامن میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں آپ کے لئے شہزادہ دارا شکوہ نے ایک خوب صورت خانقاہ اور مسجد تعمیر کی۔

دارا شکوہ اپنی بیگم نادرہ بیگم کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اور آپ کی بڑی عزت کرتا۔ ۱۶۳۹ء میں ملا شاہ نے دارا شکوہ کو قادری سلسلہ کی تربیت دی۔ مزید دارا شکوہ نے اپنے مرشد کے لئے زبرون پہاڑ کے ڈھلوان پر ایک خانقاہ تعمیر کروائی جس کو شہزادہ مذکور کی بیگم کے نام پر پری محل نام پڑ گیا۔ اس خانقاہ میں علمی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں زیادہ تر تصوف اور توحید کے بارے میں بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ مزید اسے علم نجوم

کی ایک رسد گاہ کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ اور یہاں پر ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کیا جاتا تھا۔

ملا شاہؒ کے ہاتھوں کئی لوگوں نے کفر ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ آپ دن رات عبادت الٰہی میں گزارتے تھے حالانکہ تیس سال تک ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوئے۔ آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ دنیاوی جاہ و حشمت سے آپ کو نفرت تھی۔ تقریباً ایک لاکھ شعروں کا دیوان ان کی تصنیف ہے۔ جب اورنگ زیب نے ۱۶۵۸ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے ۱۶۵۹ء میں داراشکوہ کو قتل کرایا تو حضرت ملا شاہؒ کو لاہور طلب کیا۔ کیونکہ اورنگ زیب کو پتہ چلا کہ ملا شاہؒ داراشکوہ کا روحانی پیشوا رہا ہے وہاں پر کئی سال گزارنے کے بعد ۱۶۶۱ء میں ملا شاہؒ لاہور آئے جہاں وہ انتقال کر گئے۔ یوں اپنے آخری دن مسافرت اور غربت میں گزارے شاہجہاں کی دختر شہزادی جہاں آراء ملا آخونؒ سے بہت متاثر تھی۔ یہ دونوں جب کبھی کشمیر آتے۔ ملا آخونؒ کے پاس تشریف لاتے اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ پری محل کی عمارت کے دائیں بائیں بالا دریاں ہیں اور مرکزی عمارت کے اوپر لگتا ہے شاید ماضی میں کوئی گنبد رہا ہوگا۔ باغ کے کل چھ طبقے ہیں جن میں فوارے رہے ہیں لیکن کسی ندی یا پن چادر کی کوئی نشانی موجود نہیں ہے۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ فواروں کے لئے پانی کی فراہمی کا کوئی زیر زمین بندوبست رہا ہوگا مغل طرز تعمیر کے اس نمونے کی پرانی شان بحال کرنے کے لئے دور حاضر میں کوشش ہوتی ہے اور اب یہاں ہر شام بجلی کا

چراغاں ہوتا ہے اور گرمیوں میں باغ پھولوں سے لہراتا نظر آتا ہے۔

مغل دور کے ایک عظیم فارسی شاعر ملا محسن فانی زندگی کے آخری ایام میں پری محل کی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ انہوں نے ۱۰۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ اپنی ذہانت اور قابلیت سے شاہجہاں بادشاہ کے منظور نظر بن گئے۔ پری محل جو کہ چشمہ شاہی کے مغرب میں واقع ہے ۴۴۰ فٹ رقبہ اراضی پر چھ چبوتروں پر مشتمل۔ محراب دار مغلوں کی یہ نشانی باقی مغل باغات سے کچھ مختلف ہے۔ یہاں دوسرے مغل باغات کی طرح آبشاروں کا سلسلہ نہیں ملتا۔ البتہ تالابوں کے نشان ملتے ہیں۔ اور یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ تالابوں میں فوارے موجود تھے جو زمین دوز بالوں سے پانی حاصل کیا کرتے تھے۔ پری محل کے ان چھ چبوتروں میں مختلف فن کے آثار ملتے ہیں۔ باغ کی لمبائی تقریباً چار سو فٹ اور چوڑائی مختلف چبوتروں میں ۱۸۰ فٹ سے ۲۰۵ فٹ تک ہے۔

سب سے اوپر والے چبوترے میں ایک بارہ دری اور پانی کا ایک ریز رویر دکھائی دیتا ہے۔ اوپر سے ایک چشمہ سے اس میں پانی آتا تھا۔ مزید بارہ دری کی دیواروں میں طاق نصب کئے گئے ہیں۔ دوسرے چبوترے کے عین بیچ ایک تالاب ہے جس کی لمبائی تقریباً ۶۰ فٹ اور چوڑائی ۲۶ فٹ ہے۔ تیسرا چبوترہ بڑا دلچسپ ہے اندر جانے کا راستہ پورے مغل فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ بیچ میں ایک چیمبر (Chamber) ہے اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اور اس کے شمال میں حمام بھی ہے مزید جنوب کی طرف

اور دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں شاید باورچی خانہ کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ چوتھے چبوترے میں دیکھنے کے لائق کچھ خاص نہیں ہے البتہ ایک تالاب کے کھنڈرات نظر آتے ہیں اس کے ساتھ ہی ایک بارہ دری بھی رہی تھی اور مٹی کی ایک پائپ ہے جو پانی کو آنے اور لے جانے کے کام آتی تھی۔ پانچویں چبوترے میں بارہ دری کا نچلا حصہ موجود ہے یہاں پر چھوٹے چھوٹے مربع سوراخ ہیں۔ جہاں پر کبوتر رہتے تھے۔ چھٹے چبوترے میں ایک مستطیل تالاب ہے اس کے ساتھ ہی خستہ حالت میں ایک گارڈ ہٹ ہے۔

نشاط باغ

۱۵۸۶ء تاریخ کشمیر کا وہ سال ہے جب کشمیر میں چک سلاطین کا خاتمہ ہوا۔ اور اکبر بادشاہ کا قبضہ کشمیر پر ہوگیا۔ اسی دوران مغلوں نے کشمیر میں لاتعداد باغات اور محلات زر کثیر خرچ کر کے تعمیر کئے۔ ہمیں مغلوں سے اگر کچھ ورثے میں ملا تو وہ تعمیرات اور فن ہے وہ اس فن میں ماہر تھے اور انہوں نے کشمیر کو اس فن سے مالا مال کیا خاص طور پر نشاط باغ، چشمہ شاہی، شالیمار، نسیم باغ اور اچھہ بل کو ملکہ نور جہاں کے بھائی۔ نشاط باغ شاہجہاں کے سُسر آصف جاہ (ممتاز محل کے والد) نے ۱۶۳۴ء میں بنوایا۔ یہ باغ زبرون کوہ کے دامن میں جھیل ڈل کے کنارے پر واقع ہے۔

ابتدائی ایام میں نشاط باغ دامن کوہ سے لے کر ڈل کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا اس کے بارہ برجوں پر بارہ طبقے تھے باغ کا پائین طبقہ اب سڑک کی زد میں آگیا۔ نشاط باغ کی لمبائی ۱۷۵۵ فٹ اور چوڑائی ۱۱۷ فٹ ہے۔ باغ کے ارد گرد دیوار بنی ہوئی ہے جس کی اونچائی ۱۳ فٹ ہے۔ موجودہ باغ دس طبقات پر مشتمل ہے جن سے تین طبقے ایک دوسرے سے ۱۶ سے ۱۸ فٹ اونچے ہیں۔ سارے باغ میں اوپر سے نیچے تک درمیان میں تالاب بنے ہوئے ہیں جن میں سے ۱۳ فٹ چوڑی اور ۱۸ انچ گہری نہر بہتی

ہے۔ نہر کے دونوں کناروں پر پتھر کی سلیں لگائی گئی ہیں۔ نہر کے بیچ فواروں کی قطاریں ہیں۔ نشاط باغ کے آبشاروں میں کچھ آبشاروں کی اونچائی ۱۲ سے ۱۸ فٹ تک ہے۔ باغ میں دو فاصلہ بارہ دریاں تھیں ایک تیسرے طبقے میں اور دوسری نچلے طبقے کی بارہ دری جو کہ اب اُٹھائی گئی ہے۔ بارہ دری میں خوب صورت پنجر کاری کی گئی تھی۔ اس کے عین وسط میں ۱۶ فٹ چوکور تالاب تھا۔ جس میں فوارے لگے تھے بارہ دری کی دوسری منزل میں مشرق سے مغرب کی جانب گزرگاہ تھی اور بائیں طرف ۲۵ فٹ لمبا اور ۱۶ فٹ چوڑا ہال نما کمرہ۔ اس میں بھی پنجر کاری کی ہوئی تھی۔ اسی طرز کا ایک چھوٹا ہال نما کمرہ تھا۔ دوسرے طبقے کے درمیان ۲۷ فٹ چوکور خالی جگہ تھی۔ جس میں سے پہلے منزل سے تالاب کا نظارہ دکھائی دیتا تھا بارہ دری کے سامنے والے طبقے پر فوارے لگا تالاب تھا۔

دوسری بارہ دری سب سے اوپر کے طبقے میں ہے جہاں پورے باغ کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک منزلہ بارہ دری ندی کے آر پار بنی ہے۔ جس پر ایک بالا خانہ ہے بارہ دری کے نچلے والے طبقے میں ۳ فٹ گہرا اور ۲۳ فٹ لمبا اور ۱۰ فٹ چوڑا تالاب ہے جس میں ۲۵ فوارے ہیں۔

جب شاہجہاں نے اس باغ کو ۱۶۳۴ء میں دیکھا تو اس کا دل مچل اُٹھا جس کا اشارہ اُس نے آصف خان کو بار بار دیا لیکن آصف خان نے سنی ان سنی کر دی۔ اس پر بادشاہ برانگیختہ ہوا اور ہارون میں ہی وہ سارا پانی بند کروا دیا جس سے باغ کی رونق تھی۔ پانی بند ہونے کی وجہ سے آصف خان

سخت پریشان ہوا۔ کہتے ہیں کہ اسی پریشانی کے عالم میں ایک دن اُس پر غنودگی طاری ہوئی اس کے ایک وفادار ملازم نے جا کر بند کیے گئے پانی کو چھوڑ دیا جس سے فوارے پھر سے مچلنے لگے اور آبشار جھوم اُٹھے۔ آصف خان نے جب آنکھیں کھولیں تو فوراً اس معاملے کی تحقیقات کا حکم دیا۔ اس پر ملازم نے اُس سے کہا کہ ''آپ کا دکھ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور اسی لئے بند پانی کو چھوڑ دیا۔'' آصف خان نے ملازم کو برطرف کیا لیکن دریافت کرنے پر جب ملازم نے بادشاہ کے سامنے اقبال جرم کیا تو بادشاہ اس کی وفاداری پر خوش ہو گیا اور آصف خان کے نام فرمان جاری کیا کہ وہ اس شرط پر نہر کا پانی استعمال کر سکتا ہے کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

باغ میں چھاؤں میں بیٹھنے کے لیے چنار کے قد آور درخت ہیں، پگڈنڈیوں کے ساتھ ساتھ سرو کے درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ باغ کے عقب میں پہاڑی اور سامنے ڈل جھیل ایک حسین اور دلفریب منظر پیش کرتے ہیں۔ نشاط کی صبح دیکھنے اور نظارہ کرنے کے لائق ہے جب ڈل کا لہروں سے کھیلنا اور پرندوں کی چہچہاہٹ قلب ونظر کو سکون عطا کرتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں باغ میں چراغوں سے چراغاں کیا جاتا تھا لیکن مہارجہ ہری سنگھ کے دور میں یہاں بجلی سے چراغاں کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

جس وقت باغ بنایا گیا۔ اُس وقت اس میں اندر آنے کے لئے ڈل کی طرف سے راستہ تھا۔ لیکن اب باغ کے دو طبقوں کو مسمار کر کے راستہ بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈل کے کنارے کے ساتھ کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی

ہے جہاں بیساکھی پر دکاندار اپنی دکانیں سجاتے ہیں۔

افغان دور میں عظیم خان (۱۸۱۴ء) نے باغ کی مرمت کی۔ اس کے بعد ڈوگرہ گورنر پنوں ۱۸۵۷ء نے یہ فرض انجام دیا۔ اس کے علاوہ اُس نے باغ میں ایک اور بارہ دری بھی تعمیر کرائی تھی۔ لیکن آج اس بارہ دری کا نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔ سکھ دور حکومت میں باغ کی بارہ دریوں میں سے لعل وجواہر نکال کر اُڑا لئے گئے۔ شیخ محمد عبداللہ کے عہد وزارت کے دوران ۱۸۷۸-۸۰ء میں باغ کی نئے سرے سے مرمت کی گئی۔

شالیمار باغ

اکبر نے ۱۵۸۶ء میں وادی کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملا لیا اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد کشمیر میں ڈالی اکبر کئی بار کشمیر کی سیر کو آیا۔ آخر اکبر کی وفات کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ جہانگیر نے کشمیر کو بجا طور پر جنت اراضی قرار دیا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مزید جہانگیر نے کشمیر ہی گوشۂ آخرت بنانے کی تمنا بھی کی تھی۔

از شاہ جہانگیر دَمِ نزع چو جس
یہ خواہش دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جہانگیر نے اکتوبر ۱۶۲۷ء میں کشمیر سے واپسی پر بہرام گلی (راجوری) میں انتقال کیا۔

جہانگیر کو قدرتی مناظر خاص کر کشمیر کے باغات اور سبزہ زاروں سے عشق تھا وہ بہت مرتبہ اپنے والد اور اپنی بیگم نور جہاں کے ہمراہ کشمیر آیا۔ جھیل ڈل میں شام کو چراغاں کرتا اور اس نظارے سے لطف اُندوز ہوتا۔ جہانگیر

تزک جہانگیری میں کشمیر کے بارے میں بیان کرتا ہے کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے اور درویشوں کے لئے ایک پھولوں سے بھرا ہوا ورثہ اس کے خوبصورت مرغزار دلکش چشمے دلفریب فوارے تعریف سے بالاتر ہیں۔ یہاں بے شمار بہتے ہوئے دریا اور آبشار ہیں جہاں تک نظر جاتی ہے سبزہ زار اور پھول ہیں جہانگیر نے اپنے عہد میں کشمیر میں خوبصورت مسجدیں اور خوبصورت باغات بنوائے ہیں۔ جن میں خاص طور پر شالیمار باغ، پتھر مسجد، ویری ناگ اور اچھ بل قابل ذکر ہیں۔ شالیمار ان ہی باغات میں سے ہے جو جھیل ڈل کے کنارے واقع ہے۔ اسے جہانگیر نے ۱۶۱۹ء میں تعمیر کروایا اور شاہجہاں نے اس میں ۱۶۳۰ء میں توسیع کی یہ باغ سرینگر سے ۱۳کلو میٹر کے فاصلے پر نشاط اور ہارون کے درمیان واقع ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں اس کے نام شالی مالی، شالامار اور شالہ باغ نظر سے گذرے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ ہارون میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک مشہور عابد سوکرام سوامی رہتے تھے۔ انہوں نے یاد الٰہی کے لئے ایک کٹیا بنائی تھی۔ راج پرورسین اس زمانہ میں کشمیر کا راجہ تھا۔ وہ سوکرام سوامی کی زیارت کے لئے ہارون کے مقام پر اکثر جایا کرتا تھا۔ پرورسین نے ہی سرینگر شہر آباد کیا۔ اس نے تقریباً ۶۰ سال حکومت کی۔ پرورسین نے یہاں پر ایک آرام گاہ بنوائی۔ اس کے علاوہ لوگوں نے بھی وہاں مکان نبوائے۔ رفتہ رفتہ مکانات ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئے۔ پرورسین نے اس علاقہ کو شالی مالی کا نام دیا اور رفتہ رفتہ شالیمار میں تبدیل ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا

کہ کسی اور بادشاہ نے اس باغ کی طرف کوئی توجہ بھی دی یا نہیں۔ آخر میں ۱۰۳۰ ہجری مطابق ۱۶۲۰ء میں شالیمار باغ کی تاریخ درج ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

چو شد آراستہ باغ فرح بخش
بحکم حضرتِ ظلِّ الٰہی
شہنشاہ شہاں شاہِ جہانگیر
کہ مشہور است ازمہ تا بماہی
پے تاریخ ایں گلزار ریاں
خرد فرمود فرحت گاہ شاہی

مغل باغات ایک مخصوص طرز پر بنائے گئے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ باغ کو کئی طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر طبقہ دوسرے سے قدرے بلند تر ہوتا ہے۔ اوپر کے طبقہ سے نچلے طبقہ پر نہر کا پانی آبشار کی صورت میں گر کر ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ شالیمار باغ، جھیل ڈل سے ایک مصنوعی نہر سے ملا ہوا ہے جو ۳۶ فٹ کھلی اور تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر لمبی ہے۔ اس نہر کے اردگرد خوبصورت درخت لگے ہیں۔ شالیمار کی لمبائی تقریباً ۱۷۰۰ فٹ ہے اور چوڑائی ۶۰۰ فٹ ہے۔ شالیمار باغ کے اردگرد ایک فصیل اینٹوں اور پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ جس پر کئی برج ہیں۔ دیوار کی اونچائی ۱۰ فٹ ہے۔

باغ میں چار طبقے ہیں۔ سب سے نیچے والا طبقہ عوام کے لئے مخصوص تھا جس کو دیوان عام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ پہلے طبقہ سے

بڑا ہے جس کے اندر دیوان خاص ہے۔ درمیانی طبقہ میں ایک دلکش بارہ دری ہے۔ جس سے سارے باغ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ جھیل ڈل بھی وہاں سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ ہر طبقہ میں فواروں کی قطار سے عجیب سماں دکھائی دیتا ہے۔ آبشار کا پانی سوراخ دار پتھر میں سے گذر کر نچلے طبقہ پر گرتا ہے۔ یہ پانی دھیمی رفتار کے ساتھ حوض میں سے بہتا ہوا فواروں کو پہنچتا ہے۔

چوتھا طبقہ خاص طور پر مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے لئے وقف تھا یہاں پر کالے رنگ کے سنگ مرمر کا تخت ہے۔ جس میں بادشاہ گرمی کے موسم میں قیام کرتا تھا یہ تخت ۳ فٹ زمین سے اونچا ہے۔ باغ کے وسط میں ایک نہر بہتی ہے۔ نہر کا پانی ہارون نہر سے آتا ہے اور پر والے طبقہ سے پانی نیچے والے طبقہ میں جا گرتا ہے پھر وہاں سے جھیل ڈل میں جاملتا ہے۔ جہانگیر نے شالیمار باغ کا نام فرح بخش رکھا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں شاہجہاں نے شالیمار باغ کی سیر کی تو آپ نے اس باغ کو وسعت دی اور کشمیر کے صوبیدار ظفر خان احسن کو حکم دیا کہ وہ فرح بخش کو آراستہ کریں۔ اور اس کے ساتھ ایک اور طبقہ فیض بخش کے نام سے تعمیر کرے۔ ظفر خان احسن باغ فیض بخش اور فرح بخش کی تعریف میں کہتے ہیں۔

ہست اگر دو عالم عیش و طرب خلد بریں
فیض بخش است و فرح بخش است بروئے زمین

شالیمار باغ کے عقب میں زبرون اور مہادیو پہاڑ ایک خوبصورت اور دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔

باغ میں بیٹھنے کے لئے چنار کے قد آور درخت ہیں۔ پگڈنڈیوں کے ساتھ سرو کے درخت پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ سامنے جھیل ڈل ایک حسین اور دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ شالیمار کی صبح قابل دید ہے۔ جب پرندوں کی چہچہاہٹ دل کو سکون عطا کرتی ہیں۔ شاہجہاں کے بعد ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کشمیر آئے۔ انہوں نے شالامار باغ میں بڑے شان و شوکت سے جشن منایا۔ چراغاں کا اہتمام بھی کیا۔ ان کے بعد کوئی مغل بادشاہ اس باغ کی طرف متوجہ نہیں ہوا شالیمار کشمیر کے سب مغل باغات میں دلکش اور خوبصورت ہے۔ اس وقت دنیا کے تمام پھل دار درختوں اور پھولوں کی جھاڑیوں سے یہ باغ بے نظیر تھا۔ جہانگیر اور نور جہاں تو اس باغ پر ایسے فریفتہ تھے کہ بہار کا موسم کشمیر میں گذارتے تھے۔ نہر پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پُل قائم کر کے ان پر خوبصورت بارہ دریاں اور شہہ نشین سنگ مرمر کے بنائے۔ شالیمار باغ قومی یکجہتی کی ایک زندہ مثال ہے۔ ہر سال مختلف فرقوں کے لوگ اس باغ میں آتے ہیں۔ اور آپس میں بلا تفریق مذہب وملت رنگ ونسل اس کی کیاریوں آبشاروں، پھل دار درختوں کے زیر سایہ خوب گھل مل جاتے ہیں۔ ایسا خوبصورت نظارہ ملک میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ شالیمار باغ موسم سرما کے بعد پہلی دفعہ بیساکھی کے موقعہ پر عوام کے لئے کھول دیا جاتا ہے۔ اور یہاں خوب بیساکھی کا میلہ لگتا ہے۔

اس باغ کو دیکھنے کے لئے ہندوستان اور بیرونی ممالک سے سیاح آتے ہیں۔ پورے موسم گرما میں شالیمار باغ میں خوب چہل پہل رہتی ہے

۔شالیمار باغ نے اپنے قدرتی محل وقوع سدا بہار چناروں، شاداب بارہ دریوں اور دلفریب پہاڑی پس منظر کی وجہ سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔شام کے وقت فواروں میں رنگا رنگ بجلیاں عجیب نظارہ پیدا کرتی ہیں۔باغ کی شان اور دلفریبی کا دارومدار اس کے فواروں پر ہے۔باغ کے ہر طبقہ میں ہریالی اس طرح بچھی ہے گویا مخمل کا فرش ہے۔چنار اور دوسرے درخت خاص طور پر ترتیب سے لگائے گئے ہیں۔پھل دار درخت بھی بکثرت موجود ہیں۔باغ میں اتوار کے دن خاص چہل پہل ہوتی ہے لوگوں کی ٹولیاں اُدھر اِدھر گھومتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔جھیل ڈل میں کشتیوں کے ذریعے سیر کرتے ہوئے لوگ باغ میں داخل ہوتے ہیں۔باغ میں دو دروازے ہیں ایک داخل ہونے کے لئے۔دوسرا باہر نکلنے کے لئے۔ماضی میں سرکار کی طرف سے شب شالیمار کی تقریب کا اہتمام کیا جاتا تھا۔کچھ سماج دشمن لوگ باغ میں پھولوں اور سبزہ زار کو پامال کرتے ہیں اور یہاں کھانا پکا کر اور فواروں میں برتن دھو کر ہر طرف گندگی پھیلاتے ہیں۔جن سے باغ کی خوبصورتی اور صفائی متاثر ہوتی ہے۔کشمیر کے شالیمار باغ کے نام پر اور جو دیگر باغ مختلف مقامات پر تعمیر کئے گئے ان میں شالیمار باغ، لاہور شالیمار باغ، دہلی شالیمار باغ، راجوری، کپورتھلہ اور شالیمار باغ پٹیالہ (پنجاب) قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

چشمہ شاہی

مغلوں نے جب کشمیر پر قبضہ کیا تو انہوں نے یہاں خوبصورت باغات تعمیر کیے، مغل فن تعمیر کے بڑے دلدادہ تھے۔ انہوں نے سرینگر میں اپنی بہت ساری یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں نشاط، شالیمار اور پری محل اور ایک یادگار چشمہ شاہی ہے جو مغلوں کے ذوق تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ یہ سرینگر سے ۹ کلومیٹر دور ہے۔ چشمہ شاہی کے ایک طرف شنکر آچاریہ پہاڑی ہے اور دوسری طرف زبرون پہاڑ اور اس کے دامن میں چشمہ شاہی واقع ہے۔ اس باغ کی بنیاد ۱۶۴۲ء میں شاہجہاں کے حکم سے اُس وقت کے گورنر کشمیر علی مردان خان نے انجام دی۔

علی مردان خان کشمیر کا گورنر دو دفعہ رہا ہے پہلی دفعہ ۱۶۴۱ء سے ۱۶۴۲ء تک اور دوسری بار ۱۶۵۰ء سے ۱۶۵۷ء تک۔ یہ اصلی ایران کا رہنے والا تھا اور شاہجہاں کی ملازمت میں داخل ہوگیا۔ اس نے کشمیر میں بہت سارے باغات اور سرائے بنوائیں۔ مغل روڑ کی مرمت کی اور اس شاہراہ پر چشمے بنوائے۔ اِس نے نوشہرہ کے نزدیک ایک وسیع دلکش باغ اور محل تعمیر کرایا۔ جس باغ کا نام اب تک باغ علی مرداں خان ہے۔ آخر ۱۶۵۷ء میں آپ کو کشمیر سے تبدیل کردیا گیا۔

چشمہ شاہی باغ میں ایک خوبصورت چشمہ ہے جس کا پانی لذیز، میٹھا اور ٹھنڈا ہے۔ باغ کے تین طبقے ہیں پہلے طبقے میں ایک تالاب ہے جس سے فوارے اُٹھتے ہیں۔ تالاب کے اردگرد خوبصورت پنجر کاری کی گئی ہے۔ باغ کو اب زیادہ وسعت دے دی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ سیاح لُطف اندوز ہوسکیں۔ شام کے وقت سیاحوں کے لئے روشنی کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ باغ کے اردگرد ایک فصیل کھڑی ہوئی ہے جس کی اونچائی تقریباً ۷ فٹ ہے۔ باغ میں چھاؤں میں بیٹھنے کے لئے چنار کے درخت ہیں۔ پگڈنڈیوں کے ساتھ ساتھ سرو کے درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ باغ کے عقب میں زبرون پہاڑی اور سامنے ڈل جھیل ایک حسین اور دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔

ہر سال مختلف فرقوں کے لوگ اس باغ میں آتے ہیں اور آپس میں بلا تفریق، مذہب وملت، رنگ ونسل اس باغ کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ شام کے وقت فواروں میں رنگارنگ بجلیاں خوبصورت سماں پیدا کرتی ہیں۔ یہ باغ نشاط سے اڑھائی میل دور ہے اس باغ کی لمبائی ۳۴۰ فٹ اور چوڑائی ۱۲۶ فٹ ہے۔ باغ میں اتوار کے دن خاصی چہل پہل ہوتی ہے۔ کچھ لوگ باغ میں پھولوں کو پامال کرتے ہیں اور فواروں میں برتن دھوتے ہیں۔ جن سے باغ کی خوبصورتی اور صفائی متاثر ہوتی ہے۔

☆☆☆

ہارون

کشمیر جو قدرتی مناظر کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے ۔ اور یہ علم وادب کا گہوارہ بھی رہا ہے یہاں بڑے بڑے عالم وفاضل پیدا ہوئے جو کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے کشمیر کو ''ریشہ واری'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ہر جگہ آثار قدیمہ کے نشانات نظر آتے ہیں جن کی وابستگی بُدھ مذہب ، ہندودھرم اور اسلام سے رہی ہے۔ ان ہی آثار قدیمہ میں بُدھ دھرم کے آثار ہارون میں پائے جاتے ہیں ہارون ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو سرینگر سے تقریباً ۱۸ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

ہارون میں ایک مشہور باغ ہے جہاں پر سیاح لوگ ہر اتوار کو آکر قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر پہلے پانی کا ذخیرہ سر بند تھا اور یہی پانی نلکوں کے ذریعہ سرینگر کے لوگوں کے لئے پینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

تاریخی لحاظ سے ہارون کی بڑی اہمیت ہے یہاں پر کشان دور کے آثار قدیمہ کے نشانات زبرون پہاڑی کے دامن میں نظر آتے ہیں ۔ ابو الفضل نے ہارون کو پڑگنہ پھاگ سے یاد کیا ہے ۔ یہ آثار قدیمہ اس وقت کے ہیں جس وقت کشمیر میں مہاراجہ کنشک کی حکومت تھی ۔ کشان خانہ بدوش

قبیلہ سے تھے اور وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے جو کہ چین کے نزدیک ہے اس خاندان کا مشہور بادشاہ کیڈفس رہا ہے اور اس کے بعد اس کا لڑکا کنشک بادشاہ بن گیا۔ آپ کشان خاندان کے مشہور بادشاہ گذرے ہیں۔ مہاراجہ کنشک بدھ مذہب کا پیروکار تھا۔ آپ نے بدھ مذہب پھیلانے کے لئے بہت سارے کام کیئے۔

مہاراجہ کنشک سنسکرت کا بڑا ودھوان تھا۔ کنشک کے جانشینوں نے شمال مغرب ہندوستان میں ۱۶۲ء تک حکومت کی۔ سٹین پہلا آدمی تھا جس نے ہارون میں کھدائی کے دوران بدھ مت کے آثار قدیمہ دریافت کیئے۔ خیال کیا جاتا ہے۔ جب مہاراجہ کنشک کشمیر کا بادشاہ تھا۔ تو آپ کے وقت میں ایک بدھ عالم ناگ ارجن کشمیر تشریف لائے اور آپ نے اپنے خیالات اور فلاسفی کی تعلیم یہاں کے لوگوں کو دی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آپ کے وقت میں ہی ہارون میں بدھ مندروں کی تعمیر ہوئی تھی۔ مہاراجہ کنشک نے ناگ ارجن کی سربراہی میں بدھ مذہب کی چوتھی عالمی کانفرنس ہارون میں بُلائی یہاں بدھ مت کے بڑے بڑے عالم ہندوستان، چین، تبت اور کاشغر، یارقند سے تشریف لائے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں پر ہی بُدھ دھرم کے دو فرقے ہوئے ''ہن یان، مہایان'' اور بدھ مذہب کی تعلیم اور اس کے اصول پتھروں پر لکھ کر زمین کے نیچے محفوظ کیئے گئے۔

بُدھ وہار کے کھنڈرات آج بھی ہارون میں نظر آتے ہیں اور مندر میں مختلف طبقے ہیں جو آپس میں سیڑھیوں کے ذریعے ملتے ہیں۔ وہار کے نزدیک

دو چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں ان چشموں کا استعمال وہاں کے لوگ کرتے تھے۔ یہ وہار سامنے کی طرف سے مربع اور پیچھے سے گول شکل کا ہے۔ وہار میں چھوٹے چھوٹے مستطیل شکل کے کمرے ہیں۔ یہاں پر کوئی موتی وغیرہ نہیں ملی۔ لیکن یہاں پر خوبصورت اینٹیں دریافت ہوئی ہیں۔ جو کہ مختلف ڈیزائن کی ہیں ان اینٹوں پر مختلف اقسام کے بیل بوٹے پھول، بطخ، مرغے جو آپس میں لڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بیلوں کی لڑائی گائے کے بچہ کا اپنی ماں سے دودھ پینا۔ بارہ سنگا ہرن ناچنے والی لڑکی ڈرم بجاتے ہوئے آدمی تیر کمان لیتے ہوئے ایک لڑکا پھولوں کی مالا پہنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مزید ان اینٹوں کی مشابہت وسط ایشا کے ممالک کے رہن سہن اور لباس سے تھی ۱۹۴۵ء میں رام چند کاک جو کہ اس وقت محکمہ آثار قدیمہ کا ڈائریکٹر تھا اور بعد میں جموں کشمیر کا وزیر اعظم بن گیا۔ کے زیر سرپرستی ہارون میں کھدائی کا کام شروع ہوا۔ مہاراجہ کنشک کے وقت میں بُدھ مذہب کا کشمیر میں عروج حاصل ہوا۔ اور آپ نے اپنے تمام سرکاری اہلکاروں کو بدھ مذہب کو پھیلانے کے لئے مقرر کیا۔ آپ نے بدھ بھکشوں کو کشمیر سے چین، تبت کاشغر اور وسطی ایشیاء ملکوں کی طرف بدھ مذہب پھیلانے کے لئے روانہ کیا۔ مہاراجہ کنشک بڑا عالم تھا۔ عالموں اور شاعروں کی عزت اور قدر کرتا تھا۔ مہاراجہ کنشک ۱۵۰ء میں انتقال کر گیا۔ آپ نے تقریباً ۲۳ سال حکومت کی ۱۲۷ء میں تحت نشین ہوا۔ سرزمین کشمیر نے بُدھ مذہب کو پھیلانے میں شاندار رول کیا اور یہ اس فرقہ کا ایک اہم مرکز مہاراجہ

کنشک کے دور میں رہا۔ اور بہت سارے ممالک سے عالم اور یاتری مذہب سیکھنے کے لئے کشمیر آئے۔ کہا جاتا ہے گوتم بُدھ نے کشمیر کے معتدل موسم اور خوبصورت نظاروں کی تعریف کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر عبادت کے لئے ایک موزوں جگہ ہے۔ کشمیر اور وسط ایشیاء کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ ناگ ارجن جنوبی ہندوستان میں ایک برہمن کے گھر پیدا ہوا بچپن سے ہی اس کو سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ آپ نے اپنی زندگی بُدھ مذہب کے پرچار کے لئے وقف کی۔ اور نالندہ میں آپ نے بُدھ بھکشوں کو مذہبی تعلیم دی۔ آپ بُدھ فرقہ کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ آپ غالباً پہلی عیسوی صدی میں پیدا ہوئے پھر آپ کشمیر تشریف لائے آپ ایک شاعر، فلاسفر، طبیب اور بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ نے اپنی زندگی ہارون کشمیر میں گذاری اور چوتھی عالمی بُدھ کانفرنس جو کہ کشمیر میں منعقد ہوئی کے روح رواں تھے۔ مہاراجہ کنشک کی سلطنت کا دارالخلافہ پشاور تھا آپ نے بہت سارے وہار اور مندر کشمیر میں تعمیر کئے اور ایک شہر آباد کیا جس کا نام کانسپورہ رکھا گیا ہے۔ جو آج بھی اسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور بارہمولہ سے تقریباً 9 کلومیٹر دوری پر ہے۔

مزید ساتویں صدی تک ملکی اور غیر ملکی بودھ عالم، گیان اور عرفان حاصل کرنے کے لئے کشمیر آتے رہے۔ ساتھ ہی کشمیری بودھ عالم دور دراز ممالک کا رُخ کر کے مہاتما بُدھ کے گیان اور عرفان کے پیغام کی خوشبو پھیلاتے رہے۔ کشمیر کے عالم اور بھکشوں چین میں بودھ مذہب کا پرچار

کرنے میں رہنما یانہ رول ادا کرتے رہے۔ ناگ ارجن کا کشمیر سے زیادہ
ہی تعلق رہا ہے۔ ''اشوک اودان'' اور ''دیوی اودان'' دونوں کتابیں اس
بات کی گواہ ہیں کہ خود مہاتما بدھ کشمیر تشریف لائے تھے۔ وسط ایشیاء میں
بودھ دھرم کا پرچار کرنے والوں میں کشمیری بھکشوں کا رول نہ صرف نمایاں
بلکہ قابل قدر رہا ہے۔ ''سنگھ بوتی'' گوتم سنگ'' ''بدھ جیوو'' وہ بلند قامت
کشمیری ہیں۔ جنہوں نے اپنی ذہانت اور متانت سے سارے وسط ایشیاء کو
حیرت میں ڈال دیا اور کشمیریوں کی صلاحیت کے جھنڈے دور دراز علاقوں
میں گاڑھ دیئے۔ کشمیری کاریگروں نے وہار اور ستوپ کو یکجا کر کے ایک نئ
شے کو وجود بخشا تبت اور لداخ میں بودھ دھرم کو فروغ دینے میں نمایاں کام
کشمیریوں نے انجام دیا ہے۔ کشمیر کم وبیش چودھویں صدی تک بودھ دھرم کا
مرکز رہا ہے۔ کشمیر کے بودھ عالم تبت چین کا شعر، ختن سمیت دوسرے
ممالک میں بدھ مذہب کا پرچار کرنے کے لئے جاتے رہتے تھے۔

ہارون کو چھ چشموں کا مجموعہ بھی کہا جاتا ہے یہ تقریباً شالیمار سے ۵ کلو
میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اس کو ''کتری دج'' کے نام سے بھی یاد کیا
جاتا ہے یہ بدھ آثار قدیمہ یہاں اس وقت دریافت ہوئے جب ایک نہر کی
کھدائی ہو رہی تھی۔ اور مزید کھدائی کا کام ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک
ہوا۔ ہارون بدھ مذہب کا ایک عظیم مرکز تھا اور اس کا نام ''بدھ ستوا'' پڑ گیا۔
پہلی صدی عیسوی مہاراجہ کنشک کے وقت میں جو بدھ کانفرنس منعقد ہوئی
اس میں جو بھی فیصلے اس کانفرنس میں طے ہوئے ان کو تانبے کے کتبوں پر

کنندہ کیا گیا۔ اور پتھر کے صندوقوں میں بند کر کے ان کو محفوظ جگہوں میں رکھا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتبے اس وقت بھی زمین کے اندر محفوظ ہیں۔ اور محکمہ آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ شاید پہلگام، شوپیان، کانسپورہ، بارہمولہ کنزلون، گریز اور کنٹولین، (علاقہ چشمہ شاہی سے ہارون تک) میں زمین دوز ہیں بدھ مذہب کے پیروکاری بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کرتے ہیں کہ کب یہ خزانہ دریافت ہو جائے۔ اور اس سے کشمیر میں بُدھ مذہب کی عظمت کا پتہ چل سکے۔ راقم کو آج سے بہت سال پہلے مشہور تاریخ دان مرحوم پیرزادہ محمد امین ابن مہجور سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اس بات پر متفق تھے۔ کہ کشمیر کے کسی کونے میں یہ تابنے کے کتبے دفن ہیں۔ جن میں بدھ مذہب کے دو فرقوں ہن یان اور مہایان اور چوتھی بدھ کانفرنس کا مواد درج ہے۔

برزہامہ

برزہامہ کشمیر میں اب تک دریافت شدہ ایسا علاقہ ہے جو کہ تاریخی لحاظ سے بڑا اہم ہے۔ جو منجوداھارااور ہڑپا تہذیب سے بھی پُرانا ہے۔ برزہامہ شالیمار اور نسیم باغ کے درمیان سرینگر سے ۲۴ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ گاؤں ایک ٹیلے (کریوا) پر جھیل ڈل کے شمال مشرق کی طرف آباد ہے۔ کشمیر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں پر ہزاروں سالوں سے لکھی ہوئی تاریخ درج ہے جس میں کشمیر کی تاریخ کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جنوب مغرب کشمیر آثار قدیمہ سے بھرا پڑا ہے کشمیر پہلے ایک بڑی جھیل تھی۔ اور آبادی بالکل نہ تھی یہ پہاڑ فصیل سے گھیرا ہوا جھیل تھا۔ آخر کار بارہمولہ کے پاس کھادنیار میں پہاڑ کا ٹکڑا کاٹا گیا اور پانی کے بہاؤ میں سدراہ بنا۔ اور آخر کار جھیل کا پانی نالے کے راہ سے بہہ گیا اور خشک زمین نکل آئی۔ اور کچھ جگھوں نے ٹیلوں (کریوا) کی شکل اختیار کی اور آہستہ آہستہ لوگ یہاں بسنے لگے۔ یہ لوگ کشمیر میں ناگاؤں سے پہلے سکونت پذیر ہوئے۔

مرحوم ڈاکٹر کے ایم اشرف کے مطابق اگر کشمیر میں کسی بھی جگہ کھدائی کی جائے تو وہاں پر کشمیر کے آثار قدیمہ مل سکتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے کشمیر مختلف تہذیبوں کا گھوارہ رہا ہے۔ یہاں پر ناگ، پشاش، آریہ ہون، اور

کشان آ گئے۔ اس کے بعد ہندو مذہب ، بُدھ مذہب اور مذہب اسلام آ گیا۔ برزہامہ سرینگر کے شمال مشرق میں مہادیو پہاڑ کے دامن میں جھیل ڈل اور تیل بل کے کناروں سے تقریباً ۲ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔
برزہامہ ٹیلہ سے سرینگر کا خوبصورت نظارہ دیکھا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ دور سے پیر پنچال پہاڑیوں کا دلکش نظارہ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ کشمیر کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ برزہامہ دو الفاظ کا مرکب ہے برزہوم برزر سنسکرت لفظ بھوج اور کشمیری برزہ اور ہوم گھر اس طرح اس مرکب کے معنی بھوج پتر کی جگہ ممکن ہے کبھی اس جگہ بھوج پتر کے درخت رہے ہوں برزہامہ کی قدیم بستی پہلی دفعہ ڈی تارا اور پیٹرسن نے دریافت کی ۔ جو کہ آثار قدیمہ کے ماہر تھے اور کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ سے ۱۹۲۸ء میں کشمیر آئے اور یہاں پر گڑھے دریافت کئے ان گڈھوں کے اندر اس زمانے کے لوگ سکونت پذیر تھے محکمہ آثار قدیمہ نے برزہامہ میں مزید کھدائی ۱۹۶۱ء سے لیکر ۱۹۸۲ء تک کی اور اس کی سربراہی ٹی این خزانچی نے کی۔
بتایا جاتا ہے یہ لوگ جوان گڈھوں میں رہتے تھے یہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح کے ہیں۔ اس دریافت سے، اس وقت کے کشمیر کے تہذیب وتمدن کا پتہ چل سکتا ہے۔ پتھر کے زمانے کے ختم ہونے کے بعد برزہامہ کے لوگ ٹیلوں اور کریوں پر چڑھ گئے اور وہاں پر گڈھے کھود کر ان میں رہائش اختیار کرنے لگے۔ یہ گڈھے دہانے سے تنگ اور نیچے کافی کشادہ کھودے جاتے تھے۔ ان گڈھوں کی وسعت وہاں پر رہنے والوں کی ضروریات پر

منحصر ہوا کرتی تھی۔ ان گڈھوں کی گہرائی تین سے پانچ فٹ تک تھی۔
گڈھوں کے اردگرد ستونوں کے نشان یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ ان گڈھوں
کے اوپر ستونوں پر بھوج پتر کی چھت بنائی جاتی تاکہ بارش یا برف ان
گڈھوں کے اندر نہ جاسکے برزہامہ میں بھوج پتر کے استعمال کا پتہ وہاں
بھوج پتر سے چلتا ہے جو کھدائی کے دوران بھاری مقدار میں برآمد ہوا۔
گڈھوں کے اندر جانے کے لئے سیڑھی سی بنائی جاتی تھی۔ گڈھوں کے اندر
راکھ، کوئلہ اور مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن اس بات کا اشارہ دیتے ہیں۔ کہ
ان میں انسان بود باش کرتے تھے۔

گڈھوں کے اوپر مٹی کے چولہے اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ برزہامہ
کے لوگ گڈھوں کے اوپر بھی رہتے تھے۔ اور یہ طریقہ گرمیوں میں اختیار
کیا جاتا ہوگا۔ گڈھوں میں رہنے کا طریقہ کشمیر میں ان قدیم لوگوں نے سخت
سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے اختیار کیا ہوگا۔ ان گڈھوں کے علاوہ برزہامہ میں
مربع اور مستطیل زمین دوز کمرے بھی دریافت کیئے گئے ہیں کئی گڈھوں میں
پتھروں کے اور کئی میں مٹی کی چکیاں ملی ہیں یہ چیزیں وہاں پر رہنے کا پتہ دیتی
ہیں۔ اس دور کے لوگ ہاتھوں سے بنائے ہوئے مٹی کے برتن استعمال کرتے
تھے۔ اس طرز کے برتن آج بھی کشمیر کے دور دراز گاؤں میں نظر آتے ہیں۔
برزہامہ میں دیکھا گیا کہ وہاں ہڈیوں کے اوزار تیار کرنے کا فن کافی ترقی یافتہ
تھا۔ وہاں ملے ہڈیوں کے اوزار میں مچھلیاں پکڑنے کا سامان، سوئیاں،
تیروں کے بھلے، چھریاں اور برش نما اوزار شامل ہیں۔

برزہامہ کے اردگرد خاص قسم کی قبریں بھی ملی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے
کہ وہاں مردوں کو گھروں کے برآمدوں یا صحنوں میں دفن کیا جاتا تھا۔قبروں
کے اندر چونے سے لپائی کی جاتی تھی۔ کئی قبروں میں فقط ڈھانچے اور کئی
میں سالم ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں۔کئی قبریں ایسی ہیں جہاں جانوروں
کے ڈھانچے اور ہڈیاں ملی ہیں۔جن جانوروں کے ڈھانچے دستیاب ہوئے
ہیں ان میں کُتے، بھیڑ اور جنگلی بکرے شامل ہیں۔لگتا ہے کہ یہ جانور مردوں
کے ساتھ بطور قربانی دفن کئے گئے ہیں۔

برزہامہ کے آخری دور میں بڑے بڑے پتھر بطور یادگار نصب کئے
گئے ہیں۔اس دور کی خاص بات چکر پر بنے مٹی کے برتن ہیں۔اب پتھروں
اور ہڈیوں کے اوزار کا استعمال محدود ہوگیا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں کی
تعمیرات کے علاوہ وہاں دھات سے بنی بعض اشیاء بھی ملی ہیں۔ برزہامہ میں
تراشیدہ پتھر کی سل ملی ہے۔جس پر کسی قدر نقش ونگار بنے ہوئے ہیں۔اگر
چہ سیل ٹوٹ پھوٹ سی گئی ہے لیکن سل پر کندہ منظر ہانگل کے شکار کا ہے۔اس
ہانگل کے پیچھے ایک شخص بھالا لئے ہوئے ہے اور آگے کوئی شخص تیر چلا رہا
ہے۔اس منظر کے اوپر ایک کتے کے علاوہ سورج کی شکل بھی بنی ہے برزہامہ
کے پتھر کے زمانے کی تہذیب ملک کے دیگر حصوں میں اس دور کے آثار
قدیمہ سے بالکل الگ ہے۔ پتھروں اور ہڈیوں کے اوزار گڈھوں میں
بود باش انسانوں کے ساتھ جانوروں کا دفن کرنا ہمارے اس قدیم تہذیبی دور
کو شمال چین، وسط ایشیاء، روس، افغانستان اور ایران میں دریافت کئے گئے

آثار قدیہ سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ جو برزہامہ میں ان گڈھوں میں چار ہزار سال پہلے رہتے تھے مچھلیوں اور جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ یہاں پر یہ چیزیں ان کو آسانی سے مل جاتی تھیں کیونکہ یہ علاقہ مہادیو پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور شکار کئے جانے والے جانور یہاں آسانی سے مل جاتے تھے اور جھیل ڈل بھی تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔ جہاں سے یہ مچھلیوں کا شکار بہ آسانی کر سکتے تھے۔

مزید برآں ۱۹۶۴ء میں کھدائی کے دوران برزہامہ میں ایک ایسا پتھر ملا ہے جس پر کہ کھدائی کا جب مطالعہ کیا گیا۔ تو اس پر سب سے قدیم "Supernova" (تارے کا غیر معمولی طور روشن ہونا اور ٹوٹ پھوٹ ہونا) کا نقش کندہ سا پایا گیا۔ اس بات کا انکشاف ممبئی کے ٹاٹا ادارہ مبادی تحقیق'' (Tifa) کے ایک ماہر فلکیات ڈاکٹر واہیا نے کیا ہے۔ اسے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ کشمیری تقریباً پانچ ہزار سال پہلے بھی اُس زمانے کے معیار کے مطابق اچھے ماہر فلکیات رہے ہیں۔

شیر گڈھی

شیر گڈھی محلات کو اس وقت بھی باغ کو ختم کر کے تعمیر کیا گیا جو ڈار باغ کے نام سے مشہور تھا یہ باغ سیف ڈار کی ملکیت تھی سیف ڈار کشمیر کا دولت مند اور نامور شخص تھا۔ سلطان حسن شاہ اور سلطان محمد شاہ کے زمانے میں وزارت کے قلمدان کو سنبھالے ہوئے تھا۔ یادالٰہی میں کبھی کوتاہی نہ کرتا تھا جگہ جگہ مسجدیں، خانقاہیں اور باغات بنوائے۔ عدل وانصاف میں بے نظیر تھا۔

شیر گڈھی کا قلعہ ۱۷۷۴ء میں پٹھان گورنر امیر خان جوان شیر نے تعمیر کروایا۔ اور اسی کے نام پر اس کا نام شیر گڈھی رکھا گیا امیر خان کشمیر کی خوبصورتی سے بڑا متاثر تھا۔ اس نے جھیل ڈل میں ایک مصنوعی جزیرہ بنوایا اور سرینگر کا پہلا پل امیرا کدل اور اپنا محل شیر گڈھی بنوائے۔ جسے پہلے ڈار باغ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ آپ کشمیر کے پٹھان گورنر ۱۷۷۲ء سے ۱۷۷۶ء تک رہے۔

قلعہ شیر گڈھی سرینگر شہر کے عین بیچ میں ڈُبجی گھاٹ کے مدِ مقابل دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس کے مغرب میں گول باغ اور شہید گنج شمال کی جانب کوٹہ کوہل، مشرق میں دریائے جہلم اور جہلم کے پار مائسمہ اور بسنت باغ ہیں۔

ڈوگرہ عہد میں جب اس کی مرمت کروائی گئی اُس وقت اس کا نام تبدیل کر کے نرسنگھ گڑھ رکھا گیا۔ لیکن یہ پھر بھی شیر گڈھی کے نام سے ہی مشہور ہے۔ قلعہ شیر گڈھی ۴۷۰ گز چوڑا اور ۲۰۰ گز لمبا ہے۔ چاروں طرف دلدل اور ندیاں ہونے کی وجہ سے دفاعی لحاظ سے یہ قلعہ نہایت محفوظ رہا ہے۔ خاص کر اس کے مغرب اور جنوب مغرب میں ۳۰ فٹ گہری دلدل رہی ہے جو بعد میں بھر دی گئی ہے اور اس پر نیو سیکریٹریٹ کی عمارت، اکاوٗنٹنٹ جنرل کا دفتر اور فائر بریگیڈ کے دفاتر وغیرہ بن چکے ہیں۔

قلعے کے جنوب میں کوٹہ کوہل (کٹہٖ کول) کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہے جس کے بائیں کنارے پر قلعے کا بڑا حصّہ ہے جو امیرا کدل تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں بڈشاہ پُل بنایا گیا تو اس قلعے کا آدھا رقبہ الگ کر دیا گیا جس پر آج کل سڑک اور میونسپل فلیٹس (اسٹیٹ فلیٹس) وغیرہ بن گئے۔ ندی کے دائیں طرف کے حصّے جس پر آج کل محکمہ مال کا دفتر واقع ہے پُرانے وقتوں میں توشہ خانہ اور مہاراجہ کے درباریوں کے رہائشی مکانات وغیرہ تھے۔

طرزِ تعمیر کے لحاظ سے یہ قلعہ جدید ڈیزائن کا ہے۔ اس کا بیشتر حصّہ ڈوگرہ عہد میں نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے جس کے سبب امیر خان جواں شیر کے وقت کے کوئی آثار نمایاں طور پر نظر نہیں آتے۔ ایک بیان کے مطابق اس قلعے کے مغرب جنوب اور شمال کی جانب ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۱۰ فٹ اونچی دو فصیلیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان دونوں فصیلوں کا درمیانی فاصلہ ۳۰ فٹ تھا اور اسی کی طرح سے قلعے کے ارد گرد ۳۰ فٹ چوڑی

ایک کھائی سی گھیرا کیئے ہوئے تھی۔ یہ فصیل اینٹوں کی بنی تھی جس میں چونا سرخی بطور مسالہ استعمال کیا گیا تھا۔ بیچ بیچ میں پتھر سے بنے پائے بھی تھے۔ بیرونی دیوار کے اُوپری حصّے میں بندوق کی نالیوں کے لئے بڑے بڑے سوراخ بھی بنائے گئے تھے۔ فصیل کے اوپر کوئی توپ خانہ نہیں تھا۔ اس دیوار کے کچھ آثار ماضی قریب تک شہید گنج کے باہر دکھائی دیتے تھے۔ قلعے کے اُس طرف جہاں سے جہلم بہتا ہے، اینٹوں سے بنی بنیاد کھڑی ہے جس میں نو کیلے پتھروں کے دو رُخی قوس بھی بنائے گئے ہیں۔

حسن کھویہامی کے بیان کے مطابق امیر خان جواں شیر نے جبرو گا شاہی جیسا خوبصورت باغ مسمار کر کے یہ فصیل بنوائی۔ اس باغ کا سارا ملبہ کشتیوں میں شیر گڈھی تک لایا گیا اور نئے سرے سے تعمیر کے کام میں استعمال کیا گیا۔

شیر گڈھی کے جنوبی حصّے میں ایوانِ عام ہے جہاں پر ڈوگرہ عہد میں دربار کا کام ہوا کرتا تھا۔ اس حصّے میں آج کل اسمبلی ہال ہے۔ ایوانِ عام کی مشرقی جانب ایک اور عمارت ہے، جسے رنگ محل کہتے تھے۔ اس حصّے تک پہنچنے کے لئے جہلم کی جانب بھی ایک سیڑھی بنی ہوئی ہے۔ شیر گڈھی کا یہ حصّہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں نئے سرے سے تعمیر کرایا گیا۔ محل کے بائیں جانب رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے جن میں آج کل مختلف دفاتر قائم ہیں۔ ان رہائشی عمارات یعنی رنگ محل کے پچھلے حصے میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد کا بنایا ہوا گدادھر مندر ہے جس پر سونے سے ملّمع کیا ہوا کلش چڑھایا گیا ہے۔ یہ مندر آٹھ کونہ ہے اور اس کے چاروں طرف چونے سے لپائی کی

گئی ہے۔اس مندر کا خرچہ چلانے کے لئے مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور میں فی خروار پیداوار پر ایک پاؤ بطور رسوم لیا جاتا تھا۔کرنل مہان سنگھ (۱۸۴۱-۱۸۳۴ء) کے دور میں ہی شیر گڈھی کے مدّ مقابل دریا کے اُس پار بسنت باغ گھاٹ تعمیر کرایا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس گھاٹ میں جو سپاٹ پتھر لگائے گئے وہ پتھر مسجد سے یہاں لائے گئے۔

چند سال پہلے شیر گڈھی کے اُس حصّے کو آگ لگ گئی جس میں اسمبلی ہال تھا، جس کی وجہ سے اسے سخت نقصان پہنچا۔اسمبلی ہال کی عمارت یورپی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ تھی۔ پرانے قلعے کے احاطے میں اب کئی نئی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔شیر گڈھی محلات میں پٹھان، سکھ،اور ڈوگرہ حکمران قیام پذیر تھے۔ پٹھانوں نے کشمیر میں ۱۷۵۳ء سے لیکر ۱۸۱۹ء تک حکومت کی۔سکھ گورنر ۱۸۱۹ء سے لیکر ۱۸۴۶ء تک اس محل میں رہتے تھے۔آخر ۱۸۴۶ء میں ڈوگرہ حکمران بھی اسی محل میں رہنے لگے۔لیکن ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے محلات گپکار ڈل کے کنارے زبرون پہاڑ کے دامن میں تعمیر کئے۔

شیر گڈھی کے احاطے میں ایک بزرگ سید قمر صاحبؒ سپرد خاک ہے۔سید قمر الدینؒ خوارازم سے آکر ملک سیف ڈار کے باغ میں جو کہ شیر گڈھی کے نام سے مشہور ہے گوشہ نشین ہوئے اور رات دن یہاں پر خدا کی عبادت کرتے آپ نے ۲۴ محرم الحرام ۷۰۴ھ کو وفات پائی اور شیر گڈھی کے احاطہ میں ہی سپرد خاک کئے گئے مقبرہ کے نزدیک ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے جہاں پر نماز پنجگانہ ادا کی جاتی ہے۔

ناگرنگر کشمیر میں پہلی مغل یادگار

اکتوبر ۱۵۸۶ء کا وہ مہینہ تھا جب کہ اکبر کے سپہ سالار مرزا قاسم خان نے تاریخ کشمیر میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اکبر خود آگرہ میں قیام پذیر ہوا۔ اور اپنے دور حکومت میں صرف تین مرتبہ بغرض سیاحت وارِدِ کشمیر ہوا۔ لیکن کشمیر کے انتظام کے لئے آگرہ سے لائق صوبے دار یہاں تعینات کئے۔ اس بادشاہ نے کشمیر میں ۱۹ سال ایک ماہ حکومت کی۔ اور ۶۳ سال کی عمر میں سارا جاہ و حشم چھوڑ کر عالم فانی سے ملک جاودانی کو انتقال کر گیا۔

اکبر نے یہاں سرینگر میں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈال دی۔ جسے اس نے ناگرنگر کا نام دیا۔ یہ شہر کوہ ماران المعروف ہاری پربت کے اردگرد تعمیر کیا گیا۔ اور اس میں ایک اونچی سنگین دیوار تعمیر کرنے کا کام بھی ہاتھ میں لیا۔

اگرچہ اکبر نے پہلے دورہ کشمیر میں اپنے گورنر سید یوسف خان کو قلعہ ناگرنگر تعمیر کرنے کی ہدایت دی تھی لیکن فصیل کی تعمیر ۱۵۹۷ء میں شروع ہوئی۔ اور جہانگیر کے بقول اس پر ۱۶۲۰ء تک کام چلتا رہا۔

کچھ مورخوں کا کہنا ہے کہ کشمیر میں زبردست قحط پڑا تھا اور لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے بادشاہ نے اس فصیل کی تعمیر کا حکم دیا۔ لیکن کچھ کا کہنا ہے کہ اس فصیل کی تعمیر سے قبل کشمیر میں مغل فوجوں کی کوئی چھاونی نہیں

تھی اور وہ شہر سرینگر کے لوگوں کے گھروں میں رہتے تھے۔ فوج اور رعایا کے درمیان رنجش کو دور کرنے کے لئے ناگرنگر آباد کرنا پڑا۔

فصیل کے اندر نئی نئی بستیاں۔ فوج کے لئے بارکیں اور مغل سرداروں کے لئے کوٹھیاں تعمیر کرائی گئیں۔ بادشاہ کے کہنے کے مطابق ہاری پربت کے مشرق کی طرف باغ درشن یا جروگہ شاہی نام کا باغ تعمیر کرایا گیا۔ اور اس میں سایہ دار درخت لگوائے گئے تھے۔ یہ باغ نگین جھیل کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ جہانگیر نے اس کی دوبارہ تجدید کرائی۔ اس باغ میں اکبر بادشاہ نے اپنے قیام کے لئے ایک چھوٹی بارہ دری بنوائی تھی۔ اور اس کی دیواروں پر تصویریں بنوائیں۔ یہ باغ افغان گورنر امیر خان جوان شیر نے مسمار کیا اور اس کے پتھر اپنے محل میں لگوائے۔ آج اس باغ کے چند آثار سنٹرل جیل کے جنوب کی طرف نظر آتے ہیں۔

ناگرنگر کے اردگرد یہ فصیل ساڑھے تین میل لمبی ہے۔ اس فصیل کا ایک سرا مشرق کی جانب مرزا بہاؤ الدینؒ سے شروع ہو کر سعدہ کدل تک پہنچتا ہے۔ جہاں سے اس کا دوسرا سرا شمال کی جانب امدا کدل کے قریب ختم ہوتا ہے اور امدا کدل کے نزدیک شروع ہو کر اس کا اگلا سرا مغرب کی جانب حول اور بادام واری سے گزر کر پھر مرزا بہاؤ الدینؒ کے مقبرے تک آپہنچتا ہے۔ یہ فصیل ۲۶ فٹ اونچی اور ۱۳ فٹ چوڑی ہے ہر ۵۰ فٹ کے فاصلے پر اس میں ۳۴ فٹ اونچے ستون ہیں۔ فصیل میں ہر ۲ فٹ کے فاصلہ پر ۱۴ انچ چوڑے سوراخ بنائے گئے ہیں۔ تاکہ ان میں سے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے

بندوقوں کی نالیاں نکالی جا سکیں۔

فصیل میں تین بڑے دروازے ہیں جن میں جنوب کی طرف کاکاٹھی دروازہ سب سے اونچا ہے۔ اس دروازے کا محراب ۳۵ فٹ اونچا اور ۳۰ فٹ چوڑا ہے۔ محراب میں چاروں سمت سنگ دیوری کے طاق بنے ہیں۔ جن پر نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔

دروازے کے اوپر کی طرف تین حصوں میں اکبر بادشاہ کے وقت کا لگایا ہوا کتبہ ہے۔ جس پر فصیل کی تعمیر کی تاریخ درج ہے۔

بنای قلعہء ناگر نگر شد — بحکم پادشاہِ داد گستر
سر شاہانِ عالم شاہ اکبر — تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر
شہنشاہی کہ در عالم مثالش — نبود است و نخواہد بود دیگر
کرور و دہ لک از مخزن فرستاد — دو صد استاد ہندی جملہ چاکر
نکردہ ہیچ کس بیگار اینجا — تمامی ایفتہ از مخزنش زر
چہل چار از ظہور پادشاہی — ہزار و شش ز تاریخ پیمبر

☆☆☆

بنای قلعہَ ناگر نگر بعونِ الہٰ — بحکم حضرت ظل اللہ اکبر شاہ
بسعیٔ ء خواجہ محمد حسین گشت تمام — حقیر بندہَ از بند ہای اکبر شاہ
بقای دولت این شاہ تا ابد بادا — بحق اشہد اَن لا اِلہ اِلا اللہ

☆☆☆

فصیل کا دوسرا دروازہ مغرب کی جانب ہے جو سنگین دروازہ کے نام

سے مشہور ہے یہ دروازہ کاٹھی دروازہ سے چھوٹا ہے اس دروازے کے دائیں بائیں طاق والے روشن دان ہیں۔ یہ ساخت کے لحاظ سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ فصیل کا تیسرا دروازہ جنوب مغرب کی جانب سے ہے جسے باچھی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دوروازہ سب سے چھوٹا ہے اور اس پر کوئی نقاشی نہیں ہے۔ فصیل کی تعمیر میں عام طور پر چونا اور سرخی استعمال میں لائی گئی ہے۔

اس فصیل میں کہیں کہیں ۲ فٹ چوڑے اور ۶ فٹ اونچے محرابی دروازے ہیں جن میں سے ایک شخص اندر یا باہر آجا سکتا تھا۔ آج کل یہ دروازے کچھ چوڑے ہو گئے ہیں۔ دیوار خستہ حالت میں ہے اور بہت ساری جگہوں پر کاٹی گئی ہے۔

اس دیوار کی لاگت کا اندازہ تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ روپے ہے۔ ناگرنگر کی دیکھ بال ایک کشمیری میر محمد حسن کابلی نے سرانجام دی۔ ہاری پربت کے جنوب میں شہزادہ دارا شکوہ نے ۱۶۳۹ء میں سنگ پور کا ایک خوبصورت محل اور اپنے استاد آخون ملا شاہ کے لئے ایک حمام بنوایا۔ ان دونوں عمارات کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ مسجد دارا شکوہ کے اوپر حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کا روضہ ہے ہاری پربت کے مغرب میں چکریشور کا مندر ہے۔ ہاری پربت کی فصیل کے اندر آج کئی بستیاں آباد ہیں۔ اس کے مشرق میں شہر کا سب سے بڑا جیل خانہ دوسری طرف دماغی امراض کا ہسپتال اور ساتھ میں بادام واری ہے۔

جہانگیر نے شہر سرینگر میں قائم کی گئی اس پہلی مغل یادگار کے متعلق لکھا ہے۔

''شہر سے متصل ایک پہاڑی ہے جسے کوہ ماران کہتے ہیں۔ اسے ہاری پربت کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اس کے مشرق کی جانب ڈل واقع ہے۔ میرے والد بزرگوار کے عہد میں یہاں پتھر اور چونے کی ایک مضبوط قلع کی تعمیر شروع کی گئی جو میرے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ قلعہ اتنا بڑا ہے کہ پہاڑی اس کے اندر آگئی ہے۔ اس کے پاس ایک عمارت بنائی گئی ہے عمارت کو نادر مصوروں کی نقاشی سے نگار خانہ چین بنا دیا گیا ہے۔ میں نے اس سے ملحق باغیچہ کا نام ''نورافزا'' رکھ دیا ہے۔''

ناگرنگر کے وسط میں کوہ ماراں المعروف ہاری پربت ہے۔ یہ چھوٹا سا پہاڑ ہے ہاری پربت کو کشمیر کے تاریخی دور میں زبردست اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہندو عقیدے کے مطابق شارکا دیوی نے مینا بن کر اپنی چونچ میں اٹھا کر ایک پتھر پھینکا۔ جس سے وہاں پر راکھش موقعہ پر ہی مر گیا۔ دیوی کا لایا ہوا کنکر بڑھتا رہا۔ اور آج کا ہاری پربت بن گیا۔ اور دیوی کو پہاڑ پر ہی قیام کرنا پڑا۔ جس جگہ دیوی نے قیام کیا وہ آج چکریشور کا مندر ہے۔ جو کہ پہاڑی کے شمال و مغرب کی طرف واقع ہے پہاڑی کے جنوب مشرق میں زیارت مخدوم صاحبؒ کا آستانہ ہے۔ مخدوم صاحبؒ کو کشمیر میں محبوب العالمؒ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ ۱۴۸۶ء میں تجر سوپور میں پیدا ہوئے۔ مخدوم صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی بعد میں آپ

سرینگر تشریف لائے۔ اور کوہ ماراں کے پاس مدرسہ دارالشفا میں مزید تعلیم حاصل کی۔ آپ نے کشمیر میں بہت ساری مسجدیں بنوائیں۔ آپ سخت ریاضت اور عبادت کرتے تھے۔ آپ نے اپنا مسکن کوہ ماراں بنایا۔ اور وہاں ہی انتقال فرمایا۔ اور وہاں ہی سپرد خاک ہوئے۔

دارا شکوہ مسجد ۱۶۴۸ء میں شہزادہ دارا شکوہ نے (فرزند شاہجہاں) اپنے استاد آخون ملا شاہؒ کے لئے بنوائی تھی جو کہ آپ کے پیر طریقت تھے آپ کا اصلی وطن بدخشاں تھا۔ وہاں سے نکل کر آپ نے کشمیر کی طرف رخ کیا اور کوہ ماراں کے دامن میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ آپ کے وقت میں کئی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ آپ کے مریدوں میں ہندوستان کے شہنشاہ شاہجہاں اور ان کی دختر جہاں آرا بھی تھی۔ کوہ ماراں کی چوٹی پر عطا محمد خان جو کہ ۱۷۸۶ء سے کشمیر کے پٹھان گورنر تھے نے ایک وسیع اور مضبوط قلعہ تعمیر کروایا۔ جس کے بلند برجوں کو فصلیں سہارا دیتے ہوئے تھیں۔ قلعہ کے اندر بارکیں بنوائیں۔ جہاں کئی ہزار فوجی دستے اور ان کا سامان سما سکتا تھا قلعہ کے وسط میں ایک تالاب بھی تعمیر کروایا گیا۔ تا کہ اس میں استعمال کے لئے پانی کا ذخیرہ کیا جائے۔

کشمیر یونیورسٹی

کشمیر یونیورسٹی ۱۹۶۹ء میں معروض وجود میں آئی جبکہ جموں وکشمیر یونیورسٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک جموں یونیورسٹی ، دوسری کشمیر یونیورسٹی ۔ جموں وکشمیر یونیورسٹی ۱۹۴۸ء میں اس لئے قائم ہوئی کہ اس سے پہلے یہاں کے کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منسلک تھے اور امتحانات وغیرہ یہی ادارہ سرانجام دیتا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان میں چلی گئی اور یہاں پر ایک یونیورسٹی کی ضرورت محسوس ہوگئی۔ کشمیر میں آخری امتحانات پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۴۷ء میں لئے گئے ۔ ۱۹۴۸ء میں جموں وکشمیر میں کوئی امتحان وغیرہ نہیں لیا گیا۔ طالب علموں کو اپنے اسکول اور کالج کے امتحان کے نتائج پر ہی دوسرے کلاسوں میں ترقی دے دی گئی۔ ایس پی کالج کے پرنسپل خواجہ غلام احمد عشائی جو بڑے قابل ماہر تعلیم اور اعلیٰ پایہ کے منتظم تھے کو حکومت نے سپیشل آفیسر مقرر کیا۔ تاکہ وہ ایک نئی یونیورسٹی جموں وکشمیر کے لئے بنانے میں قوانین ،سنڈ کیٹ، سینٹ اور انتظامی ڈھانچہ مرتب کرے ۔ آپ نے یہ عہدہ جولائی ۱۹۴۸ء میں لیا اور جموں کشمیر یونیورسٹی کی بنیاد ۲ نومبر ۱۹۴۸ء میں ڈالی گئی عشائی صاحب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے ۔ پہلی دفعہ امتحانات مارچ ۱۹۴۹ء میں مرتب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء تک جموں وکشمیر یونیورسٹی میں

باقاعدہ وائس چانسلر تعینات نہیں کیئے گئے۔ بلکہ یہ اعزازی طور پر اپنا کام سر انجام دیتے تھے۔ پہلا اعزازی وائس چانسلر قاضی جسٹس مسعود حسن تھا۔ اس کے بعد وزیر جانکی ناتھ تھے جو جموں و کشمیر کے چیف جسٹس بھی تھے۔ بعد میں جموں و کشمیر یونیورسٹی میں باقاعدہ وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ پہلا وائس چانسلر آصف علی اصغر فیضی تھا۔ جو مصر میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے تھے۔ وہ عالمی شہرت یافتہ ماہر قانون اور ماہر تعلیم تھا اس کے بعد کے ایم پانیکر جموں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے وہ چین میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے تھے شہرت یافتہ تاریخ دان تھے۔ انہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جب یونیورسٹی ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی تو یہ صرف امتحان لینے والی یونیورسٹی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی میں درس وتدریس کا انتظام شروع ہوا اور ایم اے کلاس انگریزی، اکنامکس اور جیالوجی میں شروع کیئے گئے۔ انگریزی میں ایم اے کلاس، ایس پی کالج سرینگر میں شروع ہوئے اور ایم اے اکنامکس اور جیالوجی پرنس آف ویلز کالج جموں میں شروع ہوئے جس کو اب گاندھی میموریل کالج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی کا آفس لال منڈی سرینگر میں ایک سرکاری بلڈنگ میں رکھا گیا جہاں ڈوگرہ حکومت میں جموں و کشمیر کے پرائم منسٹر سکونت پذیر ہوتے تھے۔ کشمیر میں یونیورسٹی قائم ہونے کیلئے آفیسروں نے سرینگر میں مختلف علاقوں کو منتخب کیا اور سبھوں نے اپنی اپنی رائے دی۔ آخر اس وقت کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی رائے تھی کہ یونیورسٹی مولانا آزاد روڈ کے ارد گرد قائم ہو۔ جس میں پرتاپ پارک بی ایڈ کالج، گورنمنٹ وومنز کالج مولانا آزاد روڈ،

ایس پی کالج، ایس پی اسکول گاف کورس اور پولو گراؤنڈ علاقے شامل ہوں۔
چنانچہ اس کے لئے تیاریاں مکمل ہوگئیں اور بلیو پرنٹ بھی تیار ہوا اور کشمیر یونیورسٹی کا آفس لال منڈی سے کالج آف ایجوکیشن مولانا آزاد روڑ منتقل کیا گیا۔ غالباً یہ منصوبہ ۱۹۵۳ء کے آوائل میں شروع ہوا۔ ۹ راگست ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کو برطرف کیا گیا یوں یہ منصوبہ بھی ختم ہوا اور یونیورسٹی آفس پھر لال منڈی منتقل ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں بخشی غلام محمد ریاست کے وزیر اعظم بن گئے اور یونیورسٹی بنانے کا سوال پھر اُٹھا۔ اس وقت حضوری باغ موجودہ اقبال پارک اور امر سنگھ کالج کا علاقہ یونیورسٹی بنانے کے لئے منتخب کیا گیا۔
ڈاکٹر رادھا کرشن نے یونیورسٹی کی سنگ بنیاد ڈالی جو اس وقت ہندوستان کے نائب صدر تھے۔ لیکن اس پر بھی کام نہیں ہوا، اور سنگ بنیاد کا پتھر بھی چوری ہوگیا۔ آخر کار ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنا باغ جس کو راج باغ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی بنانے میں تحفہ کے طور پر دیا۔ جو کہ حضرت بل کے نزدیک ہے پہلی آرٹس بلڈنگ ۱۹۶۰ء کے قریب تیار ہوگئی لیکن اس عمارت کا افتتاح ڈاکٹر رادھا کرشن نے کیا۔ دوران تقریر آپ نے کہا کہ عمارت کا افتتاح کرنا زیادہ محفوظ ہے اس نسبت اس کو ابھی تک سنگ بنیاد حضوری باغ کا واقعہ یاد تھا۔ اب یونیورسٹی کو کافی وسعت دے دی گئی ہے مرزا باغ اور نسیم باغ بھی یونیورسٹی کے احاطے کے ساتھ ملائے گئے ہیں اس کے بعد حکومت نے عشائی باغ سے لیکر حبک تک سب علاقہ کو نوٹیفائیڈ کیا نہ کوئی یہاں پر زمین بھیج سکتا نہ خرید سکتا تھا۔ آج کسی نے اس قانون پر عمل نہیں کیا۔ اب یہ علاقہ پوری کالونی میں تبدیل ہوگیا ہے۔

پاندریٹھن

پاندریٹھن سرینگر سے ۳ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ پاندریٹھن ماضی میں کشمیر کا دارالخلافہ تھا جس سے شری نگر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جسے راجہ اشوک نے ۲۸-۲۶۴ قبل مسیح میں بسایا تھا۔ پرانے زمانے کے آثار میں اب یہاں ایک پرانا پتھروں کو بنایا ہوا مندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ بُدھ دور کی چند مورتیاں موجود ہیں۔ پاندریٹھن میں مذہبی تعمیرات کا سلسلہ راجہ اشوک کے زمانے سے شروع ہوا تھا۔ یہاں کے اکثر مندروں کا تعلق بدھ مت سے تھا یہ مندر دلدلی زمین پر تعمیر کیا گیا۔ پاندریٹھن مندر کب تعمیر ہوا اسکے بارے میں کنگم کہتے ہیں کہ مندر راجہ پارتھا کے وزیر جس کا نام میرووردن سوامی تھا نے ۹۶۰ھ میں تعمیر کیا۔ رام چند کاک کے مطابق یہ مندر راجہ جے ہما کے وزیر ریسن نے تعمیر کیا ہے پرانی بدھ تعمیرات میں سے یہاں تین ستوپوں کی بنیادیں ۱۷-۱۹۱۶ء تک موجود تھیں۔ یہ بنیادیں پاندریٹھن مندر کے مشرق میں اسی ہموار جگہ پر تھی۔ جس پر اب فوجی چھاؤنیاں بنی ہیں۔

ستوپوں کی بنیادیں جن کے نشان اب کہیں نظر نہیں آتے۔ پہلی بار دیارام ساہنی نے دریافت کی جب وہ سرجان مارشل کی ایما پر کشمیر میں

پرانے آثار دریافت کرنے آیا۔ ۱۶-۱۹۱۵ء میں مشرقی جانب کے ستوپ کی بنیاد بیس فٹ (۲۰ فٹ) موٹی ملبے کی تہہ سے برآمد کی گئیں۔ ستوپ کی بنیاد اگرچہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھی لیکن بنیاد میں پڑے پتھروں کے اعتبار سے وہ اندازہ لگا سکا کہ ستوپ ۳۷ فٹ مربع بنیاد پر استوار ہوا تھا۔ جس کے چار گوشوں پر چار چار خلوت خانے تھے۔ ستوپ کی دیوار میں لگے پتھروں میں سنگتراشوں نے تصویریں تراشی تھی جس میں مورتی بودھ ستوپدم کی تھی دوسرا ستوپ مغرب کی طرف رہا ہوگا۔ اس کی بنیاد اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ مغربی اور شمالی اطراف کے زینوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

پاندریٹھن میں اگرچہ بودھ تعمیرات کا سلسلہ بہت پہلے سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن وہاں ستوپوں کے جو آثار دریافت ہوئے تھے ان کی بناوٹ کا تعلق آٹھویں صدی عیسوی سے تھا جو کشمیر میں فن تعمیر کا ایک اہم دور رہا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان دو ستوپوں کا تعلق راجہ للتادیتہؐ کے دور سے تھا۔ اندازہ ہے کہ مشرقی ستوپ اس خاص تعمیر کا حصہ رہا ہے جو للتادیتہؐ کے وزیر چنکن نے تعمیر کیا تھا۔ جس میں متھرا سے لائی گئی بھگوان بدھ کی مورتی رکھی گئی تھی۔ یہ بدقسمتی سے ۹۶۰ عیسوی میں آگ سے تباہ ہو گیا اس وقت کشمیر میں ابھی مانو کی حکومت تھی۔ اس مندر میں یونانی اور رومن طرز تعمیر نظر آتی ہے۔ اس مندر کے اردگرد چنار اور بید کے درخت پائے جاتے ہیں۔ جس سے مندر کا نظارہ خوبصورت اور دلکش نظر آتا ہے۔

☆☆☆

کشمیر میں طبی سہولیات کا قیام

مارچ ۱۸۴۶ء تاریخ کا مکردہ ترین فعل وقوع پذیر ہوا جس کے تحت سلطنت انگلیشیہ نے مسلمانان کشمیر کو گلاب سنگھ کے رحم وکرم پر بینامہ امرتسر کے ذریعے چھوڑ دیا تھا ان ڈوگرہ حکمرانوں نے نہ صرف ٹیکسوں کی بھرمار کر کے کشمیری کسانوں، شالبافوں کو مفلوک الحال بنا دیا تھا بلکہ ان پر سرکاری کارندوں اور مخبروں کی ایک بڑی فوج مسلط کر رکھی تھی جو ہر گھڑی، ہر پل عام رعایا پر مسلط رہتی تھی۔ ایک طرف سے تو پیداوار کا ۴/۵ حصہ حکومت کی طرف سے مختلف ٹیکسوں کی صورت میں لیا جاتا تھا تو دوسری طرف باقی حصے پر سرکاری اہل کار قبضہ جماتے تھے اور اس طرح جو بھی پیداوار ہوتی تھی وہ سرکار اور اس کے کارندے ہڑپ کر جاتے تھے۔ اس ظلم ستم کے ماحول میں لوگ اقتصادی طور پر کمزور ہوئے تھے۔ کشمیریوں کے لئے زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی تنگدستی، غریبی، بیماریاں اور مختلف وبائیں ہر وقت ان پر حملہ آور رہتی تھیں۔

طاعون اور وبا کی بیماریاں ہر دوسرے تیسرے سال کشمیر میں آتیں۔ ہر دن سینکڑوں کی تعداد میں لوگ موت کی آغوش میں چلے جاتے۔ اس وقت کشمیری انگریزی دوائیاں لینے سے انکار کرتے تھے۔ درویشوں اور

فقیروں کے پاس جاتے۔ اوران سے تعویز لیا کرتے تاکہ ان کی بیماریاں دورہوجائیں۔ بہت سارے کشمیری اس وقت بھی حکیموں اورویدوں کا علاج کرتے ہیں۔ یہ حکیم زیادہ تر جڑی بوٹیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ حکیم اور نائی اس وقت درک Leeches کا استعمال کرتے ہیں ان کے مطابق یہ گندہ خون چوستے ہیں۔ اورآدمی صحت یاب ہوتا ہے نائی بھی اکثر دیہات میں حکمت کا کام کرتے ہیں۔ ڈوگرہ مہاراج انگریز سیاحوں کو کشمیر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے تاکہ یہ لوگ کشمیر کی خراب حالت دیکھ نہ پائیں۔ لیکن کچھ سیاح کشمیر وارد ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اورانہوں نے کشمیریوں کی زبوں حالی دیکھی اوران کی حالت زارسنی۔

پہلا انگریز ڈاکٹر جو وارِدِ کشمیر ہوا وہ رابرٹ کلرک تھا جو کشمیر میں ۱۸۵۴ء میں آیا۔ اور واپسی پر اس نے حکام کو کشمیریوں کی حالت زار بیان کی ۱۸۶۳ء میں برطانیہ حکومت نے ڈاکٹر سمتھ کو کشمیر روانہ کیا۔ یہاں آکر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک میڈیکل ڈسپنری قائم کی جائے اس سے پہلے یہاں کوئی دواخانہ یا ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ متعدد بیماریاں خاص طور پر پلیگ، وبا کشمیر میں عام تھی اس سے ہزاروں لوگ موت کی آغوش میں چلے جاتے۔ کلرک دوبارہ ۱۸۶۵ء میں کشمیر آیا۔ اور ۱۸۶۵ء میں ہی نواکدل کے نزدیک ایک ڈسپنری قائم کی جہاں پر آج کل گرلز کالج نواکدل ہے۔ وہاں سینکڑوں کی تعداد میں بیمار کشمیری عورتیں علاج کے لئے جاتیں تھی۔ اس وقت سردیوں میں یورپین کو کشمیر میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد

ڈاکٹر ولیم ایلم سلی ۱۸۶۵ء میں یہاں تشریف لائے اور انہوں نے بھی بیمار کشمیریوں کا علاج کیا۔ ایلم سلی کی زندگی بڑی مشکل تھی۔ اس کے پاس کوئی شفاخانہ وغیرہ نہ تھا نہ جراحی کے لئے کوئی آلات تھے وہ آپریشن درخت کے نیچے کرتا تھا یا آپریشن کرنے کے لئے وہ خیمہ (Tent) کا استعمال کرتا تھا۔ ۱۸۶۶ء کے موسم گرما میں تقریباً ۳۵۰۰ بیماروں کو ڈاکٹر ایلم سلی نے معائینہ کیا۔ تقریباً آٹھ سال تک موسم گرما میں بیمار لوگوں کی خدمت کی۔ مہاراجہ نے اس خیمہ کے آس پاس پولیس رکھی تا کہ کشمیریوں کی حرکات وسکنات کا معائینہ کریں۔ ڈاکٹر ایلم سلی ایک قابل سرجن تھے اور بہت سارے کامیاب آپریشن کیئے۔ آپ نے کانگڑی کینسر کے بہت سارے بیماروں کا علاج کیا۔ کیونکہ کشمیری سردیوں میں کانگڑی اپنے بدن کے جلد کے ساتھ رکھتے ہیں۔ جس سے یہ خطرناک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ آخر وہ کشمیر کے پہاڑوں کو عبور کرتے وقت اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ ان کے بعد ڈاکٹر میکس ویل کشمیر آئے۔ ۱۸۷۴ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کوہ سلیمان (شنکر آچاریہ) کے دامن میں درگجن علاقہ کے پاس ایک شفاخانہ تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ بھی اس شفاخانہ کا معائینہ کرتا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں ایک اور ڈاکٹر ایڈمن ڈاون کشمیر آئے۔ اس نے بھی سینکڑوں کشمیریوں کا علاج کیا۔ ۱۸۷۷ء میں کشمیر میں خوفناک قحط آیا۔ سینکڑوں لوگ موت کے آغوش میں چلے گئے۔ آپ نے خدمت خلق کے تحت لوگوں میں چاول وغیرہ تقسیم کیا۔ لوگوں کے آرام کے لئے بہترین وسائل دلوائے دماغی طور کمزور انسانوں

کیلئے آپ نے ایک شفاخانہ بنوایا۔ پہلے سال میں ہی ۲۵۰ بیمار داخل ہوگئے۔ اس سے پہلے کشمیر میں اس قسم کا کوئی ہسپتال نہیں تھا۔ یہ لوگ سڑکوں پر اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں ڈاکٹر آرتھر نیو انچارج در جن ہسپتال مقرر ہوئے۔ جب پہلی بار وہ ہسپتال آگئے تو آپ کو رنج ہوا کہ ہسپتال میں گھاس پھوس کا چھت ہے۔ اور نظم ونسق، تسلی بخش نہیں۔ آپ نے سائنسی اصولوں پر ہسپتال کا انتظام قائم کیا۔ آپ کی مدد کے لئے آپ کے برادر اصغر ارنسٹ نیو ۱۸۸۶ء کشمیر آئے۔ دونوں بھائیوں نے اپنی لگن اور محنت سے ہسپتال کو ترقی کی منزلوں کی طرف لے لیا۔ ۱۸۸۸ء میں مشن ہسپتال کا باقاعدہ افتتاح ہوا جس میں (۸۰) بیڈسBeds لگے تھے اس کے علاوہ انگریز سٹاف جنہوں نے اس ہسپتال میں کام کیا۔ ڈاکٹر واسپر، ڈاکٹر روچی ان کے تین برطانوی نرسیں، نورا نیو۔ لوسی، مس سمتھ قابل ذکر ہیں۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ہسپتال کے لئے مالی امداد دی۔ اور وہ ان کے کام سے بہت متاثر تھا۔ ڈاکٹر آرتھر نیو نے ۳۴ سال تک کشمیر میں خدمت کی۔ انہوں نے اگست ۱۹۱۹ء میں کشمیر میں وفات پائی اور شیخ باغ میں عیسائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ارنسٹ نیو نے ۱۹۴۶ء تک مشن ہسپتال میں کام کیا اور آپ نے کانگڑی کینسر کے لئے بہت تحقیقاتی کام کیا۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لئے جن ڈاکٹروں نے کام کیا ان میں قابل ذکر ڈاکٹر کیٹ نولز مس الزبتھ نیو مین ہیں۔ کشمیر چونکہ اکثر غیر ملکی حکمرانوں کے قبضے میں رہا ہے یہ حکمران عیش وعشرت کی محفلیں سجاتے رہتے تھے۔ رعایا کی نوجوان

لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ بناتے تھے ۔ غلام بازی، بچہ نغمہ، حافظ نغمہ کو قائم کیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ لڑکیوں کی خرید فروخت سے وصول شدہ آمدنی سرکاری خزانہ میں داخل کرتے تھے جسم فروشی سے بے حیائی اور بدکرداری کو اس قدر عام کیا گیا کہ ۱۸۸۰ء میں سرینگر میں بازاری عورتوں کی تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچی ۔ اور آمدنی کا پچیس (۲۵) فی صد حصہ پیشہ کمانے والی لڑکیوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس کاروبار پر روک لگانے کے لئے نہ تو مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے آواز اُٹھائی نہ پڑھے لکھے لوگوں نے زبان کھولی۔ اس بے حیائی کے ماحول میں محمد سبحان حجام مرحوم بسکو اور ماسٹر صدیق جو مشن سکول کا پرانا طالب علم تھا کی مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ آخر کار مرحوم بسکو اور کھتلین واگ ہان نے اس شرمناک کاروبار کے بارے میں لیگ آف نیشنز کو مطلع کیا اور آخر یہ بات برطانیہ کے حکمرانوں کو بھی پہنچ گئی آخر لیگ آف نیشنز اور وائسرائے ہند کے دباؤ سے مہاراجہ کشمیر نے یہ کاروبار ۱۹۳۴ء میں بند کیا اور باضابطہ ایک قانون اس بارے میں بنایا گیا۔ یوں یہ ناجائز تجارت سرینگر سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اور سرینگر کے لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ اور محمد سبحان حجام اور اس کے دوستوں نے مٹھائی تقسیم کی۔ کرسچن مشنیریوں نے درگجن ہسپتال کے بعد ایک اور ہسپتال رعناواری میں قائم کیا۔ جس کو بعد میں حکومت نے اپنی تحویل میں لیا۔ اور اس کا نام جواہر لال نہرو میموریل ہسپتال دیا۔ اسی طرح درگجن ہسپتال بھی ۱۹۴۹ء میں حکومت کشمیر نے اپنے کنٹرول میں لیا۔ اور اس کا نام ٹی بی ہسپتال رکھا یہاں

پر تب دق کے بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔

۱۸۸۹ء میں حکومت جموں و کشمیر نے ایک ماڈرن ہسپتال قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو امیرا کدل کے آس پاس تھا جہاں پر آج کل کا لل دید ہسپتال ہے یہاں پر ہر قسم کے بیماریوں کا علاج ہوتا تھا۔ اس کے لئے باہر سے ڈاکٹر متعین کئے جاتے اس ہسپتال کو مہاراجہ ہسپتال کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس ہسپتال میں کشمیر کے دور دراز علاقوں گلگت، اسکردو سے لوگ علاج کرنے کے لئے آتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں مزید عمارتیں تعمیر کی گئیں ۱۴-۱۹۱۳ء میں ایکسرے پلانٹ لگایا گیا۔ ۱۸۹۷ء میں حکومت جموں و کشمیر نے ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جبلی پر ایک اور شفا خانہ قائم کیا۔ جس کا نام ڈائمنڈ جبلی زمانہ ہسپتال نوا کدل رکھا گیا یہ شفا خانہ خالص عورتوں کے لئے قائم ہوا۔ اس ہسپتال کے قائم ہونے سے پہلے بہت ساری حاملہ عورتیں موت کی گھاٹ اترتی تھی۔ لیکن اس ہسپتال پر زچہ و بچہ کے علاج کا پورا انتظام تھا ڈاکٹر و نرسیں باہر سے لائی گئیں جن میں خاص طور پر ڈاکٹر گبے۔ اس کا نام ہر کشمیری کی زبان پر تھا۔ اس ہسپتال نے کشمیری عورتوں کی تقریباً ۵۰ سال تک خدمت کی ہزاروں کشمیری عورتیں یہاں پر علاج کرانے آتی تھیں۔

۱۹۳۹ء میں حکومت نے ایک ماڈرن ہسپتال قائم کرنے کا فیصلہ لیا اس کے لئے مسٹر ہڈو کے باغ سید منصور صاحب کے نزدیک ایک وسیع باغ چنا جہاں مختلف قسم کے پودے اور پھول ہوتے تھے اور اس جگہ ہڈو صاحب کا ایک رہائشی بنگلہ تھا۔ ساتھ ہی بڑی قالین بنانے کی فیکٹری انہوں نے قائم کی۔

اس فیکٹری میں تیار قالین لاکھوں روپے کی قیمت پر برآمد ہوتے تھے۔ یہ تاثر غلط ہے کہ وہ ایک ڈاکٹر تھے۔ وہ محض ایک تاجر تھے اور غریب لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ آپ نے مشن اسکول (Biocoe School) کی مالی امداد کی اور وہ اس اسکول سے منسلک ہو کر اسکول کے خزانچی تھے یہ اسکول ۱۹۵۲ء تک ہیڈ و میموریل اسکول کے نام سے مشہور تھا۔ نئے ہسپتال کی بنیاد ہڈو صاحب کے باغ میں وائسرائے ہند لارڈ لنتھنگو Lininthgo نے ۱۹۳۹ء میں ڈال دی۔

اس تقریب میں مہاراجہ ہری سنگھ خود موجود تھے۔ اور انہیں کے نام سے اس ہسپتال کو موسوم کیا گیا۔ اس کا پورا نام شری مہاراجہ ہری سنگھ ہسپتال ہے۔ اس ہسپتال کی تعمیر میں ۵ سال لگ گئے۔ اور ۱۹۴۵ء میں اس زمانے کے وائسرائے ہند لارڈ ویول نے اس کا افتتاح کیا اور امیرا کدل ونوا کدل کے شفاخانوں کو اس ہسپتال میں منتقل کیا گیا۔